

عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَم

کتابخانه

جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی

۵۱

تعبہ

۲۵۷

شمار

عطیہ

۶۷

A H Faruqi

# دگلدار ۹۱ء



نصفه مولوی عبدالحلیم صاحب شہر مصنف  
ملک الغریزہ و رجبہ تصور مہنا حسن انجمنہ دگلش  
دچسپ شہید وفا مترجم دگلش نہانی وغیرہ

۹۱ء

دگلدار ۹۱ء



12

۷۷

۹۱

یہ صدی جو ہندوستان کے لیے بالکل ایک نئے دور کی پیدا کرنے والی - اور  
ہندوستان کو نئے رنگ میں رنگنے والی تھی اس کو اب پورے دس برس باقی رہ گئی  
یوں تو انسان کو زمانہ ایک ستارے کی طرح معلوم ہوتا ہے مگر اصل میں دیکھیے تو پچھلے  
تہذیب کے بالکل دینامیٹک - ایک بچہ جو ابھی وہ وہ پتیا یا گٹھنوں جلتا ہوا ہے تو کس  
بات کا ہوسنی ہے۔ لیکن اُس کے بزرگ جنگی تعلیم و تربیت میں وہ زندگی کے ابتدائی  
ایام گزار رہا ہے جب وہ اس کی عمر کے آخری حصہ کو اپنی خیالی آنکھوں کے سامنے  
لاتے ہیں تو انہیں ایسے عجیب و غریب اور اتنے بڑے عظیم الشان تغیرات نظر آتے ہیں  
جنگ کے لیے بہت بڑی مدت مدید درکار جو وہ خیال کرتے ہیں کہ اس وقت ہم میں سے کوئی  
نہ ہوگا۔ ہم ہی نہیں اس عہد کے اکثر نوجوانوں اور تمام سن رسیدہ لوگوں کی بڑی بڑی  
پتہ نہ ہوگا۔ ملک کی پولیٹیکل حالت میں بھی بہت سے تغیرات ہو گئے ہونگے۔ اُس دور کے  
انسانی اخلاق کو اس عہد کے اخلاق سے کوئی نسبت نہ ہوگی۔ محاورات اور زبان میں  
بھی فرق پیدا ہو گیا ہے۔ ہماری باتیں لوگ قصہ در کہانی کی طرح یاد کرتے ہونگے۔ اور  
ہمارا ذکر بھی بار بار کرتے آتے آتے زندہ دنوں کی صحبتوں میں بے مزہ خیال کیا جانے لگا ہوگا  
اس بچہ کا بڑا پاپا ہوگا جس طرح ہم آج تجربہ کاری کی باتیں کرتے ہیں اُسی طرح اس وقت یہ  
بڑا پتہ مغربی کے غور سے رائے دیتا ہوگا جس طرح آج یہ بے زبان بچوں کی مشیت سے  
ہمارے سامنے ہے اُسی طرح ان دنوں اسکے سامنے بہت سے ایسے ہونگے جنکو یہ باریکی  
نظر سے دیکر رہا ہوگا۔ یہ صرف ایک عمر کا حال تھا جسکی انتہا اُس کے ابتدائی سرے سے  
کوڑے ہو گئے کیسی گئی لیکن ایک صدی جو انسان کی عام عمروں سے بہت زیادہ جوتی ہو  
اگر اُسکی ابتدا سے انتہا دیکھی جائے تو اتنا بُداور اتنی تاریکی نظر آئے گی کہ کوئی چہرہ نہ کہانی



دینی ہوگی اس موقع پر اس بچہ کی طرز ہی خبری کوئی نوگی جسکی نسبت یہ ظن غالب قائم کیا جاوے کہ اسوقت موجود ہوگی۔

ابتداء سے انتہا کو دیکھنا نسبت اسکے کہ انتہا سے ابتدا دیکھی جاوے زیادہ دشوار ہے۔ اسیلے کہ ابتدا کی باتیں گزری ہوتی ہیں جنکے دیکھنے والوں یا اسکے بیان کرنے والوں یا ان تواریخوں ہی کے ذریعہ سے اسکا علم یقینی حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر ابتدا سے انتہا کی طرف نظر دوڑانا ایسا امر ہے جسکی عمارت صرف قیاس کی زمین پر قائم کی جاتی ہے یا یوں کہنا جا کر کہ نقش بر آب ہوتی ہو۔ تم دیکھو کہ یہی صدی جو اب تمہے زحمت ہونے والی ہو اسکی ابتدا کا زمانہ ہمیں کیسی ناہکی میں نظر آتا ہے۔ گو یہ تہذیب کا دور ہو اور ہر ادنیٰ ادنیٰ بات بھی مورخین کے قلم سے سج کے نہیں رہ جاتی مگر ہر ہی جب تم دوسرے خیال کی آنکھوں کو سپرست ہو تو ویسا ہی سمجھو کہ تمہارا خیال اکثر جاکھل جھک کے رہ جاتا ہے گو اتم ایک حق صحرا میں کھڑے ہو اور اس دور کے منظر کو دیکر رہے ہو جسکے ہر سے پر بخارات کے دھندلے کاغذ پڑا ہوا ہے۔ جان سب چیزیں آپس میں ملی ہوئی نظر آ رہی ہیں اور جہان عظیم اٹھان درخت بھی ہمدرد ہو کر کے مشتبہ ہو گئے ہیں کہ تم ایک کو دوسرے سے تیز نہیں کر سکتے۔ پھر جب گذشتہ کا یہ حال ہے تو آئندہ کی طرف سے تو بالکل ناامیدی ہو جیسا کہ سب نے کرنا چاہیے کہ ادھر کی کوئی خبر صحیح طور پر معلوم ہو جاوے گی

اتنی بڑی وسیع مدت۔ ایسا سلسلہ اور طولانی قعد۔ باوجود ان دور یوں کے دیکھو زمانہ کس دور سے ملے ہو جاتا ہو۔ دنیا انسانی اطمینانی حالت سے دکھا رہی ہو کہ گویا بالکل جاتی ہی نہیں جیسی ہمشیت ہی ویسی ہی آج بھی ہے۔ لیکن افسوس انہر افسوس! صد ہزار افسوس!!! کہ زمانے نے اسے غفلت کی نیند میں سلائے رکھا۔ یا خود فراموشی کے کیل میں لگا دیا اور خود ایک پوری صدی کو اسکے اقمہ سے نکالے لیے جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نکال لے گیا۔ نو سو برسوں کو جاتے کیا دیر لگی جو ان دس برسوں کو لگے گی۔

اگر ہم اس صدی کو زحمت کرنے کے لیے غور و تامل کے ساتھ آئندہ کے واسطے کچھ نتائج نکالنا چاہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہر سال کے زحمت ہوتے وقت گذشتہ اوقات زندگی کے احوال سے ہمارے ہر افسوس کرنے کے عادی نہیں۔ سنہ جو اس صدی کی نوین دہائی کا پورا کرنے والا تھا تمام ہو گیا۔ نو دہائیوں کو بیکار تھ کر کے دسویں دہائی پر آتھ بڑا یا صدی کا

صرف دسواں حصہ باقی ہو جو ایک غفلت کے جوگے کی طرح بہت جلد ماتم ہو گیا۔ انسان کی طبیعت کا خاصہ یہ کہ عمر کے آخری ایام میں گزشتہ زمانے پر افسوس کرتا ہے اور موجودہ ایام کی زیادہ قدر کرتا ہے۔ اگر اس اصول پر عمل تو یہی تمہارا فرض ہے کہ جس طرح نبیؐ ان دس باقی برسوں کو اسی قدر دانی سے بسر کرو جس قدر دانی سے ایک لب گور بڑا اپنی زندگی کی پہلی گھڑیوں کی چاہے کچھ نہ کر سکے مگر زیادہ قدر و عزت کر کے صرف کرتا ہے۔

اب یہ وقت گزشتہ غفلتوں پر پچھتانے کا نہیں ہے۔ اب زمانہ اس امر کا ہے کہ جتنا تک ہو سکے ہم ان قیمتی گھڑیوں کو جو گزر رہی ہیں اسی طرح بسر کریں اور اسی طرح قیادہ صرف کریں جس طرح کوئی نچھانے پر پیہ کو صرف کرتا ہے۔

میر جو کچھ ہوتا ہے اسکا پروگرام سال کے اختتام پر لوگ پیش ہی کر دیں گے۔ ہم کوئی منجم اور عیب کی خبریں بتانے والے نہیں ہیں کہ اس موقع پر آئندہ کی نسبت پیشین گوئی ان کریں صرف ہمارا کام ہقد رتبہ کر دینے کا تھا کہ ہمارے احباب اس سٹے سال کو نہایت قیمتی خیال کر کے ضروری اور مفروضہ کاموں میں صرف کرنے کے سوا بیکار عمارت نہ کریں۔ ایسا نہ ہو جس طرح سٹے کے اختتام پر انہیں عمر کے گزرنے پر حسرت و اندوہ میں مبتلا ہونا پڑا۔ اس کے اختتام پر یہی حالت ہو۔

اب ہم خاص اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ دگلہ ان کی نسبت مختصر اسی قدر ہے کہ جیسا سٹے میں رہا ویسا ہی سٹے میں رہے گا۔ اپنے اصول میں چاہے ترقی کرے مگر وہ ترقی محدود ہوگی اور پالسنی اصول ہی رہیں گے جو پہلے سے چلے آتے ہیں۔

باقی۔ انا اول جو منصوبہ رو موہنا، سٹے کے ساتھ تمام ہو گیا۔ اور افسوس کی بات ہے کہ ناظرین کے دلوں پر ایک سخت چوٹ لگا کے تمام ہوا۔ جسکی حسرت انہیں بہت دنوں تک یاد رہے گی۔ صرف قدیم مذاق کے پسند کرنے والوں میں بعض احباب، سپر بہت فضا ہی جو ہے لیکن جن شریف مسلمانوں کے دلیں شرافت و انصاف کا جوں ہے اور جن مغز ہندؤں کی رگوں میں اعلیٰ محبت کا خالص اور پاک دھات خون ہر وہ ہی کہتے ہونگے کہ "خوب ہوا" جو یہ واقعہ یونہی تمام ہو گیا، اگرچہ ہماری قدیم شہنشاہان اکثر کاٹڈی (خوشی و کامیابی) کے نتیجہ پر غم کی گئی ہیں۔ لیکن سچی داستانوں کا نتیجہ اکثر یہی ہوا ہے جو مروجہ تصور اور

حسرت نصیب عذرا و موہنا کا ہوا۔ علاوہ برین مختلف ممالک کی اخلاقی حالت کا اندازہ کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کے عشق کے نتائج ہندوستان میں ہی ہونا چاہیے تھے جو ناول سنہ میں ہوا۔ ایسے موقعوں پر کامیاب ہونا زیادہ تر یورپ کا حصہ ہے اور پھر ہر تو کس قدر عرب و عجم و مصر وغیرہ کا۔ ہندوستان کی آب و ہوا اس کے لیے بالکل ناموافق ہے۔

سنہ کے ناول کے بارے میں اکثر جناب نے ہمیں اپنی رائے سے مطلع کیا بعض حضرات کی رائے یہ کہ پھر سرزمین شام و عرب میں سین قائم کیا جاوے۔ بعض یورپ میں جانے کے شائق ہیں۔ مگر ہمیں تو اپنا ملک ہی زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے۔ قدیم الایام کے ایک شخص نے اپنی سوانح عمری کے حالات خود اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں جن کا ایک فلمی سودہ ہمارے پاس ہے۔ یہ صاحب تیور کے آنے کے وقت سرزمین ہند میں تھے۔ انہوں نے اس وقت کے تغیرات کا حال نہایت دلچسپی سے لکھا ہے۔ انکی سوانح عمری میں کچھ ایسی دلچسپ باتیں ہیں کہ ہمیں تو ناول سے زیادہ لطف آسکتا ہے خصوصاً جبکہ وہ دلچسپ بات کے موجودہ زمانہ میں لکھی جائے۔ انگریزی میں اکثر ایسے ناول موجود ہیں جو اسی پرانے مین لکھے گئے ہیں لیکن مہذب و جوہر شناس سوسائٹیوں میں نہایت مقبول ہوئے۔ سرچارلس ڈکنس کا مشہور ناول ”ڈیوڈ کا پرنسپل“ اسی رنگ میں لکھا گیا ہے جسکی نسبت وہ افتخار مانہ ناولسٹ کہلاتا ہے کہ جس طرح ایک باپ کو اپنے بہت سے بیٹوں میں صرف ایک بیٹا نہایت ہی لاڈلا اور پیارا ہوتا ہے اسی طرح مجھے اپنے تمام ناولوں میں یہ ناول زیادہ پیارا ہے۔“

اسی بنا پر اس دفعہ ہی قصد کر لیا گیا کہ وہی سوانح عمری دلچسپی کے ساتھ ناول کی صورت میں سال بہر شائع ہوتی رہے۔ قدر افزایان دگلہ زنجی عام مذاق اور عام طبائع کے اندازہ کرنے کا مجھے بہت کچھ موقع مل چکا ہے یقیناً اسکو بہت پسند کریں گے اور میرا خیال ہے کہ یہ سوانح عمری انہیں گذشتہ ناولوں سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوگی۔

## شاعری کی کستین

اسکے متعلق بھگتوں کے شعور و جہاد و بیان گو لڑا ہمتہ نے کچھ خیالات ظاہر کیے ہیں جو

نسایت ہی پاکیزہ ہونے کے علاوہ ایک عبرت اگلیہ سبق دیتے ہیں لہذا ہم ان کو  
پبلک کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

”میری رائے میں ہر ملک کے شعرا کی طبیعت کچھ ایک ہی سی ہے یعنی موجود ہر ملک میں  
میں خود جس حال میں ہیں اسی میں خوش۔ انجام کی فکر سے بے پروا باتوں پر  
خیال کیجیے تو اول درجے کے سمجھ دار اور عقلمند۔ حرکات و سکنات کو دیکھیے تو سب سے  
بڑے بے وقوف۔ مستقل مزاج۔ اتھوڑے کر لزلہ آجائے اور دنیا اپنے مقام سے ٹل جائے تو  
آہستہ آہستہ پورا مین۔ اور نازک و ملغ ایسے کہ ایک ذرا سی جہنی کی پالی ٹوٹ جائے تو  
بھی آپ چونک پڑیں اور اسکی آواز پر آپ کا دل بھڑکے۔ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ  
ہوئے کہ ارشاد ہوتا ہے

”ی شب بھیں گلشن ازنا زخفتہ بوم پرواز رنگ گلہا بیدار کرد مارا“

یا فرماتے ہیں۔

”آہستہ برگ گل فشان بر فراہما بس نازک است شیشہ دل شکنار“

ان اصنافِ اہلِ ہمارے پر ہر جس پہلو سے غور کیجیے یہی معلوم ہو گا کہ جو باقیں انسان کو دوست  
بنانے والی ہیں ان سے انکو تعناد کی نسبت ہے۔

شعراے مغرب زمین جس طرح اپنے حسن لیاقت اور اپنی نازک کینا لیون کی وجہ سے قابلِ التفات  
ہیں اسی طرح اس قابل بھی ہیں کہ انکی تنگدستی۔ مفلوک الحالی۔ اور انکے افلاس پر  
غور کیا جائے۔ باوجود اس عام افلاس شعرا کے ان کثیر القداد ہسپتالوں میں سے جو غریبوں  
سکونت کے لیے بنائے گئے ہیں صرف ایک ہسپتال دیکھا نظر آتا ہے جو از کار رفتہ مصنفوں  
کی خدمت کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس ہسپتال کو آٹھویں پوپ اربن نے بنایا تھا۔ اور پھر  
عام میں لا علاجوں کا مرجع و دوا می کہلاتا تھا۔ جبکہ یہ مطلب تھا کہ جو مرضی امین و اہل  
ہونے کی درخواست کرتے ہیں وہ ایسے لا علاج ہیں کہ انکے مرض یعنی افلاس (یا دوسرے  
انفاظ میں کہا جائے کہ شاعری) کی صلاح کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ  
اگر میں شعراے ارض مغرب کی زندگی کے حالات لکھوں تو لوگ خیال کریں گے کہ میں انسانی  
دولتوں اور مصیبتوں کے متعلق کوئی کتاب تصنیف کرنے کے لیے سامان جمع کر رہا ہوں۔

اب سرے سے چلیے۔ قدما میں یونان کا سب سے بڑا جادو نگار شاعر ہومر ایک فقیر ہے جو

انگوٹھوں سے اندایا ہندوستان کا سور داس تھا اور انہی نظیمن سرکون پرگاتا پھرتا تھا۔  
 دوح کہتے ہیں کہ اُس کا منہ جقدر بے مثل اشارے سے ہزار اُس قدر روٹی سے بھرنا کسی نہ  
 نصیب ہوا۔ پلاس شاعر مکی کا ڈی کی رسمت خیز نظیمن مشہور و مقبول روزگار میں مکی  
 نسبت بنا گیا ہے کہ وہی سے خوش تھا مگر لوگوں کو یہ سن کے تعجب نہ گا کہ اُن پر رگ کو  
 اطمینان تھا تو کیا۔ آپ دل بہلانے کے لیے موشعرا کرتے تھے مگر وہی حاصل کرنے کے لیے  
 ایک چکی پیسنے والے کی محنت بنایا کرتے تھے۔ کزنس شاعر کی میر کا غلام تھا۔ اور غریب نہیں  
 جسکی شاعری کا زمانہ ہمیشہ معروف رہا گا وہ بیچارہ چلچلناہ بین مرا۔

شعراے ایتالیہ سے "پالو بوگیسی" جو باعتبار شعر و سخن مسند و معرکہ را شاعر "یو" کے ہم پلہ  
 تسلیم کیا گیا ہے اُسکی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ متفرق چودہ ہنر جانتا تھا لیکن یاد جو داس  
 جامعیت کے افلاس ہی میں مر گیا۔ کیون؟ اسیلے کہ مر تو دم تک چودہ کاموں میں ایک میں ہی  
 نوکری نہ ملی۔ خود ڈیسو جو کل شعرا سے زیادہ ہر دلعزیز تھا اُسکو اپنا ہمینہ بہرہ حساب مبیان  
 کرنے کے لیے کسی نہ کسی دوست سے ایک کراون (پانچ شلنگ) قرض لینے کی ضرورت  
 ہوتی اُسکے افلاس کی زیادہ حالت دریافت کرنا ہو تو خود اُس کے کلام کی طرف توجہ کرو۔  
 اُس نے ایک بی بانی ہی جسکی طرف خطاب کر کے ایک ہوئی سی غنوی لکھی ہے۔ اُس میں آپ اپنی  
 اُس ملی کی طرف خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ "مجھے لکھنے کے لیے تو اپنی آنکھ کی روشنی دے"۔  
 اس روشنی مانگنے کی ضرورت یہ تھی کہ انتہا سے افلاس ہو آپ کو دھچکے کی کوریان بھی نہیں  
 جڑتی تھیں کہ تیل لگاوا کے رات کو چراغ جلا میں اور اُسے سامنے بیٹھ کر کچھ لکھیں۔ ان شعرا سے  
 ہی قطع نظر کیجیے۔ آہ! بیچارے "یو" دو گلیو" کی حالت سب سے زیادہ قابل تاسف اور  
 نمونہ عبرت تھی اور اُس کے حالات سننے کے خاص طور پر ہمارا دل بہرتا ہے۔ اُسکی شاعری تو  
 ایسی تھی کہ جب تک ایتالیہ کی زبان باقی رہی اُسوقت تک اُسکی کا ڈی کی نظیمن انتخاب کی  
 طرح روشن رہی۔ اُسکی فیاضی اسی نہ رہی ہوئی تھی کہ انہی دولت کا بہت زیادہ حصہ خیرات  
 کے کاموں میں لگا دیا لیکن بڑا سچے میں نقد یا ایسی دشمن ہوئی کہ وہ ایسے افلاس میں مبتلا  
 ہوا کہ آہ! اُس اسپتال میں ہی رہنے کی اجازت نہ ملی جسے خود اُس نے اپنے سرمایہ سے قائم  
 کیا تھا۔ اب اس سحر بردہ کے کیا ذلت ہو سکتی ہے۔

اسپین کو لیجیے۔ مورخوں کی تحریر کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کا بہت بڑا مشہور شاعر

سردنٹس بھوکوں مر گیا اور اسکو تو زمانہ بہر فقیں کے ساتھ جانتا ہے کہ نامور شاعر اسپین کا موٹیس نے ایک اسپتال ہی میں بڑے بڑے پڑے پڑے اپنا دم توڑ دیا اور اسے افلاس کہے ہی میں انہی زندگی کے دن پورے کیے۔

اگر ہم فرانس کی طرف توجہ کریں تو وہاں بھی پبلک کی احسان فراموشی کہ بہت بڑے بڑے نظائر ہمیں ملے گئے۔ ڈیگلاس جسکا شمار وہاں کے بہت بڑے اور اعلیٰ درجے کے ادیبوں اور اڈاپر رازوں میں ہے باوجود دیکھنے والے کے زمانے کا بہت بڑا است باوجود تھا لیکن لوگ اُسے غلام الدین کہتے تھے۔ اور اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ بیچارہ قرضخواہوں کے در سے دن کو گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا صرف رات کو اسکی صورت نظر آیا کرتی تھی۔ آئے جو وصیت نامہ لکھا بہت مشہور ہے۔ انہی جائیداد قرضخواہوں میں تقسیم کرنے کی بابت رہ لکھا ہے ”لیکن ابھی شاید کچھ قرضخواہ رہ جائیں اور میری ملکیت بیچنے پر بھی روپیہ نہ پورا ہو تو میں وصیت کرتا ہوں کہ میری لاش ڈاکٹرؤں کے ہاتھ کافی قیمت پر بیچ ڈالی جائے تاکہ سوسائٹی کا جو کچھ مہر قرض ہے وہ ادا ہو سکے۔ اور اگر میں زندگی ہی میں لوگوں کے کام نہ آسکا تو مرنے کے بعد کام آؤں“

کندری نے عہد کے بہت بڑے طبیعت داروں میں تھا۔ مگر باوجود اس تیزی ذہن کے اُسے انہی لیاقت کی بدولت پیٹ پھر روٹی نہیں نصیب ہوتی تھی۔ زمانے کی سرد مہر و سس اسپر دوز بروز ایسے بڑے اثر پڑنے لگے کہ آخر کار رفتہ رفتہ اُسے انسان سے نفرت ہوتی گئی مخلوق میں رحم و ہمدردی کا مادہ نہ پائے اُسے اتنی مہارت پیدا ہو گئی کہ احسان فراموشی سے اپنے مسائب کو خدا کی طرف منسوب کرنے لگا۔ جو وقت اُسکا دم واپس تھا۔ جان نکل ہی تھی اسی سبب دنیا کو وہ خصت کر رہا تھا اور پادری دعا سے توبہ پڑھانے کی سرانے آ بیٹھا۔ اگر وقت کا تذکرہ سننے سے نہایت عبرت ہوتی ہے۔ پادری صاحب نے کہا ”خدا کے انصاف پر بہر و سا کرو۔ اور اُس واحد لایزال کی درگاہ میں مغفرت و نجات کی دعا کرو“ یہ سنکے وہ نا امید دل شکستہ شاعر بولا (معاذ اللہ) ”خدا نے اس دنیا میں میرے ساتھ کونسا

لو لکھنے کے بے فکروں میں مشہور ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے اُسے پوچھا ”تمہارا نام کیا ہے؟“ اُس صاحب فرماتے لگے کہ نام تو غلام الدین ہے مگر لوگ اُلٹا لکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر مذہب سوسائٹیوں میں اگر کسی کو اُلٹا ناما ہوتا ہے تو اُسکو کہتے ہیں ”تم تو غلام الدین ہو“

انصاف کیا جو وہاں اُس سے کسی قسم کے انصاف کی امید رکھوں، پادری صاحبؒ  
 یہ خیال کیا کہ اگرچہ یہ خدا کے انصاف سے منکر ہو مگر جو ذات باری تعالیٰ کا  
 تو محترم ہو لہذا انہوں نے بہر دعا سے توبہ پڑھانے کی کوشش کی اور کہا "میں  
 کمال النجا کے ساتھ کہتا ہوں بلکہ تمہیں اُس چیز کی قسم دلاتا ہوں جو تم کو سب سے زیادہ  
 عزیز ہو کہ خدا کی طرف سے اپنے دل کو پاک و صاف کر لو۔ اور جو پرستہ خیالات اُسکی الوہیت  
 کے متعلق ہوں اُنکو اپنے دل سے نکال ڈالو۔ وہ تمہارا خالق۔ اور پروردگارِ عالم ہے۔ یہ  
 اُنکے وہ مژدو و عالمِ جہلا کے کہنے لگا۔ "نہیں یہ نہیں ممکن ہے۔ تم بخوبی جانتے ہو کہ اُس  
 خدا نے مجھے اس عالم میں کس کس پرستی کے علم میں پڑا رہنے دیا، (اتنا کچلے اُس خیال  
 کی طرف بہر پڑا ہوا تھا اشارہ کیا اور کہا) "اور تم یہ بھی دیکھتے ہو کہ مجھے اس مرنے کے  
 وقت بھی اس خدا نے کس حالت میں ڈال رکھا ہے؟ (معاذ اللہ من ہفوات)

دیگر ممالک کو چھوڑ کے اب انگلستان کے شعر کو دیکھیے۔ انگلش شعرا کی مصیبتوں کا خیال کیا جائے  
 تو دیگر ممالک کے شعرا کی مصیبتیں بالکل سچ معلوم ہو گئی۔ سپنسر اور آلوے سپنسر  
 ڈرائڈن کے نام ہر روز یاد جاتے ہیں اور گویا اُنکے تذکرے سے سننا ہر روز انگلش قوم کو  
 ملاست کی جاتی ہے۔ انہیں سے بعض نے تو ایک مشکوک انداز کی حالت میں زندگی بسر  
 لی اور باقی نے ہی حقیقت ہو کون مر گئے۔

فی زمانہ انگلستان میں جو چند شاعر ہیں اُنکی نسبت البتہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ امرالی گفتا  
 کے نہیں محتاج ہیں۔ پنک کے سوا اب کوئی اُنکا مرہی نہیں ہے۔ پنک مجموعہٴ مینٹ  
 المجموعہٴ ایک فیاض اور نیک آقا ہے لیکن سمیں شک نہیں کہ یہ آقا اپنی نغز نایت سے  
 امیدواروں کی لیاقت کا اندازہ کرنے میں اکثر غلطی کر جاتی ہے۔ اُسکے ساتھ یہی جو کہ  
 اس قسم کی غلط فہمیاں دیر تک باقی نہیں رہتی ہیں اسلئے کہ کوئی تصنیف چاہے زبردستی  
 تھوڑے دنوں کے لیے مشہور کر دی جاسے مگر چونکہ آئین لیاقت کا جو ہر نہیں ہے لہذا  
 بہت ہی جلد ناموری اور شہرت کے شیشین سے غائب ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے  
 کہ زمانہ قیمتی چیز ہے کی اچانی بُرائی ظاہر کرنے کی ایک عجی کوئی ہے وہ بہت جلد ذیاب  
 کو کھول دیتا ہے مصلحت کو مغرور نہ ہونا چاہیے جب تک اُسکی تصانیف کم سے کم دس برس  
 تک مقبولیت کے ساتھ پڑھیں جائیں اس وقت تک یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کامیاب ہو گیا

اس زمانے میں ہر عالم جسکی تصانیف قابلِ قدر ہوں انکی قدر و قیمت سے پر اسے  
 طور پر واقف ہے جو سائنسی کا ہر عذاب ممبر اس کے تصانیف مول لینے کو تیار ہو جاتا ہے  
 اور اس ذریعہ سے اسے اسکی خیال آفرینیوں کا انعام دینے میں شریک ہو تا ہے۔ عالمی  
 مکاتبات کی سب سے اونچی منزل میں رہنے پر محکمہ کرنا اگلے زمانہ کا ایک دلچسپ مذاق  
 تھا۔ لیکن یہ مذاق اب نہیں ہے ایسے کہ یہ سچا مذاق نہ تھا۔ کسی سچی اور اعلیٰ لیاقت کے  
 مصنف کو اگر وہ یہ کہانے اور دولت حاصل کرنے کا چاہی ہے تو وہ بہت آسانی سے ہیر  
 جہر سکتا ہے۔ لیکن وہ لوگ نہیں لیاقت ہی نہیں ہے وہ اس لائق ہیں کہ گستاخی  
 نہ ہذا سمجھنے اس مضمون میں شعر کی سچی حالت دکھا دی ہے۔ مگر یہ تو صرف شعر سے  
 مغربہ زمین کا حال تھا بارے مشرقی شعر کو دیکھیے تو انکے حالات بھی اسی قسم کے نظر  
 آتے۔ اسوقت ہم اسکی سیے تیار نہیں ہیں کہ گولڈ اسمتہ کی طرح مشرقی شعر کے تفصیلی  
 حالات بتائیں لیکن چند نمونے جو ہمیں بانی یاد ہیں ان سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان  
 ممالک کی پاک ہی ویسی ہی سان فرانسس ہے جیسی احسان فراموشی کہ مغرب کے لوگوں سے  
 ظاہر ہوئی۔ ابران کے شعر سے سلف میں فردوسی کو جو ناکامی نصیب ہوئی اور بس حسرت  
 سے اس خدا سے سخن کے اپنی جان دی اسکو۔ زمانہ جانا ہے۔ انوری کا یہ قطعہ اسکی پریشان حالیوں  
 کا ثبوت ہے۔

”ہر نہالے کز آسمان آید گرچہ بر نام دیگران باشد  
 بر زمین نارسیدہ می پزد خانہ انوری کجا باشد“

اور ہم ہر عہد میں میرزا ناطق کمرانی جو متاخرین میں ہیں اور بہت اچھے تھے ان سے مضبوط ہو سکا مجبور  
 ہو کے آخر انہوں نے وہ راز ظاہر ہی کر دیا جسکو شعر اول ہی میں چپاتے رہے تھے۔ خود اپنی  
 طرف مٹی بک کر کے دباتے ہیں۔

”شاعر شدنت بہر فلاح کست کہ بود کا خانہ خراب باز مال شدی؟“

یہ پارے غالب ہی زمانہ کی شکایت ہی کرتے مرے شعرے اردو نے اگرچہ زمانہ اپنے موافق  
 اور قدر دان پہلے پائی لیکن انکو بھی شاعری کی منہوس برکتوں سے نجات نہ ملی۔ تیر۔ انشا۔  
 آتش وغیرہ نامور شاعروں کے ساتھ زمانے نے جس قسم کے سلوک کی ظاہر ہے۔

چونکہ تراچ بھادشوار، جہانگیر گلستان میں مشورہ کی جو سب اور کے درجہ پر ہر وہ سب سبڑا غفلت ہے۔



## راما بن کے بعض سین

سیتامی کی وہ حسرت ناک اور دل دکھانے والی حالت ہمارے دوست دیکھ چکے  
وہ قیامت خیز منظر نظر آگیا یہاں پاکد من اور وفا شعار سیتامی راون کی دیو نیون میں  
گہری پڑی تھیں۔ اب ہم اکیلے موقع پر پہنچتے ہیں۔ اپنے خیال کی آنکھوں کو کھولو۔ اور  
دیکھو کہ ہنومان جی ہوا کے دیوتا کے بہادر بیٹے اور رام چندر جی کے جان نثار دوست  
سیتامی کی تلاش میں راجندر جی کی فوج سے نکلے ہیں اور رات کو لنگامیں دھل چکے  
ہیں۔ وہاں انہوں نے پشپ (جادو کا رتھ) دیکھا ہے جس میں دیودن کے بادشاہ کا محل ہے  
سو قوت کی وہ حالت جو ہنومان جی کو وہاں نظر آئی اسکے دکھانے کے لیے ہمارے قلم کی قوت  
نہیں کفایت کرتی لہذا ہم اسی تصویر کو ناظرین کے سامنے پیش کرنے ہیں جو جادو نگار  
والیکی ہی کے قلم سے کھینچی گئی ہے۔ وہ لکھتا ہے: —

دعا ہے۔ ہما نچہ۔ اور پبل کی آپس میں ملی ہوئی میٹھی میٹھی خوشگوار آواز میں سپر دور کے بول  
کی گرج کا دھوکا ہوتا ہوا اُنکے (ہنومان جی کے) کان میں آئیں۔ کچھ دیر تک وہ کھڑے رہے  
پہنرا اور آگے بڑھے۔ یہاں تک کہ اُنکی حیرت سے چونک چونک پڑنے والی آنکھوں کو سنے  
راون کی حکمتی اور دھمکتی ہوئی لمبی چوڑی گاڑی نمایاں ہوئی جو ایک سمت سے دوسری سمت تک  
تین میل تک چلی گئی تھی وہ گاڑی جو اپنے مالک کی فرسی پر چلتی تھی۔ اور سمندر دن اور پہاڑ  
پر اڑتی اڑتی پہرتی تھی۔ اُسکی ادبھی ادبھی شاندار محرابیں سونے کے ستونوں پر قائم تھیں  
اور انہیں نیچے سے اوپر تک رنگ رنگ جوہرات بڑے ہوئے تھے اور پہلو بدل بدل  
کے مختلف رنگوں سے جھلکا اُٹھتے تھے۔ ٹنڈی ہوا کے خوشگوار ہونکے آتے تھے۔ جس سے  
جنت کی جبار کا فرہ آتا تھا۔ یہ ہوا جوتی ہوئی آتی تھی اور اُن پہلے پہلے درختوں سے گزرتی  
ہوئی پونچتی تھی جو بے انتہا خوش ذائقہ پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ راجندر جی کی  
فوج کے اُس حیرت زدہ سردار نے اُس کے احاطہ میں ایک عالیشان محل دیکھا جو بہت  
وسیع اور نہایت ہی بلند تھا۔ جس میں سونے اور نیکل کے دروازے تھے اور چاروں طرف  
ہر قسم کی نظر فریب چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ وہی محل راکشسوں کے بادشاہ کا تھا۔ نہ اُسکے

دروازے پر کوئی دربان تھا۔ اور نہ کوئی روک ٹوک تھی۔ نہ کوئی دروازہ بند تھا اور  
 نہ کسی پھاٹک پر پٹی پڑی تھی۔ صرت ایک ہوا کا خوشگوار جو بخاؤس چنبی مہمان کی استقبال  
 کو بڑا بعینہ اس طرح جیسے کوئی نیربان اپنے صحرانورد و غربت زدہ غریب سے ملنے کو  
 پہنچے۔ اور اُس تکے فائدے مسافر کو تسلی و دلاسا دے کے اندر لیجائے۔ وہ حیرت زدہ  
 مہمان ایک وسیع کمرے میں جا کے کھڑا ہوا جسکی چیت منقش تھی اور دیوار میں مختلف رنگوں کا  
 رنگی ہوئی تھیں۔ یہ کمرہ رادن کو بہت پیارا تھا مضطرب کوئی پیاری دلہن کو پیار کرتا جو  
 وہ اس کمرے کو پیار کرتا تھا۔ وہاں کے عجائبات بیان کرنے کو ایک بہت بڑی دہان  
 چاہیے۔ بلور کی زمین۔ بڑا اور مصح کار زینہ۔ سوئے۔ روپے۔ زمرہ۔ اور تمام قسم کے  
 جواہرات کے جہاں ہلکے اٹھنے کی بہار۔ موسم بہار کے شگفتہ اور تبسم ہون کی مجلسی بہنی  
 نہ شب کی لپٹیں۔ مغرور اور خود پرست ہنس کے پرچاندی کی طرح چمک رہے تھے جنکی  
 پام اگر کے دیوین میں خوش بودار اردن کے سج سے نظر آتی تھی۔ یہ سان۔ یہ لطف و ہلک  
 وہ سردوار بہیا تک لگا ہوں سے اس ہر اوہر مڑ مڑنے و لیکر خود بخود بول اٹھا۔ یہ تو اندر کی  
 بہشت ہے۔ ویلا تا ان کا گہرا ہمیشہ باقی رہنے والی خوشی کا محل ا۔ اُس محل میں نرم نرم  
 قالین بچے تھے جو دیکھنے میں نظر غریب اور چلنے میں نگد گد سے معلوم ہوتے تھے۔ وہاں پر  
 دروازے پر نا زمین عورتیں ایک دوسرے سے لپٹی پڑی تھیں۔ نیند کی ماتی۔ کیل اور مہی میں  
 تھک کر روت کے جام اب اُس خوشی سے نہیں چل رہے تھے۔ مہی اور تھکوں کی آوازیں  
 موقوف ہو گئی تھیں۔ وہ نازک پاؤں جھکے چروں کی ہنکار کا لونین بس جاتی تھی اب نہیں  
 حرکت کرتے تھے۔ نہ وہ کمر بندوں میں بند تھے ہوئے کٹھنوں کی چہن چہن سنائی دیتی تھی  
 بس وہی خوشی اور سناٹا تھا جب ہر طا تر اسیر لے لیتا ہی۔ ہنس خاموش ہو جاتا ہے اور جنگل  
 کی شہد کی مکھیاں آرام کرتی ہیں۔ تالاب کی مشوۃ کو کابلی پر اس وقت تک کے یو خواب ناز  
 غائب آجاتا ہے جب کہ صبح کا سورج اسے بوسے لے لے کے جگائے۔ اور اُن دیران کہ  
 کی طرح جو موسم خزان کے آسمان کے نیچے سنان پڑا ہو جس پر ہنسا رے ایک سکوت کے  
 ساتھ جھجکا رہے ہوں۔ بس اُسی طرح اُس ظالم کا سجا ہوا کمرہ زندہ تاروں کی دہری رخون  
 سے جھجکا رہا تھا۔ کیسے زندہ تار؟ جھکے نور سے تاریکی بہاگی جاتی تھی۔ یہ سان دیکھ کے وہ  
 راجہ راجی کا وفادار سردار چلا اٹھا۔ یہی وہ تارے ہیں جو گرمیوں میں رات کو زمین پر اترتے

ہیں اور پہر زیادہ خوشنما ہو کے نمایان ہو گئے ہیں تاکہ اور زیادہ اب تاب پہنچا دیں  
 تمہاری دیر تک وہ اپنی شجوب آنکھوں سے ہر نماز میں ہر سر و قدم ہر چین تن کی صورت اور  
 ادا میں دیکھتا رہا آہ! ایک ظالم از زمین چست پڑی تھی اور سر پٹھ کی طرف ہٹکا ہوا تھا۔ یوں  
 کی نیند میں ہاتھ شانے تک اٹھ گئے تھے۔ اور ساری کی بندشیں اوچھوٹے ہوئے تھے بار خستہ اسکی  
 پیشانی کو رونق دی گئی تھی ایک دوسری مہجین کی کو میں لپٹ گئے رو گئے تھے۔ ایک طرف  
 پیار سے پیار سے پاؤں اپنے نور سے شعا میں ڈالتے ہوئے نظر پڑے۔ پازیمین جو ان پر  
 چمک رہی تھیں اٹھ پاتا نہیں۔ خدا جانے بڑھتیاری میں اتر کے کمان۔ نگین و آن ایک آنی  
 خواب ناز میں ہوا اور اس کی بہاری اور فوق البہرک ماحی غفلت کی کروٹوں میں ملی دلی تھی  
 ایک اور دریا بہان ایک از خود زنگی کے عالم میں پڑی ہے جسے سوتے وقت اپنے نازک  
 ازک ہاتھوں سے کپڑوں کی سب بند اور سب گرہن ڈھلی کر دی ہیں۔ تھے اختیاری کی آواز  
 اور ایک اور پڑی ہو جسے تمام زیور اور جواہرات نیند کے جوں جوں میں اٹار کے پسینک ویزین  
 اور وہ اس طرح اور ہر اکبر سے پڑے ہیں مبطر کسی جنگلی اور وحشی ہانھی نے کی خوشنما اور  
 نازک پہلو اور پیل کو اپنے پاؤں کے نیچے کچل کچل کے زمین پر جا سجا پہلا دیا ہو اور اس کے  
 پوں اب اور کبھت پڑے ہن۔ اور ہر ایک خارا کو دباغ حسن کی خوشنما والی (دور و ش)  
 موت کے سنائے میں پڑی ہے نام کو بھی حرکت نہیں محسوس ہوتی۔ سوا اسکے کہ اسکی معطر اور  
 خوشبودار سانسوں سے کبھی کبھی وہ جالی اٹھ جاتی ہے جوتہ ب کی طرح اس کے سنے پڑی ہوئی  
 ہے اس طرف ایک عاشق مزاج الہ اور کسن ناز میں بیٹا اور امین پڑی ہوئی ہوئی ہے اسکا  
 پیار اسر ایک آئینے پر پڑا ہوا ہے۔ آہ! بس بالکل چھتے ہوں گا پھول جو ہند۔ ہٹ گیا ہو لگی  
 پلٹہ بان خوشنما سے پانی پر تیر رہی ہوں۔ اس طرف ایک اور سیاہ چمچہ نوبہ ان پڑی دس اپنا  
 طہنورہ اپنے دھڑکنے ہوئے دل سے لگائے پڑی ہو گویا اسکی خوش نصیب باہین اس شخص  
 سے ملے ہیں پڑی ہیں جسکے لیے وہ مدتوں ترس ترس کے ہی ہو ایک اور کا خسار میند کی  
 ماتی ایک گلہ ان کے گرد باہین ڈالے پڑی ہو اور وہ گلہ ان کیسا خوشنما ہوا۔ دونوں نازک ہار  
 (دوری و باہین) جو اسکے گلے میں پڑی ہیں کیسی خوبصورت ہیں۔  
 اس میں کو ہار سے ناظرین نے دیکھا خیال کر لیا ہو گا کہ نہ مکر کا جادو نگار حسن و عشق کی  
 صحبت کا نوٹو اٹارنے میں کس قدر جا بکدست اور ہوشیار ہے۔ اسکی تصویر کہ تمہاری اور

کتنی موثر ہے اور یہ نقشہ دلون کو گستدر متاثر کر دیتا ہے۔ اسکے بعد ہم ایک اور سین  
 دکھا رہے ہیں جس میں منسکرت کے موجد شعر و سخن اور رام چند رچی کے نامود معرف نے راون  
 کے بہائی کچھ کرن کی حالت دکھائی ہے جو راون کی طرف کا سب سے بڑا سپر و انجیٹ  
 غریب خلقت و توت کا شمس بنا یا گیا ہے اسکی وہ قسم یہ ہے کہ نہ منسکرت میں کچھ پانی  
 کے گہڑے کو لیتے ہیں اور کرن کے منی کان۔ اس دیوار دسے کان لٹے لٹے بارہ  
 کہ ہر کان میں ایک پورا گول سا جاتا تھا۔ رکش راون کے بہائی کی ہو کہ اس قیامت کی  
 کہ چہ مینے کی خدا ایک دن میں چٹ کر پایا کرتا تھا۔ دنیا کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں مجھ کو نہ لگ جائے  
 اندازہ جانے دنیا کو اسکے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ حکم دیا کہ وہ دیو چہ مینے تک برابر  
 سوئے اور چہ مینے کے بعد صرف ایک دن کے لیے جاگا کرے۔ اور اسی دن چہ مینے کا  
 کہنا اکٹھا کیا کرے۔ اور پھر سو رہے تاکہ زمین کی پیداوار منافع نہ ہونے پائے! پھر رچی  
 نے جب لٹکا پر حمل کیا تو رکش سون کو ضرورت ہوئی کہ اپنی سب فوجوں کو جمع کریں۔ اس سوتی  
 ہوئے دیو کے جگانے میں انہیں بڑی بڑی زبردستیاں کرنا پڑیں آخر بڑی مشکوں کو  
 کا سیابی ہوئی۔ اس موقع پر دالمیکی کے قلم سے جو ڈرامے آبدار ظاہر ہوئے ہیں انکو بھی دیکھ  
 نیاں کر کے ہم نقل کرتے ہیں: —

راون لٹکا کے پہاگ پر شکست کھا کے نہایت بدحواس ہو کے ٹوٹے ہوئے دل سے  
 بہاگا بطرح وہ زخمی ہاتھی جو شیر کی جبت کے سلسلے گر پڑتا ہو اور گہرا کچے حج اٹھتا ہے اور  
 سمجھ جاتا ہے کہ شیر کے پہاڑ کھانے والے دانت ایسے ہوتے ہیں۔ یا اس بڑے مہیب  
 فی طرح جو پڑیوں کے بدشاہ کے پڑ پڑاتے ہوئے بازوؤں اور کینہ درخون کے نیچے پڑا  
 تاہر تو تیر خنجر پھر رچی برسا رہے تھے انکی وجہ سے ایسا خون اور ایسا اضطراب راون  
 کے دلمین پیدا ہو گیا تھا۔ کیسے تیر؟ جگہ گرد بجلی کے شعلے لپٹے ہوئے تھے۔ بالکل اُن بنا  
 کے تیروں کی طرح جو دنیا کا خاتمہ کر دیا کرتے ہیں آخر وہ اپنے محل میں گیا۔ اپنی سونے  
 کے پائے پر تکیہ لگا کے بیٹھا اور غضب آلود شعلہ برسانے والی آنکھیں نیچی کر کے مانجی  
 اور دولت کے لمحہ میں بولا۔ دیو و بانوس! ساری محنت بیکار ہے۔ کوئی نتیجہ نہیں  
 میری ایک عمر کی تکلیف سب اکارت لئی۔ اگر ایک آدم زاد بہادر سے میں ڈراؤں  
 پھر دیوتاؤں کا تابو نہیں چلتا۔ اندر کے بجے اپنا سر مان لیا۔ اور ایک آنکھ سے

ڈر جاؤں! برہما کے دو الفاظ خمیں انہوں نے میری قسمت کی نسبت پشیم گونی  
 کی تھی جنکو سننے بہت زمانہ ہوا اب انوسوس میری روح اُن الفاظ کو یاد دلاتی ہے۔  
 اُنکے یہ کلمات مجھے رہ رہ کے یاد آتے ہیں ”مغرور اور خود فراموش دیو ڈرتا رہا ناچتا  
 انسان کے اُتھ سے تباہ و برباد ہوئے کاخوت ہر وقت اپنے پیش نظر رکھ میری عدا  
 اور میرے حکم سے تھلو کوئی دیوتا کوئی فرشتہ کوئی شیطان کوئی درندہ اور کوئی سانپ  
 نہ مدد نہ ہو پاسکے گا۔ ان سب سے تو محفوظ رہو گا۔ انکی قوت و طاقت تیری زندگی  
 کا طلسم نہ ٹوٹے گا۔ فقط انسان کے مقابلہ میں تیری جان محفوظ نہیں ہے“ مجھے یقین ہے  
 کہ وہ وقت موعود سر پہ آگیا۔ اب سنو۔ ہر سردار اپنے لیے مقام پر دوڑتا ہے۔ چیدہ چیدہ  
 سپاہی اپنے چہرہ لے اور شہر کے کلی کوچوں کی حفاظت کرے دیو زاد اور بانڈن کی طرح  
 لشکر کی تفصیل پر پیرا دین اور کبھ کر ان کے سامنے دیوتاؤں کی آنکھیں بھی خون سے بہہ  
 جاتی ہیں اُسکو جا کے بیدار کرو وہ گہری نیند میں غافل پڑا ہوا ہے۔ کئی سینے سے نیند کے  
 جادو میں مبتلا ہے۔ اور آزاد اور بے فکر ہو رہا ہے۔ جاؤ۔ اُسے اُٹھاؤ۔ وہ ہمارے سب سے  
 بڑا جوانمرد اور سب سے بہتر ہے۔ فتنوں کو اُسکے سامنے بہت جلد شکست ہو جائے گی۔  
 رکشس اپنے مالک کا حکم بجالائے اور ڈرتے کانپتے ہوئے اُس کی بلج بہا سے جدا ہو سے  
 بہت سے پہلوں کے خوشبو دار مارا درناشتہ کے لیے خون کے بہت سے ناز سے اور گوشت  
 کے بورے لے کے چلے۔ اُس غار کے قریب پہنچے جہاں وہ مہیب دیو پڑا خزانے سے رہتا  
 یہ غار اتنا بڑا تھا کہ ہر طرف تین تین میل کا طول و عرض تھا مگر اُس کی سانسون کی آندھی کے  
 ہونکے اس قدر زور و زور سے چل رہی تھیں کہ کوئی بہادر سے بہادر شخص بھی بڑی مشکوں سے  
 اندر جاسکا۔ وہاں جا کے دیکھا کہ وہ دیوتا ہڈیاؤں پہلائے ایک بڑے ہماری پلنگ پر  
 پڑا ہوا ہے۔ بھینس شور اور ہرن کا گوشت جو اُسکی مرغوب غذا تھی اُسکے منہ کے سامنے بہت  
 ڈھیر کر دیا۔ غار کو جنوبی خوشبودار دیوتاؤں سے مائل کر دیا۔ یہ سب سامان کر کے خوبصورت ارد  
 سے اُس کے منہ پر ہوا دینے لگے۔ سفید سفید اور شفاف سنگہ منہ سے لگا کے زور زور سے  
 بجھائے گئے اور گانا شروع کیا۔ سارا غار دیوتاؤں کے راگ سے گونج اُٹھا جب یوں ہی  
 خیمہ ہوئی تو سب رکشس زور زور سے اپنے اپنے سینے کوٹنے اور پٹینے لگے۔ ان گونجوں  
 سے بادل کے گرجنے کی آواز پیدا ہوتی تھی سارا اُس غار میں ایک اور مہیب ہنگامہ مچ گیا۔

جسٹین۔ ڈیول۔ نرسنگے اور ترنا کی آواز میں زور و شور سے بلند تھیں۔ اسکے ساتھ راکشون نے اپنی رجز خوانی سے اور شور و غل چار کہا تھا۔ انکی سینہ کوئی اسپر ہی طرح تھی۔ یہ آوازیں ایسی کزفت اور صیبت تھیں کہ چڑیاں مرد کے ٹھنڈیوں پر سے گر پڑیں۔ مگر قیامت کے سونے واسے کبھہ کرن کے کان پر جون تک نہ رینگیں۔ وہ اپنے آرام سے پاؤں پھیلائے سو یا ہی کیے تاخر ان راکشون نے بڑے بڑے سونٹے اور لٹہ لٹہ تھپتھپے لیے اور اس کے سینہ کو جیسر بالوں کا جھل لگا تھا زور زور سے پٹپٹا شروع کیا۔ اسکے علاوہ بڑی بڑی چٹانیں اٹھا اٹھا کے اُسے مارنے لگے۔ اسپر ہی انہوں نے کروٹ نہ بدلی اور نہ ان اٹھتوں کی چوٹ اور نہ ان چٹانوں کی دھمک انکو محسوس ہوئی مجبور ہو کے پھر سب نے ملے ایک مرتبہ اور زور سے سنکا اور ڈھول وغیرہ بجانا شروع کے اور زیادہ زور زور سے لائیاں سو گریاں چٹانیں اسپر پڑنے لگیں۔ اگلے علاوہ انکی آہستہ آہستہ گنگاوارنٹ کے پھلانے اور گھوڑوں کے ہنسنے سے ہی ان کے جگانے میں مدد ملی گئی۔ مگر ان کی آنکھ نہ کھل سکی تھی۔ تب تو راکشون کو بڑا غصہ آیا۔ صد ہا گھرے پانی انکے سر پر ڈال دیا۔ بڑے بڑے دانوں اور پنوں سے کان اور بال نوچنے لگے۔ کئی ایک لٹہ ایک مین باندھے انکے سر پر سنہ پر خوب خوب کو بے کاری کرنے لگے۔ جنگلی ہاتھوں کو انکے جسم اور ہاتھ پاؤں پر دوڑایا۔ اس غیر معمولی بوجھ سے میان کبھہ کرن کی آنکھ کھلی۔ اس دیو نے اپنے بدن کو حرکت دی۔ چکا اور چوتھا ہوا۔ زخموں اور اس مار کی گویا اُسے خبر ہی نہ ہوئی۔ ہو کا پیا سا ایک بے پردائی کی وضع سے جھپائی کے اٹھا۔ اُسکا منہ بہاڑیا و زخ کی طرح کھلا۔ جسکے اندر لال لال جڑوں کا رنگ ایسا سرخ تھا جیسے آفتاب جس گھڑی میرد ہار کے پہلو میں چکر رہا ہو اُسکی چلنی ہوئی سانس میں یک گرج کی سی آواز تھی یعنی جیسے وہ آندھی جیسے جھکے جھونکے پہاڑوں کو ٹکراتے ہوئے آتے ہیں۔ اُس نے اپنا گھوڑے کا ایسا منہ اٹھایا جس میں جھاڑو کے ایسے دھار تارے کی طرح آنکھیں چمک رہی تھیں اُسکی صورت سے موت کی ہولناک صورت یاد آ جاتی تھی۔ اُسکو جس صیبت وضع سے کھڑا دیکھ کے راکشون نے جھینس سور اور تیرن کے گوشت کے انبار کی طرف اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی دیو نے گوشت خون اور شراب طعن تک ٹھوس فی جب اُسے کھانے سے فراغت ہوئی تو دیو دن کو اُسکے قریب جانے کی کجرات ہوئی۔ بہوں نے بڑے بڑے خون اور عظیم سے سر جکا دیا۔ کبھہ کرن کی آنکھیں نہیں ابھی جاگ اٹھیں۔

وجہ سے قیند بھری ہوئی تھی نیلی پہلی کہیں۔ چاروں طرف منہ پیر پیر کے دیکھا۔ اور رات کے رہنما راکشسوں کی طرف خطاب کر کے کہا "تم سب نے مجھے کیوں جگا دیا کسی ایسی وجہ سے جھکو جگانے کی کہ فی حرات نہیں کر سکتا۔ کہو راون خیریت سے تو ہے یا نہیں کسی اور بات کا ڈر ہے کہ تنے مجھے جگا کے تکلیف دی۔ میری بات کا ن لگا کے سن لو۔ دیوون کا بادشاہ خوف سے کانپے گا۔ آگ بجھ جائے گی۔ اور خود اندر ہر پڑا ہو گا قبل اسکے کہ وہ بے فائدہ مجھے قیند سے جگا سکے۔"

عقلمند یو پاکش نے عاجزی کے لہجے میں جواب دیا ”آج تک نہ کسی دیہ نے نہ کسی یو آ  
نے ہمارا مقابلہ کیا۔ مگر جاہلے شہر کے سونے کی دیواروں پر آسافون کی فوج نے حملہ  
کیا۔ اور یہیں خوف ہے کہ کہیں وہ غالب نہ آبا میں کیونکہ۔ امجد رہت سے آدم نہ رہا  
اپنی بیوی کی بے حوصی کا بدلہ لینے کے لیے لائے ہیں اور بڑی فوجوں کا انڈیشہ  
ہے۔ لشکا میں دشمنی کی آگ بھڑک رہی ہے۔ راون اپنے بڑے بڑے سورماؤں کو  
غزیروں کی لاشوں پر درور رہا ہے۔ ہم ہی نہیں۔ ہمارا بادشاہ جبکہ قدم کو آتے تک کہیں  
غزیرش نہیں ہوئی۔ اور جو دیوؤں اور آسمانوں کی فوجوں سے مقابلہ کر چکا ہے۔  
اسی خوف طاری ہو گیا ہے۔ امجد رے اُسے شکست کھائی۔ اور رام چند نے اُس کی  
جان بخشی کی۔ یہ سنکر کچھ کر ن بولا ”میں جا کے سب کا خوب بدلہ لوں گا۔ آدم نہ کی  
فوجوں کو اپنے پاؤں کے نیچے روندوں گا۔ تب بادشاہ فتح سے خوش ہوگا شہزادہ  
کاخون میں پونے گا۔ اور تم فوج بہر کاخون پنا۔ اچھا“  
رامستہ۔ محمد عبدالستار  
از منبر انجلی محل لکھنؤ۔

کتاب و خاک جہد کا خانہ

ہم بڑی خوشی سے اپنے ناظرین کو مطلع کرتے ہیں کہ اپنے احباب کی ضرورتیں دیکھ کے ہم نے عام طور پر انتظام کر دیا ہے کہ جتنی اور جس قسم کی اور جو کتابیں وہ مانگیں، فز و گلڈز کے، ریچرچر انکودی جائیں جو کتاب جہاں تک ہم پہنچ سکیں گی فز و گلڈز اسکو اپنی ذمہ داری سے فہم ہم کر دے گا۔ لہذا اطلاع دیجاتی ہے کہ جن صاحبوں کو بس کتاب کی ضرورت ہو تو تحریر فرمائیں فوراً روانہ ہوگی۔ محمد عبد الحکیم شہر رستم و گلڈز و مہندب

## دہلی مرحوم

ہندوستان کا قدیم دار الخلافہ دہلی ایک ایسا شہر ہے جسکی تاریخ کی طرف  
 توجہ کی جائے تو ہمیں بہ نسبت دیگر مقامات سے یہاں زیادہ دلچسپی کے سامان نظر  
 آئیں۔ افسوس اس شہر کی تاریخ کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ بطرح حافظ ابوالقاسم  
 علی بن سن عساکری نے شہر دمشق کی تاریخ اسی بلدون میں لکھی تھی اور بطرح ابوالکلام  
 طبیب بغدادی نے شہر بغداد کی تاریخ دس جلدوں میں لکھی تھی اسی طرح ضرورت  
 تھی کہ قدامت ہندوستان میں سے کوئی حوصلہ مند اور واقفکار عالم دہلی کی پہلی ایک  
 عملی تاریخ لکھتا۔ مذکورہ علما سے اسلام نے اپنی تاریخیں اس طرح مکمل کی ہیں کہ جس شہر  
 کی تاریخ لکھی ہے وہاں سے باوجود انہوں نے تمام نامور علما کے تفصیلی  
 حالات۔ شہر کے تغیرات اسکی ترقیاں، اس کے تزلزل وہاں کی مشہور عمارتوں  
 محلوں اور مسجدوں غرض تمام باتوں کو جسے الاسکان قلمبند کر دیا ہے۔ خاص ہی کی  
 تاریخ اول تو کوئی لکھی تھی ہی نہیں۔ اگر کچھ بتا چکا ہے تو ان تاریخوں سے جو عام  
 پولیٹیکل حالات بہت متعلق لکھی گئی ہیں صرف ایک منفرد دلچسپ آئینہ سید احمد خان بہادر  
 نے البتہ لی کہ انہی کتاب آثار الصنادید میں انہوں نے دہلی کی کل عمارتوں کا حال لکھا  
 ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہوا ہے ان عمارتوں کی تاریخ بھی تصریح کے ساتھ بتائے کی  
 کو شمش لی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی منفرد دلچسپ کو کبھی یو۔ سی کامیابی نہیں حاصل  
 ہو سکتی۔ آثار الصنادید کی عبارت تبارہی ہے کہ سید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کو  
 تحقیق و تفتیش سے کم تعلق ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنے خیالات کو عام مذاق کی سطح پر  
 قائم کیا ہے اور عام لوگوں کی بتائی ہوئی باتوں کو بجا کر دیا ہے۔ افسوس یہ صاحب  
 کو شاید اتنی مہلت نہ ملی۔ ورنہ اگر وہ ہندوستان کی تمام تاریخوں کے ورق الٹ کے  
 درخوب تدقیق و تنقید سے کام لے کے اپنی بے مثل کتاب کا دوسرا ایڈیشن خود ہی



مرتب کرتے تو وہ کتاب الجواب اور بے مثال ہو جاتی۔ مگر سچ یہ کہ انہوں نے جو کچھ کیا یہ بھی عصمت بلکہ بہت بڑا غریب دہلی ایسی حسرت نصیب ہے کہ اب تو اس کے زوال کا زمانہ ہے جب وہ عروسی پر تھی، سوخت کا اگر خیال کیجیے تو کوئی انسا پوچھنے والا بھی نہ تھا۔

آج دہلی میں جاکے اس کے اطراف میں پرے۔ ٹوٹی اور عدم امت کی بارگاہی ہوئی عمارتوں کو دیکھیے تو حسرت نکلیں گی۔ برکیسی کا عجیب عالم خوشحال نظر آئے گا ہر عمارت جو کچھ باقی ہے کہ رہی ہے اگر اس کی طرف دل کے دانہ نہ افسوس جائیں تو بھی ہم بے قیاسی آہاؤں سے کام لے کے سوخت کی تھیرکا بار و زنجیر کا اچھا سا نسخہ قائم کر سکتے ہیں اور انہی آہوں سے دیکھ سکتے ہیں کہ اس عمارت پر لگے دنوں کیا رونق تھی اور وہ کیسے زحمت و انبساط کی جگہ ہو گئی۔ ہم جانتے ہیں کہ تاریخوں و ورق ان کے لیے دہلی کی گزشتہ رونق دکھائیں اور اپنے ہم وطنوں کو یکساں اثرات نہ سنائے تاثر کریں۔ لیکن افسوس ہے ہمیں ان کتابوں اور راجحوں سے اس امر کی کسی قسم کی رو بہین مل سکتی جو خاص ہندوستان کے مسلمانوں نے لکھی ہیں ہاں اگر ہم غیر مقامات کے آئندہ والوں اور اس عہد میں دہلی کا ناشاد کیلئے اپنے ہم وطنوں سے بیان کرنے والوں کی طرف توجہ کریں تو غالباً یادہ لطف انگیز ہوگا مثلاً یہ وہ رے کے ابتدائی اور وسطی عہدوں میں بعض یورپین ہی یہاں آئے تھے جنہوں نے اپنے سفر ناموں میں ہندوستان کی اس اگلی سوسائٹی کی تصویریں دکھائی ہیں۔ ایسے سفر ناموں کو اہل ملک بکثرت دیکھ چکے ہیں۔ ڈاکٹر برنی آر کا سفر نامہ حلیفہ میر محمد حسن صاحب وزیر پٹیاہ کی کوشش سے آج اہل ملک کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم میں بطوطہ کی طرف توجہ کرتے ہیں تو تیمور بانی خاندان مغلیہ سے بھی پہلے ہندوستان میں آیا تھا۔ عام خیال ہوگا۔ اور جہاں تک پہنچنا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکثر لوگوں کی یہی رائے ہے کہ دہلی کی زیادہ شان و شوکت اور آبادی کی رونق شاہجہان کے بعد سے ہوئی۔ موجودہ عمارتیں جو قدیمت کی یادگار کی حیثیت سے ہمارے زمانے تک باقی رہی ہیں انہیں سے جو زیادہ قابل قدر اور موجب استعجاب ہیں انکا بانی شاہجہان ہی تھا۔ لیکن ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیاس غلط ہے۔ دہلی کی رونق خاندان مغلیہ سے پہلے ہی

بہت ترقی پرتھی۔ اور بیان کا دربار اُن دنوں بڑا باجاہ، جلال دریا خیال کیا جاتا تھا۔ صرف گویا اتنے دعویٰ کے ثبوت کے لیے پوجہ و رسالت، پبلک کے سامنے پیش کرتے ہیں جو ابن بطوطہ نے دہلی میں آگے اپنے چشم دید بیان کیے ہیں۔ شہر تجری ہیں ابن بطوطہ کو شہر اہلی کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ بیان کرتا ہے کہ قصبہ پالم جو ایک بہت بڑے غرز اور مقرب و شیر سلطان رئیس سندھ کے نام سے دین پھری کی جاگیر میں تھا وہاں سے روانہ ہو کے دس روز میں خاص دار الخلافت دہلی میں داخل ہوا۔ یہ ایک بڑا عظیم الشان شہر ہے۔ آبادی بہت زیادہ ہے۔ صوبوی اور خوبصورتی و رنگ و بھر سے بے مثل اور لا جواب ہے جس میں صوبہ شہر پناہ دہلی کے گردشی ہوئی ہے دسی عمدہ اور شہر پناہ دینا۔ کہ نہ کسی شہر میں نہیں ہے۔ تمام بلاد ہندوستان ہی پر نہیں۔ بلکہ ساری مشرقی دنیا سے اسلام کے شہر دن پر دہلی کو ترجیح ہے۔ فی الحال دہلی چار مختلف شہروں پر تقسیم ہے۔ جو قریب قریب اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ وہ حصہ جو خاص دہلی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ تو وہ ٹکڑا ہے جو قدیم شہر ہے اور ہندوؤں کا آباد کیا ہوا ہے۔ جسکو مسلمانوں نے فتح کیا تھا۔ (اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دہلی کو مسلمانوں کے قبضہ میں آنے سے صرف ۵۲ برس ہی گزرے تھے جبکہ ابن بطوطہ ہندوستان میں آیا ہے۔ اب اس کے بعد ہم اندازہ کر سکیں گے کہ اس ڈیڑھ سو برس کی مدت میں مسلمان فرمانرواؤں نے دہلی میں کیسی عمارتیں بنائیں اور اسکو کیسی رونق دی تھی) دوسرا حصہ شہر حیر سیری کہتے ہیں وہی دار الخلافت کے نام سے ہی یاد کیا جاتا ہے جو پیشہ سلطان غلام الدین اور اس کے بیٹے قطب الدین کا مستقر خلافت تھا۔ یہ شہر سلطان وقت نے خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کے نواسے غیاث الدین کو دے دیا تھا۔ تیسرا شہر تغلق آباد کہلاتا ہے جسکو سلطان محمد تغلق جسکے عہد میں مجھے ہندوؤں کی زیارت نصیب ہوئی اس کے والد مرحوم سلطان غیاث الدین تغلق نے آباد کیا تھا۔ اسکی آباد ہونے کی ابن بطوطہ نے عجیب و غریب بیان کی ہے وہ کہتا ہے کہ غیاث الدین تخت نشین ہونے کے پہلے جب سلطان قطب الدین کے امراء دربار میں تھا تو اتفاقاً ایک روز سلطان قطب الدین کا ایک خوش سوار اور مناسب

مقام پر گلدہوا۔ غیاث الدین نے بادشاہ کی خدمت میں دست بڑھ کر عرض کیا کہ  
 ”خداوند عالم اگر اس مقام پر شاہی قصر اور شہر آباد ہوتا تو نہایت مناسب تھا۔“  
 قطب الدین نے استہزاء بنانے کے لیے مین کہا ”اچھا جب تم بادشاہ ہونا تو  
 ایسا ہی کرنا“ خدا کی قدرت کہ قطب الدین کے بعد تاج شاہی غیاث الدین کی  
 سر پر رکھا گیا اُسے اپنے دل میں کہا کہ ”اب خدا نے میرے ولی نعمت کی آرزو  
 پوری کر دی تو مجھے بھی سکاتوں ہو کر کرنا چاہیے لہذا اس شہر کی بنیاد ڈالی  
 اور نہایت رفعت و شان سے آباد کیا اور پوہتا شہر جہاں پناہ کے نام سے  
 نامزد ہے۔ اور سلطان عمر سلطان محمد تغلق اس شہر میں رہتا ہے۔ یہ بڑا دلہا  
 بادشاہ ہے۔ اُسے ارادہ کیا تھا کہ ایک اتنی بڑی شہر پناہ بنائی کہ شہر دہلی کو چاروں  
 حصے اُسکے اندر آجائیں بلکہ یہ کام شروع ہی کر دیا گیا تھا۔ مگر وجہ زیادتی مصارف  
 کے بغیر تمیل کو پہنچے چوڑا دیا گیا۔ قدیم شہر پناہ دہلی جو عرصہ سے قائم ہے وہ بھی  
 مستحکم و مضبوط ہو کہ اُس کے برابر مضبوط اور دہلی عجیب و غریب شہر پناہ دینا  
 کسی شہر کے گرد نہ ہوگی۔ دیوار کا آثار گیارہ گز تک کا دیا گیا ہے اور سارے شہر کے  
 گرد دیوار اتنی ہی چوڑی ہے۔ جا بجا آسمین مکانات بنے ہوئے ہیں جن میں مخمطین  
 شہر اور انشراہل پولیس رہا کرتے ہیں۔ اس شہر پناہ کے اندر جا بجا کتے ہیں جن میں  
 خلد بہاؤ ہے۔ اور نہایت حفاظت سے رہا کرتا ہے۔ اور بعض جگہ اس شہر پناہ میں  
 اسکی اور جنگلی فہرہ توں کا سامان فراہم رہتا ہے۔ لیکن غلہ جس حفاظت سے ان  
 کشتوں میں رہتا ہے اس پر مجھے بھی حیرت ہے۔ مگر توں رہتا ہے۔ نہ کسی قسم کا تغیر  
 ہوتا ہے اور نہ آسمین کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ ان کشتوں سے چاول  
 نکالے گئے تھے۔ انکو خود دینے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ ان رنگ میں تو میلان آ گیا  
 تھا مگر مزے میں ذرا فرق نہ تھا۔ ان کشتوں میں جو کچھ غلہ تھا سب سلطان بلبن کا  
 فراہم کیا ہوا تھا۔ جسکو نوے برس کا زمانہ گزر چکا تھا۔ اس شہر پناہ پر دو سوار نہایت  
 آسانی سے دوڑ سکتے ہیں۔ دیوار نیچے سے چوڑی ہے اور اوپر سواروں کو دوڑنے  
 کے قابل وسعت چوڑ کے دیوار کا ایک حلقہ قائم کیا گیا ہے۔ جسکی وجہ سے سوار شہر کی  
 طرف سے تو نظر آ سکتے ہیں لیکن باہر سے کوئی انہیں نہیں دیکھ سکتا۔ نیچے کا حصہ ہر کا

نما ہوا ہے۔ اور اوپر کی دیوار اینٹ و رچوٹ سے قائم کی گئی ہے۔ بلند ہی پر  
 قریب بابریج چلے گئے ہیں جو نہایت خوشنما اور بہت ہی بکرا آمد میں شہر نیاہ  
 کے ۲۰ دروازے ہیں۔ سب سے بڑا دروازہ بدوان دروازہ ہے۔ باقی ایک  
 سندھی دروازہ۔ ایک گل دروازہ شاہ دروازہ۔ غزنی دروازہ اور پنجابی دروازہ  
 ہے جسکے باہر دہلی کا قبرستان واقع ہے۔ اکثر قبروں پر گنبد بنے ہیں اور گنبد  
 زمین نو بہ قبر کے پاس ایک حلقہ خمر بنا ہوا ہے۔ اس قبرستان میں دس پندرہ  
 رخت لگے ہوئے ہیں۔ بہن بنو ہلی جو کہیں رائے پل دوڑی ہوئی ہے سہی  
 طرف چنیل ہے۔ اور کسی جگہ بلیہ لکھتے ہوئے ہیں۔ اور بارہ تان  
 کا کرتا ہے۔

دہلی کی جامع مسجد دیکھنے کے قابل ہے۔ اسکے آگے بہت بڑا اور وسیع صحن ہے۔  
 یوارین چیت اور فرش جس چیز کو دیکھیے نگ مرمر کی جو حکو عجبت سے  
 ہوا ریا ہے۔ ۱۰ بیسیہ لکھلا لکھلا کے ان تہرہ ان جڑائی کی گئی ہے جس سے  
 زما و مضبوط جوڑ اور سطح بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ لکڑی کا کہیں نام ہی نہیں اس مسجد  
 پر تہ کے تیرہ گنبد ہیں۔ مگر ہی تہرہ کا ہے چاروں طرف عمارت ہو۔ درمیان میں  
 ایک عجیب و غریب ستون کی نسبت اس وقت تک یہ نہیں دریافت ہو سکا کہ کس و مات  
 بنا ہوا ہے بعض محققین ہندوستان نے مجھے بیان کیا کہ سات قسم کی دہلیوں کے  
 زیب دے لے ایک بنا و مات بنایا جاتا ہے جسے یہاں فارسی زبان میں فوت پیش  
 لے ہیں۔ یہ ستون بھی اسی و مات سے بنایا گیا ہے۔ اس ستون کے تھوڑے تھوڑے پر  
 چلاوے دی گئی ہے۔ جو نہایت ہی ابداری کے ساتھ صنو اور شمعین بنا ہوا ہے۔  
 اور مضبوط اس قدر ہے کہ اسپر لو ہا بالکل اتر نہیں سکتا۔ کوئی آٹھ اسکو نہیں کٹ سکتا  
 یہ ستون میں گز لہا ہے اور اس کے دور کو بیٹے اپنے عمامہ سے ناپا تھا جس قدر حصہ  
 اکی بیٹ میں آکھا وہ آٹھ گز تھا مسجد کے مشرقی دروازے پر تانے کے دوڑے  
 سے بت پڑے ہوئے ہیں جو پتھر ملی زمین پر جم گئے ہیں۔

جس جگہ پر یہ مسجد بنی ہے وہاں قدیم بت خانہ تھا۔ مسلمانوں نے فتح کرنے کے بعد  
 اسے مسجد بنا لیا۔ مسجد کے شمالی حصہ صحن میں ایک اتنا بڑا مینار ہے جسکی نظیر سے تمام

بلاد اسلام خالی ہیں۔ یہ عجیب و غریب مینار جسے اب لوگ قطب صاحب کالاٹ  
 کہتے ہیں، بخلاف ساری مسجد کے سنگ سرخ سے بنایا گیا ہے۔ مسجد کے اور تمام  
 حصوں میں سنگ مرمر لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مینار کے پتھر میں یہ بھی لطیف  
 پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے پتھر پر کھور کو نقش و نگار نالے گئے ہیں۔ بلندی بہت  
 زیادہ ہے۔ چوٹی سنگ مرمر کی ہی اور اُس کے حاشیوں اور کناروں پر طلاکاری ہے  
 اسکی بلندی پر چڑھنے کے لیے راستہ اتنا وسیع رکھا گیا ہے کہ ہاتھی بخوبی چڑھ سکتا ہے  
 ۔ ملکہ ایک معتبر و مستند شخص نے مجھے بیان کیا کہ جن دنوں یہ مینار بن رہا تھا ان  
 دنوں میں اپنی آنکھ سے پتھر لاوا کے لیجانے والے ہاتھیوں کو اُس پر چڑھتے دیکھا تھا  
 اس مینار کو سلطان معز الدین بن ناصر الدین بن سلطان غیاث الدین بلبن نے تعمیر  
 کیا تھا۔ اُس کے بعد سلطان قطب الدین نے ارادہ کیا کہ مغربی حصہ صحن میں ہی ایسا  
 مینار اُس مینار سے زیادہ بلند اور بڑا تعمیر کرائے۔ اس پر عمل شروع کر دیا گیا۔ ایک ٹیٹ  
 حصہ مینار کا بن بھی گیا تھا۔ لیکن سلطان قطب الدین کی عمر نے زمانہ کی اور قبل  
 تکمیل کے مر گیا۔ پھر سلطان محمد نے ارادہ کیا کہ اُس مینار کو پورا کر دے مگر پھر مرنے  
 جانے سے وجہ سے منحوس خیال کر کے چھوڑ دیا۔ اسکی وسعت اتنی رکھی گئی تھی کہ ہمیں  
 برابر ایک ساتھ تین تین ہاتھی بڑھ سکتے تھے اور یہ ٹیٹ حصہ رہا ہے۔ بلندی میں  
 اُس پہلے مینار کے برابر ہے یعنی اگر تکمیل کو پہنچتا تو اُس کا گنا بلند ہو جاتا ایک مرتبہ  
 میں اسکی بلندی پر چڑھا تھا مجھے وہاں سے تمام بڑے بڑے مکانات شہر کے نظر آئے  
 اور شہر نپاہ کی دیواریں باوجود اپنی بلندی اور رفعت کے وہاں سے نہایت ہی سہل  
 اور ذرا اور اسی معلوم ہوتی تھیں۔ اور اچھے خاصے توانا و تند رست اور قوی ہیکل آدمی  
 وہاں سے مجھے چوکے چوکے بچوں کے برابر معلوم ہوتے تھے۔ اس مینار کی بلندی  
 حقد رہے اُس کی جانب کسی کا خیال ہی نہیں جاتا ہے۔ اس لیے کہ اُس کا پھیلاؤ اور  
 دور اتنا زیادہ ہے کہ کوئی اُسے دیکھ کے اتنا بلند نہیں تصور کر سکتا ہے۔  
 سلطان قطب الدین نے ارادہ کیا تھا کہ شہر کے حصہ سیری میں جسے دار الخلافہ  
 کہتے ہیں ایک اور جامع مسجد تعمیر کرے جو رفعت دشان میں کل گزشتہ عمارتوں  
 سے بڑھ کے ہو۔ مگر سو اسامی نے کی دیوار اور محرابوں کے کچھ بن نہ سکا۔ آہیں جا رقم کے

پتھر رکے گئے تھے۔ سنگ مرمر۔ سنگ موت۔ سنگ سبز۔ اور سنگ سبز اگرچہ  
 ہوا ہی ہو جاتی تو آئین شک نہیں کہ ساری دنیا میں اس کے برابر کوئی عمارت  
 نہ ہوئی۔ سلطان محمد نے راویہ کیا کہ اسکو بھی تکمیل کو پہنچانے لیکن تمام کام کرائی  
 کو مبرا کے صرف غزوہ ری کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ پینتیس لاکھ روپیہ فقط غزوہ  
 میں صرف چھوگا۔ پھر تیس کے تمام مصارف کو بہت زیادہ تصور کر کے سلطان  
 محمد اپنے راسے سے دست بردار ہو گیا۔ مگر مجھے خاص سلطان کے بعض مقرریں  
 نے بیان کیا کہ بدشگونئی کے خیال سے اسے یہ ارادہ منع کر دیا اور بدشگونئی یہ کہ  
 سلطان قطب الدین اصل بانی قبل تھیں کہ مار ڈالا گیا تھا۔

نہ دہلی کے برابر ایک بہت بڑا حوض ہے جو سلطان شمس الدین لہنس کی جانب  
 منسوب بنا دیا ہے۔ اس شہر اسی کا پانی پیتے ہیں۔ یہ حوض عید گاہ کے قریب ہر  
 ان حوض میں اور زمین سے پانی نہیں آتا ہے۔ بلکہ صرف برساتی پانی جمع ہو جایا  
 آتا ہے اس حوض کا طول دو میل کا ہے اور عرض ایک میل کا۔ اور اس کے  
 پانی کنارے بہت ہر عید گاہ ہے پتھر کے زینے بنے ہوئے ہیں اور جا بجا دکانیں  
 ہیں جن کے اوپر پانی چلی گئی ہیں۔ اور ہر دکان کے نیچے زینے بنے ہیں جو پانی  
 سے ان تک اترتے چلے گئے ہیں۔ ہر دکان کے پہلو میں ایک برج بنا ہوا ہے جس میں  
 سیر کرنے والوں یا تفریح کو آنکھنے والوں کے لیے نہایت عمدہ گنجائش ہے۔  
 حوض کے عین درمیان میں جان سے ہر طرف برابر بعد ہے ایک بڑا برج بنا ہوا ہے  
 جس کی عمارت میں نقش پتھر لگایا گیا ہے۔ اور اس کے دو درجہ قرار دیدیے گئے  
 ہیں۔ علاوہ بریں وان تک پہنچنے کا راستہ بھی ہے۔ جب پانی زیادہ ہو جاتا ہے تو ان  
 قانون رہتہ بند ہو جاتا ہے اور لوگ صرف کشتیوں کے ذریعے سے جا سکتے ہیں  
 اس برج کے اندر مسجد ہے اور اکثر اوقات حج اور مسجد میں فقراء و متوکلین سکونت پذیر  
 ہیں۔ جب پانی خشک ہو جاتا ہے اور جا بجا سے حوض کی زمین کھجاتی ہے تو آئین  
 اکثر گئے ٹھہرے اور گکڑی اور تر بوز اور خربوزے کی زراعت ہوتی ہے۔  
 اس حوض کے علاوہ دار الخلافت اور قدیم دہلی کے درمیان میں ایک اور حوض  
 ہے جو مذکورہ حوض سے بڑا ہے۔ اور اس کے گرد چالیس برج نہایت خوشنالی اور

عظمت و شان کے ساتھ بنائے گئے ہیں۔ اس حوض کے گردا۔ باب نشاۃ کے مکانات بنے ہیں۔ یہیں انکا ایک بہت ہی بڑا بازار ہے۔ جس میں ایک جامع مسجد اور بہت سی دھوبی ٹھہری مسجدیں ہیں۔ وہاں کے معتبر لوگوں کی زبانی میں سنہ ۱۷۰۰ء طبع الفتنہ در زندیان اس حلقہ میں رہتی ہیں ماہ مبارک رمضان میں ان مسجد میں جمع ہو کے تراویح پڑھاتے ہیں۔ اور بہت سے امام معین ہیں جو امامت کیا کرتے ہیں۔ علی بن القیاس دوم ڈواری جنگو اُسے زیارت کا علاقہ ہے اور سے تراویح میں سرگرمی دکھاتے ہیں بلکہ ایک مرتبہ میر سیف الدین کے یہاں میں نے ایک تقریب میں خود دیکھا کہ ان لوگوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک باننازدی گئی جسکو اُس نے اپنے گھٹنے کے نیچے رکھ لیا اور جیسے ہی اذان کی آواز آئی اُٹھ کے وضو کیا اور نماز میں مشغول ہو گیا۔

دہلی میں اکثر بزرگان دین کے مزار ہیں جنکی زیارت نہایت عقدا اور سرگرمی سے کی جاتی ہے۔ خصوصاً خواجہ قطب الدین بختیار کاکی فقہ نور الدین کرانی اور غیہ علا الدین کرانی کے رونے مرج عام ہو رہے ہیں۔

علماء ہی بڑے بڑے معتبر اور مستند موجود ہیں جن میں سے ایک شیخ محمود کباہین۔ اُنکی نسبت لوگوں کو خیال ہے کہ انہیں قدرت کی جانب سے دست نیب ہو۔ ایسے کہ ظاہر میں کوئی آمد نی نہیں اور فیاضی کا یہ عالم ہے کہ ہزار ہاروپہ راہ خدا میں دیتے رہتے ہیں شب در روز ممانداری اور دست فقرا ہی میں گذرتی ہے۔ اور ایک عالم شیخ علاء الدین نیلی ہیں۔ یہ ہر جمعہ کو وعظ فرمایا کرتے ہیں۔ اُنکے وعظ میں یہ اثر ہے کہ کوئی جمعہ اس سے خالی نہیں جاتا کہ لوگ آکے اُنکے ہاتھ پر کفر و شرک سے توبہ نہ کرتے ہوں اور بعضوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اُنکی زبان سے موثر الفاظ سُن کے وجد میں آجاتے ہیں اور از خود درفتہ ہو جاتے ہیں۔

اس قدر حال بیان کر کے ابن بطوطہ نے دہلی کی تاریخ بیان کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ اسلام اس شہر میں کیونکر اور کس عہد میں آیا۔ اور اُس وقت سے ہوتی تک کتنے بادشاہ گذرے۔ اور آخر میں آکے کہتا ہے کہ موجودہ فرمان روا جسکے عہد میں آنے کی مجھے عزت حاصل ہوئی وہ سلطان محمد شاہ ہے۔ اپنے باب سلطان

یہاں اہلین اقلق کے ملنے کے بعد بغیر کسی جھگڑے اور خرنشے کے اور بے اس کے کہ کوئی مزاحمت کرے دارش تاج و تخت ہوا۔ ایام دلی عہدی میں شاہزادہ جو نہ کہلاتا تھا۔ تخت پر بیٹھا سلطان محمد نام اور ابو الجاہد کنیت سے اپنے متبع مشہور کیا۔

یہ عاصی الامند اوطیہ رہ گیا۔ شاہ ہے۔ اس کے دور دولت پر جب گذریے دو باتوں سے حالی نہ پاسے گا۔ کوئی نہ کوئی فقیر محتاج اپنی کامیابی پر دعائیں ضرور دے گا۔ ہوگا۔ اور کوئی نہ کوئی گناہگار ضرور نیک ہو رہا ہوگا۔ سلطان جتنا بڑا رحم دل سے اتنا ہی بڑا سخت گیر ہے۔ اس کے نام کے ساتھ ان دونوں اوصاف کو شہر ہو گئی ہے۔ اور اسی بنا پر جس طرح دور دور کے محتاج اور فقرا امیدوار ہوئے وہی کی طرف رہا نہ ہوئے ہیں۔ اسی طرح چاہے ابلی سے کتنی سی دور ہو مگر جہاں کسی بے معاش اور غلام شخص کے سامنے سلطان محمد اقلق کا نام لے دیکھے فوراً کانپ اٹھتا ہے۔ مگر لوگوں کو یہ سن کے ہرست ہو گئی کہ سلطان ہند باوجود اتنی بڑی سخت گیری اور اتنی تم پسندی کے انتہائی زیادہ بے لقا و خفیق۔ اور جسکے المزان شخص ہے خصوص امور دینی میں۔ دین کا نہایت بے گار ہے۔ نہ رکے مارے میں بڑی اصدیاط اور تکرید ہے۔ اور نارک العلوا کو فروغ دے دینا ہرم پر مزا دہا ہے۔ لیکن باوجود ان سخت گیریوں کے میرا فیصلہ ہی ہے کہ احمد و فیاضی ان کے مزاج میں بہ نسبت جوش انتقام کے بڑھ ہی ہوئی ہے۔ اس کے فعال و حرکات کے متعلق میں ایسے ایسے واقعات نقل کران گا جن کو مورخین نے باوجود ان کے جستجو کے نہ شاہان سلطنت میں سے کسی میں پایا ہوگا۔ اور نہ کسی موجودہ تاسداری میں۔ اس کے بعد ابن ابی طہ اپنی قول کی تصدیق کرانے اور اپنی سچائی پر زور دینے سے یہ کہتا ہے کہ ابن اللہ جل شانہ۔ کیا یہ مقدس اور انور عہدہ ہم کی قسم کہا کے کہتا ہوں کہ سلطان محمد تغلق کی نرق و ردت کے دور کو پہلے ہی فیاضیان جو کچھ میں نے بیان کی میں سب کو غایتاً تحقیق سے سمجھتا ہوں۔ صحت پر پورا یقین کر کے لکھا ہے۔ اگرچہ جانتا ہوں کہ بعض ولہ ان باتوں کو بحال خیال کر رہے ہیں۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے ان سب کو گویا اپنی آنکھ سے دیکھ کے اور خوب تحقیق کر کے لکھا ہے۔ اور یہ تمام باتیں ان دنوں کل بلاد مشرق میں اس طرح مشہور ہیں کہ ہر ہر بچہ جانتا ہے۔



## رامائن کے بعض سین

راون کا یوزاد بھائی کبھہ کران بھی جاگا۔ لڑائی میں اُس نے جو کچھ کیا اُس سے ہمیں غصہ نہیں۔ اب ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ موجود متواتر ناکامیوں اور بے پے شہسختوں کے بجائے لڑائی میں مایوسی کے اضطراب کے ساتھ راون میدان جنگ میں آیا ہے اُسوقت اُسکی کیا حالت تھی۔ میدان جنگ کس رنگ پر تھا۔ اور لڑکائے ظالم حامی کس خیال میں تھے۔ والیکسی اپنے دشمن باد و بھرے موثر اور تقویر دکھانے والے الفاظ میں لکھتا ہے:-

اردن نہایت ہی خوشخواری کے جوش میں میدان جنگ کی طرف لپکا۔ دیودان کی فوج کے سردار اس کے دہشتہ بانیں ہمراہ رکاب تھے۔ وہ سب لوگ جیسے ہی اپنے شہر لڑکا کے دروازے سے گزیرے ہوں گے ویسے ہی آفتاب دھندلا ہو گیا تھا۔ ہر چار طرف تاریکی چھا گئی تھی۔ مادل گرج اٹھتے۔ اور دھرتی دھمک دھمک اٹھتی تھی۔ خون کے مینہ کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ جس میں سے ہڑ کے سولے اور خوف زدہ گھوڑے بھاگے جاتے تھے۔ سر پر گد برابر منڈلا رہے تھے۔ جنہوں نے اپنے ننھوں پر دن سے اُسکے جھنڈے کو سرنگوں کر دیا تھا۔ سیار جو بھوک کی آگ بجھانے کو آئے تھے ان کے جھنڈے کے قریب سے جب راون کا رتہ گذرا تو ان کے ننھوں کی آواز میدان میں چاروں طرف گونج اٹھی۔ ان سب سے زیادہ قیامت یہ کہ آنکھ پڑ کر رہی تھی اور مازدوں میں درد ہو رہا تھا جسکی وجہ سے وہ اپنے دل میں نہایت وحشت زدہ اور سخت پریشان ہو گیا۔ اُسکے چہرہ پر زردی چھا گئی۔ اور آواز بالکل سست اور نہایت ہی ضعیف و کمزور تھی۔ اُس کے ساتھ ہی پر خوف۔ جلتا بلتا شہاب ناقب سنسناتا ہوا آسمان ٹوٹ کے نیچے تک چلا آیا۔ مردہ خواہیہ رادان کے سر پر برابر منڈلا رہے تھے۔ اور اُسکی فوج کے گھوڑے ۲۵ سے ۳۰ کے وقت دوڑتے تھے ساتھ روٹے بھی جاتے تھے۔ یہ سب بد شگونیاں نظر آرہی تھیں۔ اور ایسے نفس آوار نمایاں تھے۔ مگر وہ مجنون راجہ میدان جنگ میں آیا۔ اور رن پر موجود ہوا۔ خود ٹپنے اپنے ہاتھ سے اُسے ڈھکیل ڈھکیل کے اُسکی قیمت کے راستہ پر لگا دیا۔ اُس کے رتہ کے نیچے کی زمین۔ پہاڑ۔ جنگل۔ غار۔ ٹیلے۔ ندی۔ اور نالے سب کے سب یک بیک لرز گئے۔

یہ معلوم ہوا کہ کن پد شگونیوں اور بد اقبالی کی نشانیوں کے ساتھ راون موت کے آماجگاہ میدان کے میدان میں آیا۔ یہاں تک وہ آیا ہے تو اس کا خاتمہ ہی کر دینا چاہیے۔ دیکھنا چاہیے کہ ایسے خوی اور مصیبت ہاتھ پاؤں کے ساتھ وہ کیوں گھولے۔ اور آخر اس کی لڑائی کا کیا انجام ہوا۔ فریب ظلم اور بد فعلیوں کی سزا اسے ضرور ملنا چاہیے تھی۔ جسکو خدا نے اسی وقت پر تشریف لے لیا تھا۔ آخر آئینہ اپنے کچھ کی مرثیہ لے۔ تقدیر نے جو سامان کر رکھا تھا وہ پورا ہوا۔ راون مار گیا۔ اس کی لاش میدان رزم میں گر گئی۔ اب اس کے بعد کیا ہوا۔ یہ سن بھی دراصل جادو کا اثر کہتا ہے۔ دیکھو اور انھیں کر دو کہ سفکرت کے زندہ جاوید شاعر نامور والمی نے یہاں پر اپنی جادو طرازی کے کیسے جوہر دکھائے ہیں۔ وہ کہتا ہے :-

یوں نے جیسے ہی دیکھا کہ آج کا سردار مارا گیا انھوں پیٹھ پیر دی۔ میدان کو چھوڑ چھوڑ کر اسے اور مصفین توڑ توڑ کے ہانگے۔ کوئی کسی پہاڑ کی طرف چلا۔ کسی نے جھلجھکی راہ لی۔ کوئی کشتی میں جا کے رہا۔ ہاتھ بٹخ بدحواسی کے متلاطم سمندر میں پھاند پڑے۔ بھڑوں کو غمزدہ اور تم رسیدہ جو بچو کیا خیال یاوان آب بڑا وہ برقم آگیا۔ بوزہوں کی آہوں پر چوکی آہ و زاری کی آوازوں نے کچھ بیکسر استقبال کیا انکے پیچھے پیچھے فاتح فوج کے زبرست اور خونخوار جواغرد شہر لکھنؤ پہنچے تھے۔ گلی گلی دھونڈتا پھر رہے تھے۔ اور وہاں کے تمام عجائبات کو حیرت سے دیکھتے جاہل تھے۔ آٹھ پہاڑ، سوئے اور جواہرات سے جگمگا رہے تھے۔ آٹھ عجیب یواریں ہو اس دیو زاد اور راکشس کے فلک اوگیر۔ ہوسے یقین۔ گنبد اور مینار جواہر چمک رہے تھے۔ بس بالکل اُن خوشنابادوں کی طرح جو آفتاب کی آرون سے چمک اٹھتی ہیں۔ اور جو موسم خزان میں اکثر آسمان پر لکھائی جاتی ہیں۔ وکیش ایک بھائی کی طرح اپنے سردار اور ناجدار کی لاش پر کھڑا رہا تھا اور روکے پر حسرت الفاظیں کہتا تھا۔ "اے سوار۔ بیر۔ بہادر۔ اور جری۔ ہر قسم کے ہلو سے کام لینے میں ہوشیار۔ میں بہادر اور آزمودہ کار۔ سر کا تاج کیا ہوا؟ اور خون کے بستے پر بے بسی سے ہاتھ پاؤں پھیلائے کیوں پڑے ہو؟ ریشمی سہریان اُم کے واسطے موجود ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے ٹنڈی زمین پر کیوں سو رہے ہو؟ اے ہنسوس! میرے مد سے زیادہ ہمارے بھائی! آخر تھیں ہی پیش آیا جسکی نسبت میرا دل پہلے سے گواہی دیتا تھا۔ مگر عشق۔ محبت اور غور نے تھیں اُس ہمدرد دوست کی باتیں سننے سے باز کر رکھا جو نصین تمھاری مجنونہ حرکتوں پر طاعت کرتا تھا۔ اے ہمارا سورج جو بڑی آبا و تاب سے چمکتا تھا غروب ہو گیا! ہمارا چندرما

رات کی چادر میں چھپ گیا۔ ہمارا اکاس دیا بجھ کے ٹھنڈا ہو گیا۔ اور سیکڑوں مجسین  
اُس پر سے ہو کے اور اُس کو تہیڑے دسے کے گز لگین۔ بے شکہ راجہ رام چندرجی کے  
تیروں کے سینہ کے آگے اُسکی روشنی اور آگ کیا کام آتی؟ جف ہے دیو دن کے اُس شاہی تخت  
پر جس کی شاندار بندی دیکھنے میں ایسی خوشنما تھی اِسا ہمارا عات تو اُس کی کایاں تھیں۔ وہ  
لڑکے جن سے اُس کی قوم کی روئی تھی وہ اُس کے خوشنما ہواں تھے۔ اُس کی نفس کشی اُسکی  
خوشگوار بیل تھی۔ اور خود اُس کی مزیز روح گویا جڑ تھی۔ اے۔ اب بچے کچھ بھولوان۔ کھلی  
ہوئی ٹہنیوں کے ساتھ خود وہ شاہی درخت ہی اب سرنگون پڑا ہے۔

یہ سنکے رام چندرجی پکارے ”نہن۔ نہن۔ یہ سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بہادر ہے  
اُسی طرح مراجس طارح ہا درون کو مڑنا چاہیے۔ اور یہ بڑا معلوم ہوتا ہے کہ ایسی موت مرنے  
والوں کو ہمارے سے آدمی نہ ہین۔ صبر۔ کام لو۔ دل کہ منہ ہا لو۔ اس بیکار غم کو ضبط۔ نہ  
روکو۔ اور جو غرائض باقی ہیں اُن کو ادا کرو۔“

یہ بہادرانہ تمدنی کا جواب پاکے تم زدہ و کھیشن ہوا۔ بے شکہ اُس کے چہرے پر ایسے اثرات  
موجود تھے جو تادم اور اندر کی قوت توڑی۔ آج سے پہلے اِن میں اُس رکھی تھی جو غلط فہم  
انہیں پہنچا ہوا۔ آپ کے مقابلہ کو جی وہ بہادری سے بڑا۔ حتی الامکان فتح کی کوشش کرتے تھے۔  
مارا گیا۔ بس اُسی طرح جیسے عن در جبکہ اُس کا پانی نہ کر کے بلندی پر چڑھتا۔ ہے اور زبان مار  
کہا کے قوت مٹ جاتی ہے اور اپنی قوت میں آپ ہی زور سے اُلٹا آ رہتا ہے۔ ہمارے مزاج  
کے بے وقت ماتمہ پراسس ہے۔ جو فیاض آقا۔ اور وفادار دوست تھا۔ عیش و عشرت کے  
بام پہنچتا تھا۔ اور اپنے دوستوں پر دولت کا مینہ برساتا تھا۔ خوف و دہشت کے موقع پر ہماری  
حفاظت کرتا تھا۔ سرکش دشمنوں کے حق میں مجسم ایک سمیت رہتا تھا۔ چاروں دید کا مقدس  
عالم تھا۔ آگ کو نہایت تعظیم و تکریم سے علا تھا۔ ہاتھ کا تری۔ اور دل کا مضبوط تھا۔ سخت  
سخت نفس کشیوں میں اُسکو کامیابی مانا۔ جو چلی تھی۔ آ۔ وہ دشمن جو آپ کے ہاتھ سے مارا گیا  
اُسے جوان مردوں اور ناموروں کی عظمت اور عزت پالنے دیجیے۔

رام چندرجی نے جواب دیا ”دشمن جب زمین پر پڑا ہوتا ہے۔ اور خون میں غلطان نہ پہچان ہوتا  
پھر اُس وقت اُس کی طرف سے نفرت نہیں رہتی۔ فتح۔ کامیابی۔ ہمیں صلح کی زنجیروں میں  
باندھتی ہے اور اُس کا اتفاقا ہے کہ اب ہم لڑائی کو ختم کریں۔ اب مناسب طریقہ سے کرایہ کی

سوم دن میں لاؤ۔ مہذاری تخت میں خود میں ہی شریاب ہو گیا۔

سارا جملہ اٹے ہو گیا۔ راوان ہا گیا۔ اور ہمارا رام چند جی و میا بابا ہوئے۔ لیکن اچی یہ باقی سے کہ سینا جی تین کے لیے یہ سب کچھ اچھا اُن کا کیا انجام ہوا۔ وہ اُس لیے سے کیونکر ہو گیا۔ اور ہمارا رام چند جی ایشہ پیار سے شوہر سے کس طرح ملین۔ رام چند اُن سے کس طرح ملے۔ اور وہ کس شوق سے اُن کے پاس آئین ان باتوں کے دیکھنے کے لیے ہی ہم سب ایک دوسرے کی قریب سے الفاظ عاریت لیتے ہیں۔

یہاں جی۔ آہ۔ اس طرح سے کہ ہر میا بابا۔ جی فوشٹا ٹیکس شرم۔ آئین میں تر۔ بے نقاب اور بے نگہ۔ فتح مند مردوں کے پریم میں آئین۔ اور سامنے کتے سے ہو کے اُتی رہنے چھوٹے ہوئے شوہر سے چار۔ ٹکٹیں کیں۔ اور ملین رام چند جی ان بقیہ اُنکھوں سے جو ناچا ہتی تھیں اور رام چند جی اُتی تھیں۔ کیا۔ ٹکٹیں کیں۔ اور رام بابا سے سالم۔ اپنے مستقل اور فوٹو کے اب سے مضبوطی سے کام لیا۔ دونوں جانب کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ ملا۔ اس سے کہ دونوں تکیہ کئے۔ سے۔ لون میں دو ستم۔ خیالات۔ دونوں سب سے قہ۔ روکھ۔ اور غ۔ و خور۔ اری۔ اُس سے جس کو زبان سے کالنے۔ نہ۔ ایک خط بھی نہ۔ نا خواہیے رانہ سے سامنے۔ اور۔ وہ میں لنگھارون کے انداز سے لہری ہوئی تھی۔ اور ہمارا شوہر جی رام چند سے اپنے اُری رانی کے استقبال میں کوئی لفظ نہیں نکلا جس سے اچی۔ ہائی ہائی۔ اور تھیں بابا وہ ہوتا۔ اور ہمارا جی پر کئی ثبات۔ سایہ ہی۔ پر۔ تا۔ جت۔ یو زاد کے ناالم اُتہ اُس سے لہر سے کھڑے تھے۔ اور غرزدہ۔ انوم۔ تھیں نہ تھے۔ اُس نے حرف رام چند کی خار سے۔ اور۔ اُسے محبت کے جوش میں اتنی ایک تخت آفتین۔ کڑی صیبتین سر پر لین مگر بیان ندی اور غرض اُن کے درشن سے۔ یہ۔ رنہ۔ رہی۔ گویا مرے جی ہے اور خد اسکے گھر سے پہری ہے۔

میںابی نے ایک مرتبہ بس ایک ہی مرتبہ اپنی آگہین اُٹا میں۔ یکا۔ ایک جھج مار کے اپنی جان سے بیا سے شوہر کو پکارا نہیں۔ یہ ایک ایسا نازک وقت تھا کہ سنگد لون کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ اور پاک باز رانی کا۔ حسرت و اندوہ کا عالم دیکھ کے بڑے بڑے سونا بن کے بھی دل پگھل گئے۔ خود دشمن جی ابھرے بڑے ہوئے جوش کو بڑی مشکل سے دبا سکے۔ اور وہی تک اپنا حسرت۔ آلود منہ گریبان میں چھپائے رہے۔ آخر کار سیتا جی نے اپنی بے فروت

اور بے وجہ شرم دور کی۔ اس لیے کہ پاکہ امنی۔ عفت اُن کی قوت بازو اور مددگار تھی۔ پہلی اور راستہ بازی پر بہرہ ور کر کے جس نے اُن کو ہر ملاست کرنے والی کی زبان سے بے ہوش کر دیا تھا انہوں نے اپنی آہن روکین۔ اپنی پرہیز اور آبدیدہ آنکھوں کو خشک کیا۔ آنسو پونچھ ڈالے۔ اور حفت و تعجب کے جوش میں بیچ و تاب کھا گئے اپنے شوہر کی طرف تیز چلتے اور اُن آنکھوں سے دیکھ جو جکنا جانتی ہی نہ تھیں۔ جب یہ حال دیکھا تو راجہ چند جی کو "سیتا۔ جس قدر مجھ پر فرض تھا وہ پورا ہو گیا۔ دشمن پامال ہوا۔ اور تم بطور مال غنیمت کے میرے ہاتھ لگیں۔ میرے مضبوط اور قوی بازوؤں نے فتح حاصل کی۔ میں نے ظالم کو تیرے کو مار ڈالا۔ اُس کی گستاخی اور دغا بازی کا بدلہ لیا۔ جو قسم میں نے کھائی تھی اور جو امر میں نے اپنے اوپر فرض کر لیا تھا اُن کو پورا کیا۔ آزاد ہوں اور اپنا آپ بخت اپنی عزت اور اپنے فرض منصبی کا اب اس سے زیادہ اور کچھ تقاضا نہیں ہے۔ یہ عجیب غریب پہل جو سلاطین اور زور و شور سے چننے والے سمندر پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ دیوؤں کا سارا شہ جو بالکل دشمنوں کے خون میں رنگا ہوا ہے۔ یہ بے شمار فوج جو ہمارے رست اور سمندر و سر دار مدین لائے۔ وہ عقل مند جو مشورہ دیتے تھے۔ اور وہ ہمارے خون بہاتے تھے۔ اور کیسے ہمارے لیے لڑتے تھے کہ لڑائی کے چمکو انہیں درن کے میدان میں جبر جبری تک کا نام نہیں لیتے تھے۔ اس عظیم انسان محنت کا نتیجہ آج ظاہر ہو گیا۔ لیکن سنو۔ بی بی۔ اتنا سن۔ کہو۔ یہ تمہارا عشق نہ تھا جس نے سمندر پار تک میری نوجوانی برباد کی۔ یہ خون کی ندیاں اور نالے تمہارا۔ یہ نہیں بہائے گئے۔ اور نہ یہ سمجھا کہ انکا کی گلی کو چون میں یہ دیوؤں کی لاشیں گرا گئے کشتوں کے پشے تمہارے سبب سے بازوؤں کے لئے۔ یہ تمہارے عشق کے جذبات نہ تھے جو مجھے لڑائی لے دن رن سے تھکایا۔ ان میں سے ایک کی ترقیب دیتے تھے۔ وہ امر جو موجب ملال ہوا اُس کا معاوضہ کرنے اور عزت پر جو تہہ بہ تہہ اُس کے مٹانے اور اصول شرافت کی جو توہین ہو گئی تھی اُس کے دھکے لگائے گئے۔ سیتا تیرے نام پر داغ آگیا۔ اور شرمناک شک اور بدگمانی تیری طرف سے میرے دل میں ہے۔ جو تیری محبت کو دل سے نکال کے پھینک بیٹی ہے۔ اب تیرے حسن و جمال کا جادو میرے دل پر فوراً ہی نہیں اثر کرتا۔ آہ۔ چس گویا ایک ایسی مشعل کی روشنی ہے جو زخم خوردہ نظر کو ادیت دیتی ہے۔ بس اب جاؤ۔ اور بہانہ کامن میں آئے ابادہ کیو۔ خود میں اپنی زبان سے نہیں

آوارہ پیرسنے ہر جگہ کی ہو کہانے اور سیر کر کے کی اجازت دیتا ہوں۔ اب میرا نواسا تمہاری سی  
نام جو رتوں کے لیے نہیں ہے۔

اب سن کے سیتاجی زیم اور ناتوان آواز سے ٹکراس کے ساتھ غیر قابل ٹھہار صدہ سے بچ و تاب  
کے بکے بولین اور ابو۔ تمہارا سن یہ گوارا کرتا ہے کہ ایک عالی خاندان استری کو ایسے شہساز جملہ  
کئے جدا کرو! اور یوں ایک راج گنوار ہی کو چوڑے جلا وطن کر دو جس طرح کوئی کسی گائے  
والی ہر جائی رنڈی کو جہا کرتا ہے؟ میں اپنی زندگی کے تمام اچھے گنوں کی قسم کھا کے کہتے ہوں  
کہ میں وہ نہیں جو تمہارے نام بھی! نہ بخت ازیشی کے کلیات ظاہر کرتے ہیں۔ اولیٰ کی فاداری  
اور راست بازی پر شک کرو۔ مگر ان سب شکوں کو اس سے الگ ہی رکھو جسکے ستوں سارے  
نہ کی محبت اور عشق میں آزمایا ہے۔ میرے کمزور بدن کے گرد وہاں دیوئے اپنا ناپاک ہاتھ  
سے شک ڈال دیتا تھا۔ مگر مارا قصور اس کا اور میری قسمت کا ہے۔ اس کو میں کیا کر سکتی تھی  
یکہ دیکھاری عورت۔ اور تن تنہا۔ میرا دل میرا تھا۔ اور اب تک وہ تھا۔ اتنا۔ عزت کے  
درہما سے خلاق میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ یہ اس سرور و سیاہی پاک و صاف ہے جیسی خاص  
اور صاف میری جان اور روح ہے۔ اور جو ایسا نہ تو میرے نام اور میری نیکنامی کو  
نہا دین۔ اور میری روح کو کبھی چین نہ لینے دین۔ پیارے لکشمی اٹھو۔ جلدی جاؤ۔  
اور بتاتیا کرو۔ ایسا ناپاک بوجہ اٹھانے کے لیے میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ آزادی دھمکنا  
حاصل کرنے اور اپنی زندگی کو بے عزتی کے دامنوں سے پاک کرنے کے لیے مجھے اور کوئی  
عورت نہیں نظر آتی۔

وہ سین بھرام چندر جی اور سیتاجی کے ملنے کا تھا وہ بھی تمام ہو گیا۔ لیکن ناظرین کا دل اب تک  
لگا ہوا ہے۔ وہ بچپنی سے منظر ہیں کہ سیتاجی کو راستناری کے امتحان میں کامیاب ہوتے  
اور ام چندر جی کو اجداد کے پاٹ پر بیٹھے بہت جلد دیکھ لیں۔ لہذا ان کے مختلف واقعات  
سن سے منتخب کر کے اتنا ہم اور بیان کیے دیتے ہیں:-

سیتاجی نے شریفانہ استقلال سے امتحان دیا۔ اور اپنا نازک بدن آگ کے سپرد کر دیا۔  
نوراجی جیسے ہی سیتاجی آگ میں کودیں ویسے ہی ہوا کے دیوتا نمودار ہوئے۔ اور ایشور  
کی دبا سے ان کی عزت سچی اور ان کا دامن پاک اور بے لوث ثابت ہوا۔ راست بازی  
کا ثبوت پاتے ہی رام چندر جی دوڑے اور اپنی وفاداری بی کو گلے لگا لیا۔ کون بی بی جو

یہ داغ۔ پاک و صاف۔ اور مدت و الزام سے محفوظ ثابت ہوئی تھی۔۔۔ رام چند راجہ نے  
 آگ لے کر دیوتا اور اُس دیوتا کے مقدس باپ کی فرمان برداری کی۔۔۔ پیسے، نوٹ، اور  
 اس مالک آسمان کے اطاعت گزین ہیں۔ دیوتا اور بڑے بڑے رشی اور سنی قریب سے۔  
 اور ان کے اچھے کام پر خوش ہو گئے، انعام، انعام سے سرفراز کیا۔ ان کا مقصد پورے  
 آریہ۔۔۔ یعنی دشمن رد ہوا۔ فتح مندی کا ٹیٹا ان کے ماتھے پر چمکا۔ اور دیوتا راضی ہوئے۔  
 ایشو کی دیاست انہوں نے ان سب سرداروں اور جہادروں کو بولوائی میں کام آئے تھے  
 زندہ کر کے لے کر دیا۔ جب ان سب کاموں سے فراغت ہو چکی تو رام چند راجہ کی کاٹھن اور  
 قدرتی رتہ بدلوں میں جو کتنی ہی گرام کی طرف اُڑا۔ وہاں پہونچ کے وہ بنے وفادار جان  
 بایوں سے۔ اور اپنے مال کی لٹوں کو کھول دیا۔ وہاں سے چل کے ابو دیا جی میں پہونچے  
 اور اپنے پر بزرگوار مہاراجہ دوسرے کے پاٹ پر بڑی کامیابی اور صلہ کستری کے ماتم  
 بیہ کے۔ اچ کر سنے گئے۔ نہ بیماری تھی اور نہ قحط تھا۔ رعایا شاد۔ دشمن ہر بارہ خوشیوں  
 کے ماتم دولت کو روز افزون ترقی تھی۔ امن اور تندرستی کا ہمیشہ سایہ۔ نہ کبھی  
 گوشوہ کی لاش پر روتے، کہا۔ اور نہ کوئی بوڑھا باپ فرزند کی بوقت موت پر آنسو  
 بہاتا نظر آیا۔ نہ صوفان کا خون تھا اور نہ آلودن کا کھٹک۔ آگ نے بھی لگے کو بھلایا  
 اور نہ سیلاب نے کبھی سلطنت کو ضرر پہونچایا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مہاراجہ  
 رام چند راجہ کی سلطنت کو مبارک ثابت کرنے کو دنیا میں۔۔۔ تہجک پر پلٹ آیا ہے  
 صاحبزادہ بین کامک اصول سے اپنی تاریخی مبارک اور مقدس داستان کو تمام کرتا ہوں۔  
 اور عزیز ناظرین کو خوش اور شاد کام دیکھ کے رخصت ہوتا ہوں۔ والسلام  
 راقم محمد عبد السنا۔

از لکھنؤ۔ فرنگی محل۔

صاحبو۔ دُلگہ از کا یہ دوسرا پرچہ ہے۔ اور قبل اسکے کہ یہ پرچہ آپ پورا دیکھ سکیں تب  
 پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ موجودہ سال کی قیمت بیسے میں سرگرمی سے کام لیجیے۔  
 کہ سلسلہ ارع کی قیمت ابھی بہت باقی ہے۔ اور جن حضرات نے سنین اضیہ کی قیمت نہیں ادا  
 کی ان کی سردمہری پر تو افسوس کرتے کرتے ہم تک گئے۔

محمد عبد الحلیم شہزاد

## دہلی اور اُس کا اگلا دربار

بادشاہ کا دروازہ (جسے ہندوستان کے پچھلے عہد میں دربارِ دولت اور قسطنطنیہ میں بابِ عالی کہتے ہیں) دارِ سرِ اکھلاتا ہے۔ سراسر دُہ شاہی کے بت سے دروازے ہیں۔ پہلے دروازے پر بہت سے لوگ مامور ہیں۔ جو ہر وقت پہرہ دیا کرتے ہیں۔ اور انہیں میں باجا بنانے والے شنائی اور طبل و قزنج بجانے والے بھی موجود رہتے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جان کوئی مٹا امیر اور صاحبِ رتبہ اور ذمی اختیار نہیں آیا بس سب کے سب باجا بناتے تھے اور فوراً مبارک باد و دعاے دولت کے شادیاں بچھنے لگتے ہیں۔ اور باجون ہی کی اُس میں اُس رئیس کا خیر مقدم ادا کیا جاتا ہے۔ اور باجون سے صاف آواز آتی ہے کہ ”فلان رئیس آیا فلان رئیس آیا“ دوسرے اور تیسرے دروازوں پر بھی سامان رہتا ہے۔ اور وہاں بھی اسی طرح نعمت و سرور میں رؤسا کا خیر مقدم ادا کیا جاتا ہے۔ بابِ اول کے متصل کچہر دکانیں سی بنی ہوئی ہیں جن میں ہر وقت جلا و اور مجرم کی جان لینے والے فرشتے موت بیٹھے رہتے ہیں۔ اور جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں حادثہ ہے کہ جب وہاں جائے اُن لوگوں کو کسی نہ کسی کے قتل میں مصروف پائے گا۔ بس بادشاہ کے حکم کی دیو ہے۔ اور ہر کسی کے بارے میں سزاے موت کا حکم ہوا۔ اور وہ قتل کے لیے آمادہ ہوئے۔ پھر میں دروازہ شاہی ہی پر قتل کیے جاتے ہیں۔ پہلے دروازے سے دوسرے دروازے تک ایک جگہ بڑی دہلیز بنی ہوئی ہے جس میں کوٹھریاں بنی چلی گئی ہیں۔ اُن کو ٹھریو میں لگا ہیاں اور میٹھیں یعنی گار کے سپاہی باری باری موجود رہتے ہیں۔ اور بڑی ہوشیاری سے پہرہ دیا کرتے ہیں۔ دوسرے پہانک کے اندر بھی یہی گار دو الے ہوتے ہیں۔ پھر اُس کے بعد سے تیسرے دروازے تک جو کوٹھریاں ہیں اُن میں سب نقیبوں کا سردار جو عرض بھی کی خدمت سے سرفراز ہے بڑے تزک اور ثبات سے موجود رہا کرتا ہے۔ اُس کے آگے ایک سونے کا عصارہ رکھا رہتا ہے۔ اور اکثر یہ عصا اُس کے ہاتھ میں نظر آتا



رکنا ہے۔ اُس کے سر پر سونے کی مرصع نہایت عمدہ توپی ہوتی ہے جس پر گلشنی جی فردوس لب  
 رہتی ہے۔ اُس کے دونوں طرف بہت سے نقیب رست بستہ ادب سے کمرے ہوتے ہیں۔  
 ان سب کی بیلیاں جی ویسی ہی طلاکار اور بہاری ہوتی ہیں۔ سب کی مکہ دن پر شکے بند ہے  
 مٹے ہوتے۔ اور ہاتھوں میں کورسے ہیں جن کی موٹیں مٹے پانچاندی کی ہیں۔ اور اس  
 دروازے کے اندر سے نکل کے آیا بہت بڑے ہال میں پہنچتا ہے جس میں کثرت  
 آدمی بیٹھے ہوتے ہیں۔ قیسرے دروازے پر نام لکھ لینے والے رہا کرتے ہیں۔ اور ان  
 لوگوں کا فرض ہے کہ سوا ان لوگوں کے جنکو خاص حکم شاہی اجازت ہو اور کسی کو اندر  
 نہ جانے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس تمام اُن روسا کے نام لکھے ہوتے ہیں جن کو اندر جانے  
 کی اجازت ہے۔ بلکہ اسکے ساتھ یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ ہر شخص کے آدمیوں اور ہمراہیوں کے  
 لیے کاجازت ہے۔ لہذا اُس شمار سے زیادہ ہمراہیوں کو وہ نہیں لیجاسکتے دیتے ہیں۔  
 وہ جیب کوئی شخص اس دروازے سے گذرنا نہ ہو تو لوگ لکھ لیتے ہیں کہ فرداں شخص فلان  
 وقت حضور ہی میں گیا۔ اور بعد نماز عشا کے خود سلطان روزانہ فرست کو اپنی آنکھ سے  
 ملاحظہ کر لیا کرتا ہے۔ علاوہ آمد و رفت کے اور جو واقعات در دولت پر رون ہر پیش آتے  
 ہیں اُن کو یہاں کے محرر رابطہ پور پورٹ کے لکھتے جاتے ہیں۔ اُن پورٹوں کا پیش کرنا جن  
 شاہزادوں کے سپرد ہے وہی شاہزادے پورٹوں کو بخروں سے لے کے ملاحظہ شاہی میں  
 لے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ خدمت باری باری شاہزادوں کے سپرد ہے۔  
 در دولت کا ایک یہ بھی دستور ہے کہ جو شخص بابادشاہی میں تعین دن یا اس سے  
 زیادہ غیر حاضر ہے وہ پر بغیر اجازت شاہی کے اندر نہیں آئے پاتا۔ اور جب وہ پھر  
 حاضری کا ارادہ کرے تو اُس کا فرض ہے کہ ایما عذر بارگاہ شاہی میں پیش کرے کہ  
 فلان ضرورت یا اس مرض کی وجہ سے وہ غیر حاضر رہا۔ اور یہ بھی دستور ہے کہ جب  
 وہ عذر پیش کرے تو بوجہ قبولیت عذر کے بادشاہ کی طرف سے اُس کو حسب رواج و  
 حیثیت کوئی کوئی تحفہ بھی مرحمت ہو۔ اور یہی دستور مسافروں اور بادشاہ کے دربار  
 میں باہر سے آنے والوں کے ساتھ بھی معین ہے۔ یہ ہدایا و تحفہ جی ہر حیثیت کے مناسب  
 نامزد کر دیے گئے۔ مثلاً فقہا کو قرآن مجید نذر دیا جاتا ہے۔ فقر کو جائز تسبیح اور مسواک  
 وغیرہ دی جاتی ہے۔ روسا اور اُمرا کو گھوڑے اونٹ اور اسلحہ دیے جاتے ہیں۔

تیسرے ہانک سے نکل کے انسان اُس بڑے مالیشان محل میں پہنچتا ہے جسے ہزار تین لکھتے ہیں۔ اُس کے ستون لکڑی کے ہیں جن پر روغن پرا ہوا ہے۔ اور چٹ بھی لکڑی کی ہے تا اُس پر ایسی عجیب و غریب صنایعی سے بیل بوئے اور نقش و نگار بنائے گئے ہیں کہ انسان کو یہ تاہو جاتی ہے۔ اس محل میں لوگ آکے ادب سے بیٹھتے ہیں۔ اس میں خود سلطان بھی جلو افروز ہوتا ہے۔ یہ محل دیوان عام بھی کہلاتا ہے۔ اس دیوان عام میں سلطان اکثر اجداد کے بیٹھتا ہے۔ خاص سلطان کی نشست کے لیے رہاں بہ انتظام رہتا ہے کہ ایک سطح چو تر سے پر سائیت نفیس اور براق فرش اور فرش بہ ایک چوبخت جتا ہے۔ تخت کی پشت کے جانب کاو تک لگا ہوا ہے۔ اور داہنے بائیں دونوں پہلوں پر جن ایک ایک تکیہ رہتا ہے۔ اور بیٹھنے کے لیے وضع ہوتی ہے جس طرح انسان گل زمین تسہل پرانے کے لیے بیٹھتا ہے۔ اور یہی وضع تخت نشینی میں کل شاہان میں کی ہے۔ اور جب بادشاہ بیٹھتا ہے تو اُس کے آگے وزیر اعظم دست بستہ کھڑا ہوتا ہے۔ اور اُس کے پیچھے اہل سدر دار اکین دفتر شاہی صفت باندے کھڑے رہتے ہیں۔ اہل قلم کے پیچھے حاجین در شاہی ٹہرتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو ہر آئے والے کو سوچ سمجھ کے لاتے ہیں اور اُس کی حیثیت کے مناسب اُس کی جگہ پر لاکے آتے کھڑا کر دیتے ہیں۔ ان حاجیوں کا سردار اعظم ہمیشہ دربار میں ایک معزز اور محمد علیہ شاہی رہتا ہے۔ سلطان محمد تعلق کے عہد میں یہ خدمت خاص سلطان کے پیچھے فیروز ملک کے سپرد ہے۔ یہ اپنے تمام موقت حاجیوں کے آگے اور خاص سلطان کے قریب رہتا ہے۔ اُس کے بعد اُس کا ماتحت حاجب رہتا ہے جسے حاجب خاص کہتے ہیں۔ پھر نائب حاجب خاص جو داروغہ محل بھی مقرر کیا جاتا ہے۔ اور اس حاجب اور نقیبوں کے گروہ میں تقریباً سو آدمی ہیں جو ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ جس وقت سلطان بیٹھتا ہے سب کے سب ایک ساتھ شور کر کے کہتے ہیں ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ اور ملک التلبیر یعنی حاجیوں اور نقیبوں کا سردار مورچل ہاتھ میں لیے رہتا ہے۔ اور برابر ہلا کرتا ہے۔ ان مذکورہ لوگوں کے بعد سوسلہ جو ان صفت باندے تخت کے داہنے جانب کھڑے رہتے ہیں اور سوبائیں جانب۔ اُن کے ہاتھوں میں کوڑے تلواریں اور تیرکمان ہوتے ہیں۔ میمنہ اور میسرہ پر دیوان عام کے طول کے رخ پر قاضی القضاات کھڑا ہوتا ہے اور اُس کے قریب ہی خطیب الخطبا یعنی سب خطیبوں کا سردار رہتا ہے۔ یہ تمام

قاضی - پھر بڑے بڑے فقہاء اور اُن کے بعد بڑے بڑے عمائد شہر اور شائع اور بادشاہ کے اعزاء و اتربا اور داماد کھڑے رہا کرتے ہیں۔ پھر اُن لوگوں کی صف ہوتی ہے جو کبار اعزاء کہلاتے ہیں۔ کبار اعزاء سے مراد غبار و مساکین ہیں۔ پھر اہل فوج ہوتے ہیں۔ ان سب لوگوں کے پیچھے دونوں طرف تیش تیش کوئل گھوڑے نہایت اعلیٰ درجہ کے ساز و سازن سے آراستہ لاکے کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ جن میں سے بعض گھوڑے تو ایسے ہیں کہ غلام اسلامیہ عباسیہ کی یادگار ہیں۔ یعنی اُن پر سیاہ اطلس کا چار جامہ وغیرہ ہوتا ہے اور اس پر طلائی کام بنا ہوتا ہے۔ اور بعض کا سامان سفید طلا کار اطلس کا ہوتا ہے۔ یہ گھوڑے خاص سلطان کی سواری کے لیے مخصوص ہیں۔ اور اُن پر سوا خود بدولت کے اور کسی کی خیال نہیں کہ کبھی سوار ہو سکے۔ دربار میں یہ گھوڑے ٹرائے بھی ایسے مقام پر جاتے ہیں کہ سلطان کی نظر وہاں تک پہنچ سکتی ہو۔ اور ہر نقطہ شاہنشاہ ہند کی نگاہ کے سامنے رہیں۔ ان گھوڑوں کے پیچھے چاس ہاتھی کھڑے کیے جاتے ہیں۔ جن پر ریشمی طلا کار جلیون پڑی ہوتی ہیں۔ اور جن کے دانتوں پر فوادسی انیان چڑھی ہوتی ہیں۔ تاہم جرمون کو یہ بھی بہ سہولت قتل کر سکیں۔ ہر ہاتھی کی گردن پر فیدبان چ بانک ہاتھ میں لیے سوار رہتا ہے۔ اور اُن کی پیٹھ پر بہت بڑی بڑی عمارتیں ہوتی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ اس پر بیس مسیح سپاہی باسانی بیٹھ سکیں۔ ہاتھی کے قدم قدامت سے سناٹ سے اس شام میں کبھی کمی و زیادتی بھی ہو جاتی ہے۔ عمارت کے چاروں کونوں پر چا علم بھی نصب ہوتے ہیں۔ یہ ہاتھی بڑی ہوشیاری اور محنت سے سدھائے گئے ہیں۔ چنانچہ جب چاہا جاتا ہے بادشاہ کے آگے جھک کے آستان بوسی کرتے ہیں۔ اور بڑے ادب سے سر جھکاتے ہیں۔ ان میں سے بھی تین ہاتھی تخت کے داہنے جانب اور تین بائیں جانب ٹرائے جاتے ہیں۔ اُن ہاتھیوں میں سے جہاں کسی ہاتھی نے بڑھ کے سلطان کے آگے سر نیا ز جھکایا حجاب اور نقیبوں کے گروہ سے صدّا "بسم اللہ الرحمن الرحیم" بلند ہوتی ہے۔

آداب شاہی میں یہ بھی داخل ہے کہ جتنے عمدہ درباریان آگے نہ آنے کے مجاز ہیں جب وہ دربار میں آئیں تو پہلے اُن کا فرض ہے کہ ایک مقام خاص پر جو تسلیم گاہ ہے جا کے بادشاہ کو سلام کر لیں تو پھر اپنے مقام پر جا کے ٹہریں۔ اُن لوگوں کے سلام کرنے کے

وقت ہی تبسم اللہ کا نعرہ صاف حجاب سے بلند ہوتا ہے۔ لیکن ہندوؤں میں سے کوی  
رجہ یا عہدہ دار شاہی سلام کرتا ہے تو اس وقت نقیب آواز بلند اس کی طرف خطاب  
کونکے گھتے میں "ہاک اللہ" اور سلطان کے غلام سب لوگوں کے پیچھے کہہ سے جاتے  
ہیں۔ جن کی وضع سپاہیوں کی ہوتی ہے۔ اور ہر ایک کے ہاتھ میں ڈال تیر ہتی  
ہے۔ اس ترتیب کا یہ نتیجہ ہے کہ جو کوی بادشاہ تک پہنچنا چاہے تو پہلے ان میں ہونا  
گزرے گا۔ پھر حاجیوں میں ہسکے۔

جب کوئی باہر کا عامل دربار شاہی میں دیر اور سختی لاکے حاضر ہونا چاہتا ہے تو صاحب  
بدنہ مت عرض بگلی کو سراخا روپتہ میں اپنی اس مذکورہ ترتیب سے یعنی سب آئے  
پھر صاحب۔ اس کے پیچھے اس کا نائب۔ پھر خاص صاحب۔ پھر اس کا نائب۔ پھر  
محل۔ پھر اس کا نائب۔ عرض اس کردہ کے تمام لوگ آگے پیچھے اپنی ترتیب کا سحر  
رکھتے ہوئے تخت شاہی کی طرف بڑھتے ہیں اور تین مقاموں پر کھڑے ہوتے اذاب  
اشاہی بجا لاکے عرض کرتے ہیں کہ فلان شخص در دولت پر حاضر ہے اور آستان جوسی  
ابی آرزو کرتا ہے۔ اگر بادشاہ نے اجازت دی تو اسکو اس طور پر دربار میں لاسے ہیں  
اگر وہ جو شخص یا دیر لایا ہے اس کو لیے ہوئے لوگ آگے آگے چلتے ہیں تاکہ سلطان کی اس نظر  
پڑے۔ یہ شخص قبل اس کے کہ سلطان کے قریب پہنچے رو رہی سے تین یا آداب شاہی  
بجالاتا ہے۔ اس کے بعد حاجیوں کے ٹہرنے کے مقام پر پہنچتا ہے۔ اگر کوئی بہت بڑا  
ایرادہ عرض شخص ہو تو ادیر صاحب کے برابر کھڑا ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کے  
پیچھے ہی ٹہر جاتا ہے۔ جب وہ اپنی جگہ پر ٹہر گیا تو سلطان بذات خود اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے  
اور نہایت ہی خلوص و محبت اور توجہ کے الفاظ میں باتیں کرتا ہے۔ اس کے آنے پر جسا  
لہتا ہے اور اگر اس کی عزت کے لحاظ سے مناسب معلوم ہو تو پاس بلا کے مصافحہ کرتا ہے  
اور کہی کہی معافقہ بھی کرتا ہے۔ اور اس کے دیون کو منگو کے اپنے سامنے رکھتا ہے۔  
اگر اسلحہ کیر وں کے شمر سے کوئی چیز ہوئی تو ہاتھ میں اٹھا کے انٹ پٹ کے بھی دیتا  
ہے۔ اور خواہ مخواہ شفقون کی تعریف کرتا ہے۔ وہ اس لیے کہ جس نے پیش کیا ہے  
اس کا دل خوش ہو جائے۔ اس کے بعد اس کو خلعت و حرمت ہوتا ہے۔ اور اسکی  
حیثیت کے مناسب ایک رقم "مردہ ہونے" کے نام سے اس کو نقد عطا ہوتی ہے۔

یہ ہندوستان کا دستور ہے کہ بادشاہ شرف حضور سی حاصل کرنے والوں کو جو رقم مرحمت فرماتا ہے وہ غسلِ شرف کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

یہ تو ان ہدیوں کا ذکر تھا جو باہر کے آئنے والوں یا ابتداً شرف حضور سی حاصل کرنے والوں کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن وہ تحائف اور ہدایا جو عائد شاہی باغیچہ اعمال و ریختہ داروں یا زینداروں کی طرف سے پیش ہوتے ہیں ان کا اور دستور ہے۔ اہل احوال کا قاعدہ ہے کہ بہت دنوں تک مال و اسباب نذر شاہی کے لیے ذاب کرتے رہتے ہیں۔ ہاتھی، گدھے، سوئے چاندی کے برتن، اور نیزے سوئے چاندی کی سلاخیں، سیٹھ کی نو چھین، جب حضور سی میں پیش ہوتی ہیں تو شاہی علامہ ان چیزوں کو لے کر آتے ہیں۔ اگر باغیچہ کے تو پہلے ہاتھی، پھر گھوڑے، بے گلوں، مار و بلاق، چھاندی، پیرا، سبابہ، اہونا ہے، تدریجاً بادشاہ کی نظر سے گذر کے خزانہ شاہی میں داخل کیے جاتے ہیں۔

جب سلطان محمد تغلق دولت آباد سے، البس، آتا تو ان دنوں وزیر اعظم خواجہ جہان سے ایک روز اپنے ہدایا، اطہر، زین، پیش کیے۔ بادشاہ نے شہریدار کے باہر ایک مقام پر ان ہدیوں کے واسطے کھدائی کرنے کا حکم دیا تھا۔ اُس موقع پر میں بھی وہاں موجود تھا۔ اور میں نے اپنی آنکھ سے ایکہا کہ وزیر کے ہدیہ اسی ترتیب سے پیش کیے گئے تھے جس طرح میں نے بیان کیا۔ پہلے اور دولت مند کے سامانوں کے ہیں، اس موقع پر دیکھا کہ ایک صینی بین عمدہ اور بے پایاقت۔ اور ایک صینی بین، مثل زردہ اور ایک بین بڑے بڑے موتی، بادشاہ کی نذر لائے گئے تھے۔ دولت مندی کے یہ نمونے دیکھ کر مجھے حیرت ہو گئی۔ خصوصاً دیکھ کر سلطان ابو سعید بادشاہ عراق کے منیجے حاجی کاون بھی وہاں موجود تھے۔ بادشاہ نے اُن مذکورہ جواہرات میں سے تھوڑا توڑا حصہ اُن کو دیدیا تھا۔

دہلی میں عیدین کو بڑی کیفیت ہوتی ہے۔ اور بے شک اُس روز بہان کی دولت و عظمت کا جبروت نظر آیا کرتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ شاہانِ دہلی کی عظمت بمقابلہ دیگر فرمانروایانِ بلاد کے کس قدر بڑی ہوئی ہے۔ جس روز صبح کو عید ہونے والی ہوتی ہے اُس روز رات ہی کو بادشاہ کی طرف سے تمام عائد سلطنت مقربین خلافت، اہل دولت، معزز لوگوں،

کاتبون - مہاجرون - نقیبون - - - داران عساکر - غلامون - - اور یر پہ و پیام پیش کرنے والے کے پاس سب مراتب و مدارج نعمت بیچ دیے جاتے ہیں - صبح ہوئی اور ہاتھی عمدہ عمرہ مرصع اور طلا کا جھولون اور عاریون سے آراستہ کیے جاتے گئے - یہ ہاتھی سر باذن تک جو اہرات سونے اور ریشم میں خرق ہوتے ہیں - سولہ ہاتھی تو فانی شاہ ہشتاہ کی سواری کے لیے مخصوص ہوتے ہیں جن پر کسی کی مجال نہیں کہ سوار ہو سکے - یہ سلطانی ہاتھی کی عماری پر ایک مرصع چتر بھی نصب ہوتا ہے جو مرصع کا - سونے ہی کے ڈنڈے پر قائم ہوتا ہے - ان میں سے ایک ہاتھی پر سلطان سوار ہوتا ہے اور بڑے جھوس اور دھوم دھام سے سواری عید گاہ نور وادہ ہوتی ہے - سلطانی ہاتھی کے آگے تمام صف بندی کے چلتے ہیں - جن کے سروں پر طلائی ٹوپیاں اور گردن میں طلائی پنگے ہوتے ہیں - ان میں سے بعضوں کی ٹوپیاں اور پنگے مرصع کا - جی ہونے ہیں - ان کے بعد پادشہ اور نقیبوں کا جھوم ہوتا ہے - جو بکارتے جاتے ہیں کہ سوار - جی ہے شاہنشاہ ہندوستان کی - ان نقیبوں کا شمار تین سو ہے - اس روز سب کے سب ہمراہ رکاب ہوتے ہیں - ان کے بھی سر میں پر ہندی ٹوپیاں اور گردن میں سنہری میٹیاں ہوتی ہیں - اور ہاتھوں میں طلا کا رگرز ہوتے ہیں - بادشاہ کے بعد قاضی القضاۃ صدر جہان ناصر الدین خوارزمی کا ہاتھی ہوتا ہے - اور ان کے جلو میں کل قاضی اور آغا خراسان و عراق و شام و مصر و مغرب کے مفلوک احوال ہوتے ہیں - جن کی خدمت گزاری سلطنت کی جانب سے کی جاتی ہے - ان میں سے ہر شخص ایک جداگانہ ہاتھی پر سوار ہوتا ہے - لیکن ہندوستان میں خراسان کے محتاج و فلاکت زدہ اس کثرت سے آئے اور آتے ہیں کہ یہاں جتنے محتاج ہیں سب خراسانی خیال کیے جاتے ہیں - اس گروہ کے بعد نو زن لوگ بھی ہاتھیوں پر سوار ساتھ ہوتے ہیں جو راستہ میں برابرہ باواز بلند کلمات تمغیل و تکبیر کہتے جاتے ہیں -

در دولت کے باہر تمام فوجیں اور کل عمائد شہر اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ جلوں شاہی کے منتظر کھڑے ہوتے ہیں - اور اس انتظام سے کہ ہر امیر کے ساتھ علیحدہ جگہ - ٹھن چوکیا ٹیل اور علم اس کی عزت اور اس کے رتبہ کے موافق موجود ہوتے ہیں - بادشاہ جب مندرجہ بالا حیثیت سے چل کے در دولت کے باہر نکلتا ہے تو یہ سب لوگ سب مذاہن

سلای لیتے ہیں۔ اور اب عید گاہ کی طرف اس شان و شوکت سے جاؤں گے۔ انہو کو تاہم  
 سب کے آگے شاہی ہاتھی۔ اور اسی حیثیت سے جس طرح ہم بیان کر آئے۔ یعنی غلام  
 اور چادری آگے آگے انتظام کرتے ہوئے اور عام پبلک کو شاہی عظمت و جبروت کی  
 اطلاع دیتے ہوئے۔ اور بادشاہ کے ہاتھی کے بعد ہی قاضی القضاۃ اور اعزہ وغیرہ بیٹے  
 ہیں۔ اور مؤذن بھی اسی طرح ہاتھیوں پر بیٹھے تکبیر و تہلیل کہتے ہوئے ہمراہ چل جاتے  
 ہیں چنانچہ سب لوگوں کے بعد افرادِ رؤسا کے جلوس اپنی شاندار سی سے ہاتھی  
 ہاتھ ہوئے چلتے ہیں۔ طبل بجاتا ہے اور قرنا پہنکتا جاتا ہے۔ پہلے تو سلطان  
 کے ہمائی مبارک خان پورے جلوس اور تمام سالانوں کے ساتھ چلتا ہے۔ پھر  
 بادشاہ اپنے پاراد بھائی ملک فیروز اپنے جلوس کے ساتھ بڑھتا ہے۔ پھر حضور کا بھتیجا  
 بہرام خان اپنے ساز و سامان کے ساتھ چلتا ہے۔ پھر وزیر اعظم مع اپنے خدم و حشم  
 کے۔ پھر ملک نجیب بن ذی الرجا اپنی فوج اور اپنے جلوس کے ساتھ روانہ ہوتا ہے۔  
 پھر دہلی کا بہت بڑا صاحب سطوت رئیس اپنے جلوس کو آگے بڑھاتا ہے جو ملک الکفر  
 کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بہت ہی بڑا اسماعیل اور صاحب اختیار شخص ہے۔ اس کے  
 وزیر کا یہ ان اعظم ملک علاء الدین علی معنی معروف بہ ابن شیشی جسکو میں بہت ہی معتبر  
 شخص جانتا ہوں خود اس نے مجھ سے بیان کیا کہ اسکو خزانہ سلطانی سے بابت مصارف  
 خانگی کے پھینکے گئے روپیہ سالانہ ملتا ہے۔ ملک قبولہ کے بعد ملک نکبہ اپنے جلوس  
 کے ساتھ روانہ ہوتا ہے۔ پھر عزت الملک اپنے لوگوں کو بڑھاتا ہے۔ پھر خلص الملک  
 پھر قطب الملک۔ غرض تمام امرا اپنے جلوس کے لے کے چلتے ہیں۔ یہ سب دہلی کے بہت  
 بڑے رؤسا ہیں۔ اور ایسے ہیں کہ کسی وقت سلطان سے جدا نہیں ہوتے ہیں۔  
 عید کے روز انہیں حکم ہے کہ اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ اور اپنے عطا شدہ  
 مراتب کا بخوبی اظہار کر کے تنگ دھنچام سے ہمراہ رکاب سلطان عید گاہ کو جایا کریں۔  
 ان سب کے علاوہ اور چھوٹے چھوٹے صد ہار رؤسا ہیں جو یکے بعد دیگرے اس  
 سلسلہ جلوس میں عید گاہ کو جاتے ہیں۔ اور آج کے دن جتنے ہیں سب مسلح  
 ہوتے ہیں۔ اور نیز ان کے گھوڑے اور ہاتھی بھی خوب آراستہ نظر آتے ہیں۔  
 بادشاہ عید گاہ کے دروازے پر پہنچ کے ٹہر جاتا ہے۔ اور قاضی القضاۃ

مذرا جیسے کی درخواست کرتا ہے ہر امر اسے کبار اور نیز ان بیرونی نصیبت زدہ کبار اور ان کو ذیل  
 جوئے کا حکم دیتا ہے۔ جب یہ لوگ جا چکے ہیں تو خود ہاتھی سے اتر کے عید گاہ میں جاتا ہے۔  
 بادشاہ کے پوسچے ہی امام اٹھ کے نماز پڑھتا ہے اور خطبہ پڑھتا ہے۔ اور اگر عید الفجری  
 ہوئی تو قربانی کے لیے اونٹ حاضر کیا جاتا ہے اور سلطان اپنے ہاتھ سے نیزہ مار کے  
 اُسے ذبح کرتا ہے۔ ذبح کرنے کے وقت بادشاہ اپنے جسم پر ایک کپڑا لپیٹ لیا کرتا ہے تاکہ  
 لباس شاہی خون کے دھبوں سے محفوظ رہے۔

عید کے دن جو دربار ہوتا ہے وہ جی نہایت پر تکلف اور بڑی شان و شوکت سے ہوتا ہے۔  
 اُس کے لیے بہت کچھ اہتمام کیا جاتا ہے لیکن اُس کا حال ہم پہر بیان کریں گے۔ اس سے  
 کہ اب یہ مضمون بہت طولانی ہو گیا۔ اور اگر زیادہ بڑھ گیا تو لوگوں کی دلچسپی نہ ہو گی۔

## دُنیا بامید قائم

ایک وعدہ فراموش و ناز فروش حسین کے تیور بدلنے کے ساتھ عاشق مبتلا  
 اسے حیران سے ساری فدائی بدل جاتی ہے۔ دیکھو اودھ یا بہہ۔ جو ایک گڑھی ہی اُسکا  
 ساتھ نہیں چور تے تھے۔ اُس کو دیوانہ سمجھ کر اُس سے کنائی کاٹنے لگے ہیں۔ حشوت  
 اُسے کو بولیے پھرتی ہے اور شوخ مزاج لڑکے اپنے دامنون میں چھبھ رہے ہیں۔  
 اُس کے پیچھے پیچھے ہیں۔ اگر وہ اُن سے جان بچا کر ویرانہ میں جا نکلتا ہے۔ تو وہ خار  
 میدان کہ جو عشاق دلاکار کے نام پر خار کھائے ہوئے ہیں اُس کے تلواروں کو چھید  
 چھید کر چھلنی بنائے ڈالتے ہیں۔ ہوش و حواس صبر و قرار۔ یہ سب اُس کو تنہا چھوڑ کر نہ  
 معلوم کہاں اڑنے چلے گئے ہیں۔ ہجر کی کالی کالی رات اُس کی لٹا لینے کو سر شام ہی سے  
 اُس کی چاتی پر سوار ہو گئی ہے۔ انسوس! درد دل۔ سوز جگر یہ دونوں اُس کے  
 تڑپانے کے لیے رہ رہ کر اُٹھتے ہیں۔ اور اُس آفت رسیدہ کو نہ اس پہلو چین  
 لینے دیتے ہیں اور نہ اُس پہلو۔ بستر خاک پڑھ پڑا لٹ رہا ہے اور دردی آواز سے یہ خواہش شعیر پڑھ رہا ہے  
 کہ بابا بیچ میں ہم کرو میں ہر سو بدلتے ہیں جو بل اُٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں  
 آسمان کے یہ پیار سے پیارے اور خوشنما رہے۔ جو ہر شب آسمان کی نیلگوں چادر کی کسی



مہر و سوز اور گلزار کے بستہ ناز کے پھولوں کی طرح کبھر سے رہتے تھے آج انہوں نے بھی بادلوں میں اپنی آنکھیں پیرائیں غالباً عاشق ہجران نصیب کو شب ہجران کا کائنات ان ہی کو گن گن کے کچھ دہل ہو جاتا۔ آسمان کا مطلع جو کل ضیاء قمر سے خندہ پیشانی بنا ہوا تاروں کے ٹکھنے سے اٹھماڑیسم کر رہا تھا۔ آج اس کی پیشانی پر ہی بادلوں کے بل آئے ہوئے ہیں اور غنہ پیشانی اور تبسم ناز کے بدلے اپنے دونوں کی سمائلے والی آواز سے گرج گرج کر تجزین نصیب کے شستہ دل کو پاش پاش کیے رہتا ہے۔ اور بار بار ایسا گرجتا ہے کہ بجلی کشتہ ناز کے سر پر آکر رہ جاتی ہے۔ عاشق نامراد کی قوت متخیلہ خود یہ غضب زباں رہی ہے کہ مستوق ستم شعار کے دل فریب عارض کھل عاشق دلدادہ سے سامنے کر رہی ہے۔ اور وہ جوم شوق و جوش بخود ہی مین ہو سہ کے لیے اپنا رشتہ غم سے اٹھاتا ہے۔ اور روئے جانان کی طرف منہ بڑھاتا ہے۔ لیکن جو جو یہ نہ تھکے بڑھا جاتا ہے۔ وہ وہ بسیار سی فکر زیب خیالی صورت اُدھر بٹھتی جاتی ہے۔ یہ اُسے معمولی نا فکر شہم خیال کر کے اپنے بستر غم سے مارے خوشی کے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس کی طرف منہ مخاطب ہو کر ایسے وحشت کے اوج میں یہ دلہوز شعر پڑھتے لگتے۔

سہ خیال یار در آغوشم آن چنان بفسرد  
کہ شہم استہم از شکوہاے دوش آمد۔  
جب وہ خیالی صورت تریب الی ہوئی نظر نہیں آتی۔ نو وہ اُسید و نیم کی حالت میں اُسکی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ اور ڈر ڈر کے یہ کہتا جاتا ہے بس اتو بہت ترے سالیہ۔ اتو بہت ترے سالیہ۔ اپنے عاشق سے اتنی بیرخی! افسوس! افسوس! دل آزار می۔ دیکھو تو زیارت کی کب سے تھکے۔ لہذا آج تو پوری کر دو۔ دو چار ہی تدم بڑھنے پایا ہو گا کہ فوراً چونک پڑا جنگل کے اُن کانٹوں نے جو عاشق خانمان برباد۔ لہذا قدم لیتے کو بلکہ بلکہ پڑے رہا کرتے ہیں اُس کے ناتوان پیردن کو لہو لہان کر دیا۔ وہ وہیں ایک سسکی بھر کر بیٹھ جاتا ہے اور کانٹوں کو پاؤں سے نکال نکال کر پھینکتا جاتا ہے اور ٹھنڈی سانسین بھرتا جاتا ہے کہ یکایک پھر بجلی چمکتی ہے۔ اُس وقت اسکی فوری تیز روشنی میں وہ جلد ہی سے اُدھر اُدھر دیکھتا ہے مگر کسی کی صورت نہیں نظر آتی۔ کہیں کہیں کالے کالے پاڑوں کی ڈراونی صورت تو دکھائی دیتی ہے۔ اور کچھ ہی نہیں۔ ہا۔ ہا۔ ناکامی! وہ اُسی طرح دل بقیار کو ہاتھوں میں تھامے یا سحرست

کی دردناک آہیں بہر تاپنے بستر ہجران پر آگے پڑھتا ہوں۔ ظالم قوت تجلیا ابھی ایک بار دہوکا  
 دے ہی چکی تھی۔ مگر پھر سستے ہوئے کو سنانے کے لیے تیار ہو گئی۔ بس، فتنہ اس نے  
 بلاکشان ہجران کے سامنے وہ گلوے مصفا کر دی۔ جمہین باہین ڈالنے کی۔۔۔ وایک  
 مدت سے بچپن کر رہی تھی۔ وہ نرط شوق سے لیے ہی اپنے پُر شوق باہین بس میں ڈالنے  
 کو بڑا تپے گزراتا ہوا کہ قاتل کی بیکار کوشش میں تھک کر اس کے بیتاب سبب پارہے بن چکا تھا  
 نے اس کو اٹھا کر بٹھا ہی دیا۔ یہ تو یوں ہے کہ جس دل میں آرزو میں اور فنا میں  
 بھری ہوئی ہیں وہ بڑا ہی بچپن ہوتا ہے۔ اب یہ باہین بھیلے اس کی طرف نہایت  
 زور سے شوق سے جھکتا ہے۔ بدلتا جھکتا جاتا ہے اُتار ہی دے دیار کی نظر فریب مجھ سے  
 مانی جاتی ہے۔ وہ گلوے مصفا میں باہین ڈالنے کے شوق میں اس درجہ بخود مہو جاتا  
 ہے کہ جھکتے جھکتے اس کی عرق آلود پیشانی ایک پاس سے پتھر سے جا کر زور سے ٹکراتی  
 ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ جاتا ہے۔ یہ چوٹ کھا کے وہ سر کڑکڑیٹھ جاتا  
 ہے اور اسی حالت میں ہزار آنکھیں چاٹ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھتا ہے مگر دنیا کی شے نیزین  
 تابی کی سیاہ چادر کا انہیں نہ پڑا لے ہو میں اس لیے اسکو کچھ نظر نہیں آتا۔ اور وہ  
 دلفریب اور جفا کار صورت بھی نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ اور یہ حرمان نصیب  
 اپنی ناکامی پر ہاتھ ملتا۔ یہی تپا ہے۔ اس آگے عاشق ہجران نصیب کی بیتابی و بھڑکی  
 و سمان، کھانے کی محرم ہوتا ہے۔ نہیں۔ اور نہ رقیق القلب، قریب ناظرین کو دیکھنے کی  
 طاقت ہوگی۔ قصہ مختصر دیا کی جس قدر چیزیں ہوتی ہیں وہ عاشق بنانا کے مقابلہ میں  
 معشوق جفا کار کا ساتھ دے دے کہ اس کا جینا تک دشوار کر دیتی ہیں۔ عزت، ایسا امید  
 ایسی چیز ہوتی ہے کہ جو عاشق آفت رسیدہ کی بلیسی اور بے بسی میں اس کی بولس اور  
 ہدم ہوا کرتی ہے۔ معشوق سنگدل کے جو رد ستم اور شب ہجران کے رنج و غم کچھ ایسی  
 زبان گداز اور روح فرسا چیزیں ہیں کہ کوئی کیسا ہی سخت دل ساختہ دل کہان  
 نوان کے برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتا۔ بس ایک امید ہے کہ جو اس کو  
 محسوس نہایتی ہے۔ اگر امید نہوتی تو کوئی عاشق ہجران نصیب شب ہجران کی صبح کو  
 زندہ نہ اٹھا کرتا۔

جب کسی سیتن کی جدائی کی رات میں شوق مجبور ٹیڑیاں رگڑے رگڑے مان میں ہو جائے

تو اُس وقت معجزنا امید کچھ ایسا اعجاز دکھاتی ہے کہ وہ اپنے سارے سرخ والہ بھول جاتا ہے اور اپنے دل ہی دل میں یہ باتیں کر کے کسی وصلت نصیب کے خوش ہونے سے کہیں نہیں خوش ہو جاتا ہے۔ اچھا ہم بھی دیکھتے ہیں کہ اُن کے یہ جو رستم کب تک رہتے ہیں۔ یہ سارے جو رستم میری آزمائش کے لیے ہوں گے۔ نہ صورت سے تو وہ ایسے سنگدل نہیں معلوم ہوتے۔ صورت تو ایسی بولی ہے کہ کسی کے سونے چہرہ جانے پر بھی اُنہیں ترس جاتا ہو۔ اُنکا دل میں شرم و حیا ہی اتنی ہے کہ آجندہ خود مجھے کہی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔

کچھ ایسے ترش رو بھی نہیں معلوم ہوتے کہ میرات پر نہیں ہی نکلے۔ جب ایسے ہیں تو اُن کے دل میں میری محبت ہی غمزدہ ہوگی۔ اور جب محبت ہے تو آج نہیں کل۔ کل میں پر سون۔ کہی نہ کہی تو مجھے ترس کھائیں ہی گے۔ عجب نہیں کل ہی وہ نصیب ہو گیا آج کی! اتنی جیسی کٹے کاٹ لو۔ کل پہلوے جانان میں بیٹھے کچھ اور باتیں کر رہے ہوں۔ بس اُن تو جھوٹے ہی اُن کی بے۔ خنی اور جو روحنا کے شکوے کا دفتر کھول کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا۔ اور کچھ نہیں شرمائیں گے تو اُن کا شرانا ہی ان سب کی تلافی کر دیتا۔

دیکھو وہ ازل اندام انہیں یہ دلہن بنے ابی پورا بس ہی نہیں ہوا۔ پندرہ دن اور گذرنے تو کہیں پورا برس ہوتا۔ آج دو گھڑی دن چڑھے موت کے بے در دہاتوں سے اُس نے بنا لے جھٹایا۔ کل چار گھڑی دن رہے جو چوڑیوں کا جوڑا اُس نے بڑے ارمانوں سے پہنا تھا اس وقت کوئی عورت اُنہیں بیٹھی سنگدلی کے ساتھ تنہا کر رہی ہے۔ وہ خود غم و اندوہ کی تصویر بنی بیٹھی ہے اور حسرت کی نگاہوں اُن باتوں کو دیکھ رہی ہے۔ وہ سانس تک نہیں لیتی۔ نازک نازک کلاسیاں چوڑیوں کے چپے سے دو چار جگہ سے زخمی بھی ہو گئی ہیں اور گوری گوری کلاسیوں پر لال لال چھینٹیں کیا قیامت برپا کر رہی ہیں۔ رنگین کپڑے جو حسب رواج سہاؤنوں کا خاص لباس ہے وہ بھی ہمیشہ کے لیے اسکے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم سے چپن بیٹے گئے اور ویڈیو الگنی پر کسی مصیبت زدہ کی طرح ایک کس میری کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں۔ خود اُس کا صندوق تو کسی سفید جوڑے سے خالی تھا مگر مجبور کسی نے اُسکی بوڑھی اس کا جوڑا لاکر پہنا دیا ہے۔ مختصر مانہ جفا کرنے بناؤ سنگار کے تمام سامان علیحدہ کر دیے۔ ہاں افسوس اُن انگلیوں میں جن سے ابھی رنگ خاں نہیں چھوٹا اب ایک چمک نہیں۔

یہ سچ ہے کہ حسن خدا ہو کو بناؤ سنگار کی کچھ حاجت نہیں لیکن یہ حسرت نصیب سادگی  
 اس وقت اُس کا حسن بفریب میلے سے کچھ زیادہ دل کش دکھائی ہے۔

جس کسی نے مغربی حسن کی سادگی غور سے دیکھی ہوگی۔ اُس کو اچھی طرح معلوم ہوگا  
 کہ نچرل خوبصورتی کی بنیاد اداہٹ پر موقوف ہے اور نہ سرسری سیائی پر۔  
 اور نہ اُس کو اپنی اصلی سرخی کے مقابلہ میں پان کی سرخی اور مہندی کے نقوش  
 رنگ کی پرواہ ہے۔ بلکہ بحر میں ایک گہرا مچ رہا ہے۔ یہ وہ ان دشت شدہ ہو  
 ہو کے کہی اس کے منہ کو دیکھ لیتی ہے اور کہتی ہے اُس کے منہ پر۔ اور زبان۔ ست  
 کچھ تین بہ لیتی۔ اس وقت گنگلی بانڈھے اُس کو دھینے کے لیے کس طرف دیکھ رہی ہے  
 جو اس کی سن۔ یہ دھاس کی گود میں ہوتا یاد ان چینکے ہے۔ اور وہ اس کی  
 بوڑھی ساس اپنے جوان بیٹے کی لاش کے پاس بیٹھی ہے۔ بیان کر لے گئے آٹھ آنکھ ہنسوا  
 و۔ ہی ہے۔ اور کہتی ہے کہ باپے تو نے میرے مرنے تک تو ادھر صبر کیا ہوتا۔  
 پچھلے اس حالت کبر سنی میں یہ داغ عظیم کیوں دیے جاتا ہے۔ دیکھ تو یہ تیری  
 پیاری دُھن تیری پیٹی سے لگی بیٹھی ہے۔ اس اپنی بیوہ اور شیم بچہ کو اس پر  
 چھوڑ چلا۔ ہاے مجھے تو اپنی اس نوجوان حسینہ دُھن سے بڑی محبت تھی۔ اور وہ  
 بھی تیری مفارقت سے کیونکر زندہ رہ سکتی ہے۔ ارے اب یہ ہمیشہ کی جدائی  
 تو نے کیوں گوارا کر لی۔ ہاے اللہ تو نے اس کی جوانی ہی پر ترس کہا یا ہوتا۔  
 یا اس بے زبان معصوم بچہ اور اُس نئی دُھن پر۔ ابھی تو اس کے دل کے ارباب  
 ہی پورے طور سے نکلنے نہیں پائے تھے۔ اور نہ اس کی پیاری نئی دُھن کی بڑی  
 پوری ہوئی تھیں۔ ہاے غصہ اس شادی کو دن ہی کے ہوئے ہیں۔ افسوس!  
 اگر میں یہ جانتی کہ تو جوان مرگ اُس قدر جلد سد ہارے گا تو میں تیرا بیاہ آج کے  
 اس بیگانگی بچی کی راہ کیوں مارتی! ہاے قسمت اسکا صبر ہی میری ہی جان پر  
 ہے۔ ہاے میرے دل کی سب آرزو میں بھی تو اپنے ہی ساتھ لے چلا۔ آہ، کیہ تو  
 میں یہ چاند سی دُھن تیرے واسطے کس جاہ سے بیاہ کر لائی تھی کہ اُس کی یون جوئی  
 گنگلی کروں گی۔ اور خوشی خوشی ارباب بھرے شغل میں میرا دل بٹے گا۔ افسوس! اب  
 کے مارے سنگار ایک تیر۔ ہی دم کے ساتھ تھے۔ اب تو تیرے بے وقت کہ سچ

ان قسمت چٹا کو سو بڑے بیون کی ایک بڑھیا بنا دیا۔ اور باب اس کا بناؤ سنگار کر کے  
کس کو دکھائون گی۔ اگر میرا کچھ خیال اور وطن کی کچھ پروا نہیں کی تھی تو اپنی جوانی  
پر تو کچھ رحم کھایا ہوتا۔ اسے کبھتی۔ ابھی اس کی بساط ہی لیا ہے۔ اسے ابھی تو  
چوڑے دو مہینے کا بھی نہیں ہے۔ یہ جو چاند آوے گا اُس کی پنجون کو نیر سے  
دو مہینے کا ہو گا۔ اسے یہ کیا ہائے گا کہ میرا باب کالا تھا یا گورا۔ اب اس کے سر پر  
کون باتہ رہے گا۔ اُس کا تو کوئی باب یا چچا بھی نہیں جو وہی اُس کے سر پر ہاتھ  
لگتا۔ ایک بین بلیخت سخت جان ہون جو جی رہی ہوں۔ مگر افسوس سیڑھا سینا  
نہ جیاد۔ نون برابر ہیں۔ بین گونا نام کو زندہ ہوں مگر مردن سے بھی بڑے کے مردہ  
ہوں۔ اسے تیرا غم کچھ کسی کام کا نہیں رکھے گا۔ مجھے تیرے باب کا مرنا یاد ہے۔  
تیری سحر جب پانچ ہی برس کی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے تجھے پالا تھا۔ جب  
تو پیدا ہوا تھا میں پانچ بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ جس طرح ہو امر کہپ کے تجھے  
میں نے پال لیا تھا۔ مگر اُسے مشکل ہے تو اس بیچاری کی جان پر ہے۔ اسے  
ابھی وہ خود بھی ہے اسے کیا خبر کہ دنیا میں کس طرح پالے جایا کرتے ہیں۔ جتنی  
پر جا رادتی وہ سال گذشتہ ہی نو میں نے بیچ کر تیرا بیاہ چایا تھا۔ اتنا اُس کا مارا  
ہی نہیں کہ وہ گھٹنے والی روٹی مل جایا کرے اُس پر ستم یہ کہ ابھی ایک مہاجن کا ترن  
باقی ہی ہے۔ وہ اسے بھی بیٹا کر دے کہ اسے بین باہر نکال کھڑا کر دے گا۔ اسے  
تیرا اٹھن امیر کے گھر کی بیٹی لادنیار کی ملی ہوئی ہے اس کبھت سے تو یہ بھی نہیں  
ہو سکے گا کہ آنا بیٹا بیاہ جتے ہی کہات کر اس بچہ کو پال لے۔ تو گور میں کیا گیا  
گویا ہم سب کو زندہ دگور کر گیا۔ غرض یہ جدا جدا بیان کر کے رو رہے ہیں  
اور وہ ایسی بولی ہے کہ رونا تک بھی نہیں جانتی۔ سب طرف سے اُس کو مایوسی  
گھیرے ہوئے ہے۔ جد ہر نظر کرتی ہے ادھر یا اس دہرست ہی کی صیب صورتیں  
نظر آتی ہیں۔ مگر جب وہ اُس دو مہینے کے بچہ کی طرف دیکھتی ہے کہ جو اپنی دادی کی  
گود میں پڑا بھگری کے عالم میں انکو ٹھاپا جو رہا ہے تو اُس وقت اُس کے  
پڑمردہ چہرے پر امید و اطمینان کا روغن پھر جاتا ہے۔ اس وقت ایک تسکین  
والی امید اُس کے دل میں ہے اور وہ اپنے دل ہی میں یہ کہہ رہی ہے۔

ابہ کیا کیا جاے مرنے والا تو مر گیا۔ شاید میری ہی بد قسمتی نے اُس کو مار ڈالا ہو۔  
 ہاے قسمت کا لکھا پورا ہی ہو کر رہتا ہے۔ قسمت میں تو یوں لکھا تھا کہ برس دن ہی  
 کے اندر میری دنیاوی خوشیوں کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اتنے ہی دنوں میں وطن  
 ہی بنوں گی۔ ایک بچہ کی ماں بھی ہو جائے گی۔ اور اس کمبخت زندہ آپے کی موت  
 ہی دیکھ لوں گی۔ کاش اگر قسمت کا لکھا ہوا وقت سے پہلے معلوم ہو جایا کرتا۔ تو  
 جس وقت میرے ماں باپ میرا یہ کیا تھا انکار کرتی دنیا مجھے بڑی بے شرم کہتی  
 اگر اُس وقت میں اپنی شادی کرانے سے انکار کر دیتی۔ اور اپنی بد قسمتی میں کسی  
 وہ سہرے کو کبھی شریک نہ کرتی۔ بُرے بھلے جس طرح ہوتا کنواری ہی رہ کر زندگی  
 کے دن پورے کر لیتی۔ خدا کو تو یوں ہی منظور تھا پھر میرے کیسے یا کسی اور کے کیسے  
 کیا ہوتا۔ جو چاہے وہ کیسے اُس کے آگے دم مارنے کی کیا مجال۔ یہ ہی اُس کی  
 سب سے نیازی ہے کہ مرنے والا اپنی نشانی ایک بچہ چھوڑ گیا۔ بس اب دنیا میں جو ہے  
 یہی ہے۔ خیر کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا نہ مانے سہی مگر زندگی ہوگی جی جاوے گا۔  
 غریب پسنداری آخر کسی نہ کسی طرح اپنے بچہ کو پا لیتی ہے۔ گو میں ناز و نعمت  
 ملی بلی ہوئی ہوں مگر جب وقت ہی آپڑا تو اس پیٹ کی آگ اور اس بچے کی ماننا جو  
 لپٹ کر اٹے گی وہ کرنا ہی پڑے گی۔ اگر میں نہ کروں گی تو اور کون کرنے آئے گا۔  
 میں محنت مزدوری سے نہیں ڈرتی کسی طرح یہ پروان چڑھ جائے۔ جو ہونا تھا وہ  
 تو ہوا اب بانوں کا وقت نہیں۔ اب مجھے اس بچے کے پالنے کی فکر سوچنی چاہیے۔  
 کٹر بڑی بوڑھیان کہا کرتی ہیں کہ جس کسی کو تھوڑا بہت کوئی فن یا علم آتا ہے  
 وہ کبھی ہو کا ننگا نہیں رہتا۔ خدا کی عنایت سے قرآن مجید اور اردو میں پڑھنا  
 لکھنا مجھے ہی آتا ہے محامد میں دس پانچ گھر اشرفون کے ہیں لگراُن کے بچوں کو پڑھا  
 دیا کروں گے تو فکر اکل و شرب سے مجھے فراغت حاصل ہو جاتی گی۔ اور عزت کے  
 ساتھ بسر ہو جائے گی۔ اگر حیات باقی ہے تو زمانہ کو گزرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ خدا  
 غالب کو بہت نصیب کرے۔ سچ کہ گیا ہے۔

یہی سعادت کے مقابل اُسے عمرِ برق کو پایہ حنا باندھتے ہیں۔

پانچ برس چکی بجاتے ہیں آٹے جاتے ہیں۔ جب خیر سے یہ پانچ برس کا ہو جا کا تو میں

میں اپنے آپ سی نہ بنائے بیٹھوں گی کسی کتب میں بیجا تو اس وجہ سے ٹھیک نہیں ہو گا کہ وہاں دوسرے بچوں میں کھیل کر خراب ہو جائے گا۔ اس کے سر پر باپ تو ہے نہیں لہذا اس کی دیکھ بھال اور تربیت کر لگا۔ اس سے بہتر ہی بہتر ہے کہ پہلے کلام مجید اور اردو کی چار پانچ کتابیں پڑھا کر کسی انگریزی اسکول میں بہرتی کرادوں گی۔

آج کل گھر گھر انگریزی کا چرچا ہے۔ سنا جاتا ہے انگریزوں نے نوکری کا ملنا انگریزی پڑھنے پر موقوف کر دیا ہے۔ لوگ پھر انگریزی کا نام لے کر کہتے ہیں کہ اگر آدمی یہاں تک انگریزی پڑھے تو وہ نوکری پیدا کر سکتا ہے۔ انگریزی کچھ ایسی الٹی زبان ہے کہ وہ کبھی نام میری زبان ہی پر نہیں چڑھتا۔ دل ہی دل میں پھر رہا ہے۔ خیر کچھ ہو گا۔ بس جب وہاں تک پڑھ لیا تو میں اپنے فرضوں سے ادا ہو جاؤں گی خود دکھانے کے لئے لگے گا کسی کے دن سدا ایک سے نہیں رہتے ہیں اور نہ رہیں گے۔ یہ مصیبت کے دن ہی گزرتے ہو جائیں گے۔

دیکھو امید لے دم دلا سا دیکر آخر اس ستم رسید کو صبر دلا ہی دیا۔ انہیں بناؤں پر کہا ہے اور سچ کہا ہے ”دنیا بامید قائم۔“

ایڈیٹر۔ اس رنگ۔ مضامین اب ملک میں ناپسند ہیں۔ گو پشتہ بارہا لکھے گئے۔ لیکن اور ستم کے مضامین تحریر فرمائے بشرطیکہ عمدہ ہوں اور طبیعت پر زور دے کے لکھے جائیں کہ ضرورت ہوں گے۔

### حضرات ناظرین

ماہ نگار کے پرچے آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس عرصے میں طرح طرح کے خیالات لوگوں نے ظاہر کیے بعض حضرات کو تو یقین آگیا کہ دلگداز بند ہو گیا۔ مگر ہم کہہ چکے ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ یہ سچ ثابت ہو گا کہ دلگداز چاہے دیر میں مچلے مگر برابر نکلتا رہے گا۔ یہ ایک جیسی کا مشغلہ ہے۔ خدا نے چاہا تو یہ دیکھیں ہمیشہ قومی امیدوں کو بڑھاتی رہے گی۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ براہ عنایت بہت جلد قیمتیں ارسال فرما کے مشکور کیجیے۔ آپ کا نام ستم دہ

## بادِ صحر

صبح خیزان سہد بہت ترشکے اُٹھے۔ اور مذہبی فرائض کے ادا کرنے کی جانب  
 نہایت سرگرمی سے متوجہ ہو گئے۔ انھوں نے جس چراغ کو غلبہ تاریکی کو قوت  
 طاقِ سجدین روشن کیا تھا اسے کچھ خوشگوار سی ہوا کے جھونکوں سے چھیرے  
 کہا کہا کے اور اپنی دلفریب نو آیت کو کو کو کو کے یا مختصر یوں کہ جھللا جھللا کے  
 گل ہو جاتے دیکھا۔ اور یا یہ دیکھا کہ صبح کی بیباک ہوا کسی جھونکے لینے والے رنگین  
 کی طرح لڑکھاتی ہوئی مسجد میں گھس آئی۔ اور حضرت شیخ کے ایسے خشک فرام فرنگ  
 کے ساتھ ہی یہ بے ادبی کی شوخیان کرنے لگی کہ اُنکی سفید نورانی اور لمبی واڑھی دھما  
 دھما کر اڑی جاتی ہے۔ وہ داب و دوچار کی آوازوں سے رُک رُک کے بلکہ لوگوں کی  
 آنکھ بچا بچا کے اُسے روکتے ہیں مگر وہ ہمارے دل از خود رفتہ کی طرح اُنکے ہاتھ  
 سے نکلی جاتی ہے۔ اس کے سوا اور کیا تھا جو انہوں نے دیکھا۔ صبح کے نقیب یعنی  
 طیورِ نغمہ خوان نے انہیں بہت ہکا بکا۔ نیم ستانہ روئے بڑی بڑی ٹوٹ اور آوازوں سے  
 اسوقت بھی جب یہ وضو کر رہے تھے اور اُس گھڑی بھی جب یہ نماز میں مصروف  
 تھے اسنے پہاڑوں میں بہت ہٹو کے تباہے مگر ان کو ولین اتنی حس کہاں کہ قدرت  
 کی مہلی ہمار کو دیکھیں اور سبحان اللہ کہیں۔ یہ کلمہ اُنکی زبان سے بے شک سنا گیا۔  
 اور بار بار سنا گیا۔ مگر موجودہ وقت کی دھبھیوں اور عروس قدرت کی ناز آفرینیوں پر  
 نہیں۔ بلکہ چروں کی تمنا اور جنت کی آرزو میں۔ اس اعتراض کو لوگ فضول نہ  
 سمجھیں خشک طبعان بواہوس پر یہ سچا اعتراض ہے کہ انہوں نے قدرت کی  
 موجودہ دھبھیوں کی قدر نہ کی صرف آئندہ لطفوں کو یاد کرتے رہے۔ صبح جو  
 باغِ قدرت کے نگہار کا وقت تھا اسوقت یہ اُٹھے۔ مگر اُس وظیفہ میں مشغول  
 ہو گئے جسے اور وقت ہی پڑھ سکتے تھے۔ یہ غیر ممکن نہ تھا جو اس وقت یہ صفات



قدرت کا مطالعہ کرنے کے لیے وقت نکالتے۔

بیشک ان کی زبان میں کوئی اثر نہیں ہے۔ جب خدا کے معین کی ہوتے  
موجودوں یا نعمہ سراسر معجزات کی دعوت انہوں نے نہ قبول کی تو انکی اذان کو  
سننا۔ بس کوئی اتنا بھی نہ تھا جو ہمیں زبردستی بکڑلاتا۔ اور ان پر فضا مقاموں میں  
لا کے کھڑا کر دیتا جو ہمارا قدرت کے مرکز بلکہ حقیقت میں مورد رحمت ہیں۔

خدا کی بہت بڑی عبادت یہی ہے کہ اُس کی قدرت کو دیکھ کے انسان اپنی  
مخلوقیت کا سبق حاصل کرے۔ یہ نسیم صبح کو ستوالی بن بن کے چلتی ہو اور سبکی  
کیفیتیں ہر جہ موثر ہیں کہ نوجوانانِ اچمن جو قدرتی طور پر یا خود پسندی کے  
غور میں بالکل بے حس بنے ہوئے ہیں اُن پر بھی ایک ایسا بخود دی کا عالم طاری  
ہوتا ہے کہ وجد میں آ آ کے مشغول رقص ہو جاتے ہیں۔ نوجوانانِ چین در کنار  
عروسان گلشن انبی مازک اور دیلفریب پہول خلی تانیت کی تہی شور ہے اُسے  
بھی جو شمسیت میں ضبط نہیں ہو سکتا اور کسی طرح اپنے مازک اور خوش رنگ  
لب بند نہیں رکھتے جاتے۔ ان بے حسوں کا تو یہ حال ہے اور انسانی دماغ کے  
عقلانے اپنی عقلوں کو اس قدر غیر متاثر بنا دیا ہے کہ وہ خبر ہی نہیں ہوتے اور نسیم صبح  
دنیا میں ایک زندگی بخش سان پیدا کر کے رخصت ہو جاتی ہے۔

کوہستانی سبزہ دار جنگلی چوٹیاں صبح کے سنائے میں شبنم سحر کے دھوئے ہوئے آسمان  
کی صورت دیکھنے میں ایسی محو ہوتی ہیں کہ گویا اور کسی طرف دیکھنا چاہتی ہی نہیں  
اُنکے ہر درخت بلکہ اُنکو لباسِ زمردین پہنانے والی گمانس کی ہر پتی کے چتر مند  
سکوت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بالکل سنائے اور محویت کے عالم میں ہیں  
از خود زندگی نے اُن پر ایک سکتے کا عالم طاری کر دیا ہے۔ یہ نسیم اس وقت کی خفیف  
روشنی میں جب پہلی رات کے آسمان پر تاروں کے چراغ گل کرنے اور انہیں  
ایک فریاد جھللاہٹ پیدا کرنے کے لیے اوپر چڑھتی ہے تب دیکھیے کہ اُن از خود تیرتے  
قلد ہائے کوہ کو اُس خواب حیرت سے جگانے کے لیے یہ کن ستارہ لغزشوں اور  
شونخ اداؤں سے ان کے دامن میں اوہر اوہر گدگداتی ہوئی جاتی ہے۔ اور  
کس کس طرح بتیاب کر کے انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی ہے۔ نسیم ان

کوششوں میں ناکام ہی نہیں رہتی تھیں۔ اُسے کامیابی بلکہ بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ اس کی ان شوح ادائیگوں کے نتیجے میں صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اسے قدرت کے ارگن کو کوک دیا۔ اور ہر ہمارے طرف سے تحسین کے ایجاد کیے ہوئے نغمہ سنے جانے لگے خوش نوا اور آزاد طبع طور جو اس مصدقہ دنیا کے نشیب و فراز میں شب باش ہو کر تے ہیں درختوں کی حرکت انہیں جگاتی ہے اور وہ چونک چونک کے خدا کی مناجات اور قدرت کی خوبوں کے شادیاں شروع کر دیتے ہیں۔ زیادہ دن کا ہم شرب و شرب بیار لڑا ہی آنکھیں بند کر کے الگ ہو جاتا ہے۔ اور خوش مذاق و شگفتہ طبع طور ان خدا کے بنائے ہوئے ہر جون پر بیٹھ بیٹھ کے قدرت الہی کی نوبت بجانے لگتے ہیں وہ آبشار جرات کے سائے میں ایک سکوت کے ساتھ بلندی سے ہم آترتا چلا آتا تھا اُسے اب اپنے آئینہ میں باج صبح کی روشنی کا نورانی عکس دکھایا ہے اور اُسکی لہریں اُن گوری اور پرفشان پیشانیوں کی شکنوں کا فرو یاد لاری ہیں جو صبح یعنی رخصت و سفارت کے وقت عموماً نمایاں ہو کرتی ہیں۔ ان غصہ کا اظہار کرنے والی شکنوں کو ہوت کی شوح طبع رقا ص یعنی وہی نسیم سحر ہنسی میں اڑا رہی ہے۔ اور بار بار ہٹو کے اور ٹوکریں تبا کے علیحدہ ہو جاتی ہے جس پر یہ قدرتی جبین نماز اور برہم اور پچھن بجاتے ہیں۔ کیا یہ قدرتی کارکنان تضاد و قدر کی مزے دار چہرہ ہاڑی تھی کہ زیادہ گوشہ نشین ان سے چشم پوی کرے؟ لیکن سچ یہ ہے کہ خدا نے اُسے وہ آنکھیں ہی نہیں دیں جسے یہ کفایت نظر آتی ہیں۔

ایک تھکا ماندہ مسافر جس طرح اپنی پرشوق نقار میں دیکھتا ہے کہ رفتہ رفتہ دور کے دھند ہلکے کا دامن چاک ہوتا جاتا ہے۔ اور وطن کی عمارتیں ساعت بستا زیادہ اُہرا ہر کے نمایاں ہوتی جاتی ہیں۔ اُسی طرح صبح کا گریبان جو جو چاک ہوتا ہے وہ وہ قدرت کے نظر فریب سامان اور زیادہ نمایاں ہوتے جاتے ہیں مستحکم سمندر کا کنارہ پر آرزو نظروں کو دور کی سیر کرنے والا ساحل۔ جہاں اکثر دوست آشنا سے بچھڑے ہوئے ہجران زدہ۔ خدا جانے کن کن آرزوؤں سے

نظر دھڑایا کرتے ہیں وہاں اس وقت جو وقت نسیم سحر کو آپ نے سپار کی  
 چوٹیوں پر چڑھتے دیکھا تھا ملاحظہ فرمائیے تو یہاں ہی باغ قدرت کے عجیب  
 و غریب کرشمے نظر آتے ہیں گے۔ وہ جہاز جس کے انتظار میں لوگ مدتوں سے چشم براہ  
 تھے اور جسے رات کی تاریکی میں اسٹیم کی قوت یا باد بانوں کی کشش سے اپنے  
 سفر کی بہت مسافت طے کر لی ہو۔ اب اس وقت ان معمولی توٹوں کو نسیم سحر اور  
 بڑھاپا ہی ہے۔ اور گویا مشاقون کے جذبات کی سحر جگہ گئی ہے اور انہیں ٹری  
 قوی کشش کے ساتھ کنارے کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ اس جہاز کی جستجو کرنے والی  
 نگاہوں نے صبح کا دھن چاک ہوتے ہی بہت دور پر پایا تھا۔ اس کی پہلی مٹی مٹی  
 شکل اب زیادہ نمودار ہو گئی ہے۔ نسیم سحر اسکے استقبال میں اس درجہ سرگرم ہے  
 کہ سمندر کو اپنی نازک جہونکوں سے بار بار پھیرے دیتی ہے۔ اور کوشش کرتی ہے  
 کہ سمندر اس جہاز کے لیے جو گویا مختلف آرزوؤں اور اسیدوں کی مجموعہ تصویر ہے  
 خود ہی جگہ خالی کر دے۔ اگرچہ یہ پھیرے ڈھیلے ہاتھوں کی مار ہیں۔ اور ان  
 ناز و عشقانہ اور جورمہ و شان کا مزہ آتا ہے لیکن ناہم سمندر اس پر بکریاں کے  
 بار بار چین بچین ہو جاتا ہے۔ ان سب باتوں کی مجموعی کیفیت دیکھنے سے تعلق  
 رکھتی ہے۔ وہ سطح آب کا جھجلا جھجلا کے چین بچین ہونا۔ وہ جہاز کا برابر آگے  
 بڑھنا۔ اور وہ نسیم سحر کا بار بار اور رہ رہ کے سمندر کو چیرنے کے الگ ہو جانا ایسی  
 لطف کی باتیں ہیں کہ ایک صاحب جس کے نزدیک ان کی زیارت ہی  
 اول درجہ کی عبادت الہی ہے۔

اسے پیاری خوشخبر ام نسیم سحر۔ تو قدرت کی سچی کار فرما ہے۔ کار فرما ہی نہیں زمانہ  
 ہی ہے۔ خدا کے وہاں سے صبح کا پیام دنیا والوں کے پاس تو ہی لاتی ہے۔ تیری  
 ہی خوشگوار زندگی جب محسوس ہوتی ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ اب صبح ہوئی۔ قدرت کی  
 کار فرمائی کی خدمت سر انجام دینا تیرا ہی کام نہیں بلکہ تیرا ہی حصہ ہے۔ غالباً  
 تیری ہی نازک انگلیوں سے وہاں سحر ہی چاک ہوتا ہوگا ایسے کہ جب کہی ترے  
 آنکھ کھلی ہے ہنسنے بچسنے خود دیکھ لیا ہے کہ آسمان پر جا کے تاروں کے چراغ تو  
 ہی گل کرتی ہے۔ پھیلے کے چاند کے چہرے پر تو ہی وہ سفید پوڈر مل آتی ہے

جو اسکی روشنی کو ماند کر دیتا ہے اور جسکے اثر سے آغزوہ الیسا غائب ہوتا ہے کہ دنیا بہر میں کوئی اُسے نہیں دیکھ سکتا۔ چاہے وہ سب کو دیکھتا ہو۔ تو ہی باغون میں جا کے غنچوں کو ہنسائی اور نو نہالان چمن کو از خود زلفہ کر کے وچڑیا لے آتی ہے۔ تو ہی سمندر کے پانی میں ایک خفیف حرکت پیدا کر کے عدم کے ایسے سناٹے کو مٹاتی ہے۔ تو ہی صحراؤں میں چل بہر کے ریگ روان کو مٹی چاں چلاتی ہے۔ دنیا کے جھللاتے ہوئے چراغ اور صحبت ہائے عشرت کی سمیں تیرے ہی پہونکنے سے گل ہو جاتی ہیں۔ اور عالم کی رات بہر کی غموشی تیری ہی شمع ادا یوں سے دور چوٹی ہے۔ تو آشیانوں میں جا کے طیور کو چو نکھاتی اور مسجدوں میں آکے زما کو اٹھاٹھاتی ہے۔ تیری ہی تنگی پاس کے پھلے کے گشت کرنے والے سو جاتے ہیں۔ اور تیری ہی چیر چھاڑ سے وصلت نصیبوں کا بسط آباد کرنے والی حور دشین بالوں کو سمیٹتی اور دو پٹوں کو سنہالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ آہ اکیسی اچی اچی جگہ تیرا گزر ہوتا ہے۔ اور تو کیسی کیسی لطف کی صحبتوں پر پہونچ جاتی ہے۔ تو آزادی کا نمونہ۔ مجنون کا بیباک ہاتھ۔ باہاری تھا ہے۔ تو عشرت پرستوں کی رقیب۔ خود پرستوں کو اُبارنے والی۔ اور ہجران نصیبوں کی یار با صفا ہے۔ اور اسی لبر بلاکشان ہجران تہہ سے کیسے کیسے آرزو مند می کے کام لیتے ہیں۔

تجھے وطن آوارہ اپنے گھر۔ ہجران زدہ کو سے جانان میں اپنا پیام دے سکے بھیجا کر اور تو جاتی ہے۔ تجھے داغ دے جانے والے کا سو گوارا اسکی پاس حبت میں۔ اور جو ان مرگ سے جبین کا دلدادہ اسکی قبر پر اپنا سلام پہونچانے کی درخواست کرتا ہو اور تو پہونچاتی ہے۔ فلاکت زدہ شاعر کی ساری امیدیں تیرے دم کے ساتھ ہیں۔ اور ہجران زدہ شکش کی زندگی تیرے ہاتھوں پر۔

## شعر و سخن

شاعری وہ قدرتی جذبات ہیں جو انسان کے دل کو پوری قوت اور ایک

بے مثل کشش سے انہی طرف کھینچ لیا کرتے ہیں۔ یہ جذبات قدرتی اور فطری طور پر خود بخود دل میں پیدا ہوتے ہیں اور زبان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں کوئی تعلیم اور کوئی کوشش انکو نہیں پیدا کر سکتی۔ اسی سبب سے ایک معمولی شاعر اور بالکل نو مشق سخن گو کہی ایسے موثر اشارے کہ لہجہ آہستہ جھلکے اگر بڑے بڑے اساتذہ کے دیوان مٹ کے رہ جاتے ہیں۔ اگر دنیا میں کوئی سچا جادوہر اور اگر دل کو قابو میں لانے والی کوئی تسخیر ہے تو وہ یہی شعر و سخن ہے۔ خیال کیا گیا ہے اور سچا خیال ہے کہ موسیقی ہی ایک چلتا ہوا جادو ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو موسیقی کی قوت بڑا بے مین بھی زیادہ کام شعر و سخن سے لیا جاتا ہے موسیقی صرف اس وجہ سے جادو کا اثر نہیں رکھتا کہ عمدہ سرودن اور پیارے گلے سے کام لیا گیا۔ بلکہ اسکا جادو وہی محض اسی وجہ سے بخاطر ہے کہ گلے بازی کی شگفتگی و شعر کے میدان میں دکھائی گئی۔

پیارا گلہ آواز کی دلکشی و دونوں خوب چیریں ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ اگر صرف انہیں سے کام لیا جائے تو بھی دلچسپ و جادوئی اور از خود زندگی کا عالم طاری ہوگا لیکن انہیں جو کچھ اثر ہے اسکو صرف پیاری صورت سے لگاؤ ہے جو جادو موسے پریشان یا کسی دل از دست دادہ پر جبین ناز کسی حسن پرست پر۔ نگاہ شوق جگر صد چاک پر۔ اور تمام حسن کی او میں قدر و انان حسن پر ڈالتی ہیں وہی جادو پیاری آواز اور دلربا تانین انسان کے دل پر ڈالتی ہیں۔ موسیقی اصل میں اسی دلفریب آواز کا نام ہے جو کسی جوش و ش کے پیارے گلے سے نکلے سننے والوں کے کانوں تک پیام حسن پہنچاتی ہے جسکو ہندی کا سخن سنج اپنے نیم چل مذاق میں ”میٹھے بجن سہاؤن بولی“ کہتے ہیں۔ موسیقی نے اُس میں جدت پسندی کے ساتھ اتنی ترسیم کر کے انسانی کمالات کا بیش بہا نمونہ دکھایا کہ مختلف تجربات کی بنا پر اور قدرتی جذبات کا بہت سچا اور نازک اندازہ کر کے پتہ لگایا کہ آواز کی کون کون سی اسکا کون سر اور کون سی دھن کس سین میں اور کس وقت زیادہ ہلکی اور زیادہ موثر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس امر پر بھی غور کیا گیا کہ مختلف آوازیں اور سُر جو انسان کے گلے سے نکلتے ہیں۔ اگر ان کی ترتیب میں ایک عمدہ انتظام اور انجمنٹ

قائم کیا جائے تو دلفریبی اور خوش آئندگی کا اثر بدرجہا زیادہ ترقی کر جائے گا  
میں خیالات تھے جو اصول کی حیثیت سے ترتیب دیے گئے اور جن کا نام موسیقی  
رکھ دیا گیا۔

لیکن موسیقی کا زیادہ اور ابتدائی حصہ چونکہ نغموں اور سُرُون کی ترتیب پر منحصر تھا  
لہذا اسکی بنا نظم ہی کی سطح پر قائم کی گئی۔ اسلئے کہ نظم کلام میں خود ہی ایسی  
ترتیب پیدا کر دیا کرتا ہے جس کی بنا پر کلام بغیر کسی قسم کی وقت کے سُرُون کو عمدہ  
ترتیب سے ظاہر کرتا چلا جاتا ہے۔ نظم کو اگر اس کی حد پر دیکھیں تو اُس میں دو مہین  
ہیں۔ ایک تو موزونیت جسے سُرُون اور انغموں کی عمدہ ترتیب ہی کہنا چاہیے۔  
دوسرے شعر یعنی وہ خیالات جو دل انسان پر پورا اثر ڈال دیں۔ اور اسے  
اور اور واقعات کو یاد دلادیں جو دلی جذبات کے قوی محرک ہیں۔ اگرچہ موسیقی  
میں نظم ابتداً صرف موزونیت کی ضرورت سے لیا گیا تھا۔ لیکن ضمناً اُس کے  
ساتھ وہ موثر خیالات اور جذبات دل کے اُبھارنے والی کیفیتیں بھی آگئیں۔  
اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ موسیقی کی زبان نظم ہے اور موسیقی کے موثر ہونے کا قوی  
سبب نظم ہی ہے۔ خرابی یہ ہوئی کہ عرض اور موسیقی دو جدا گانہ فن ہو گئے ورنہ  
اگر دونوں کو باہم ملا کے ترتیب دیکھتے تو دونوں کے جذبات اور دونوں کی شہ  
نظر بار درجہ زیادہ ہو جاتی۔ اس تفریق کی وجہ غالباً بلکہ یقیناً اسلامی دور ہے۔  
اسلام موسیقی کو حرام اور نظم کو جائز بلکہ بعض موقعوں پر موجب ثواب بتاتا تھا جس  
وجہ سے علوم میں ترقی کرنے والوں کو حرام و حلال میں تفریق کرنے کی عرض سے  
بڑی احتیاط کے ساتھ دونوں فنون کو جدا کرنا پڑا اور یہ دونوں فن ایسے ہو گئے  
کہ ایک سے دوسرے میں بالکل مدہمین لی گئی۔ ہمارے خیال میں اس احتیاط نے  
نظم کو ضرور نقصان پہونچایا۔ لیکن موسیقی کے شائق چونکہ شرع اسلام کی پابندی  
اور احتیاط سے کام نہیں لیتے تھے لہذا انہوں نے اپنے نغموں کی بنا نظم ہی پر  
قائم کی۔ آج جو یہ تم دیکھتے ہو کہ موسیقی میں تھوڑا بہت اثر ہے ہی لیکن  
نظم میں جتنا اثر چاہیے تھا اُس کا عشر عشر بھی نہیں۔ یہ سب مہین قدیم محتاط ترقی  
کرنے والوں کے خیالات کا نتیجہ ہے۔

سہر حال پہلا جادو جو انسان پر چلا وہ نظم ہے۔ اگر ہم نظم کی عام ہٹری نظم  
ڈالیں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ نظم سے چنے اور ہم سے نظم نے دنیا میں  
کیسے کیسے عجیب و غریب سخت و دشوار۔ بلکہ غیر قابل برداشت کام لہو ہیں۔  
متنبی کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ اُس نے اپنے ایک قصیدہ کا جادو ڈال کے تاجروں  
کے ایک گروہ کو ایک قوی و زبردست فوج سے لڑا کے کٹوا دیا تھا گو خود بہاگ  
کھڑا ہوا۔ اس سے بڑھ کر یہ ہو گا کہ داؤد (علی نبینا و علیہ السلام) اُس خدا کے  
پاک اور معصوم بندے کے نظم ہی کے اثر سے خدا۔ اس خلاق عالم کو راضی  
کیا تھا۔ اور یونان و روم کے بت پرستوں نے سنی سنی اپنی دیویوں کو اپنی  
طرت متوجہ کیا۔ ہندوستان کے دیوتاؤں کے سامنے ہی اسی موثر جادو سے  
کام لیا گیا اور مسیحی دنیا کے گریک۔ کیتھولک۔ بلکہ پراٹسٹنٹ چرچ میں بھی وہ  
مقدس نظموں کی وضع سے نمودار ہوا۔

ابھی نظم کے اثر سے دیکھنا باقی ہیں۔ گو اُس میں نغمہ شریک ہے لیکن انصاف  
تو یہی ہے کہ اثر میں زیادہ دخل محرک جذبات خیالات کو ہے۔ گو نغمہ اور رنگ کی  
تناسب اُمین اور قوی کر کے شراب و آتش کی خاصیت پیدا کر دی۔  
امر کے دل میں فیاضی کا جوش پیدا ہوا اور انہوں نے غم یا کو خدا جانے کیا کچھ  
وے ڈالا۔ سپاہی کے دل میں ایک حرارت پیدا ہوئی اور اس بتیابی کے جوش  
سے کہ نجوشی خاطر جان دینے پر تل گیا۔ عبادت گزار کا عبادت میں دل لگ گیا  
اور مقبولیت کا اُسے کچھ ایسا یقین ہو گیا کہ انتہا سے زیادہ رقت طلب سے رو  
رہے کے دعا سے مغفرت مانگنے لگا۔ مہمان حسین اگرچہ ہرے ہی بیٹھے تھے لیکن  
کچھ اس بتیابی سے پھوٹ پھوٹ کے روئے کہ اکثر وں کو غش آگیا۔ ظالم بادشاہ  
کا نیچر اگرچہ ظلم ہی کی طرف مائل تھا لیکن اُسے یک بیک کسی ہتلاے ظلم پر اس  
آگیا اور وہی مظلوم اُسکے دربار سے خلعت و اکرام سے سرفراز ہو کے  
اپنے گھر گیا۔

زادہ خشک ان سب کی نسبت زیادہ بے حس معلوم ہوتا تھا اُس پر کچھ ایسا عالم  
وجد طاری ہو گیا کہ انسانیت سے گزر گیا اور ہرے مجمع میں کھڑا ناچ رہا ہے

عشاق خستہ جگر کو تھوڑی بہت تسلی ہوئی تھی کہ یکایک انہوں نے پہرے کا  
 فکاب دوز آہ کی بجائی۔ کلیجا ہاتھوں سے تھاما اور دھم سے زمین پر آ رہی تھی۔  
 روپاب از کرنے والے جفا شعار گو کہ اپنی بے پروا طبیعت کے ہاتھوں سے  
 کی کچھ نہیں سنتے تھے۔ ان کا بھی دل خود بخود پیچھا اور کسی حیران زدہ کی صورت  
 پر سے تیور دن سے دھیتے ہی دھیتے ذرا نرم ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ  
 پیچھا آ گیا کہ بے اختیار بڑھ کے گلے میں باہن ڈال دیں۔ اور جفا کار سے دفا شعا  
 بن گئے۔ یہ ایسے تغیرات اور یوں شکم بجاتے میں کیونکر ہو گئے۔ یہ تین  
 کس طرح بدھین؟ اور ارادوں میں کیوں الباقی فرق آیا؟ صرف اس لیے کہ سب پر  
 نظم و نغمہ کا جادو چلا گیا۔ ان سب مقامات پر موثر اور جادو ہر سے شعر کہی نصیبی  
 کی حیثیت سے اور کبھی مرثیہ کے رنگ پر۔ کبھی مناجات کی وضع میں اور کبھی  
 رجز خوانی کے پردے میں۔ کبھی مٹیابی اور جذبات عشق ظاہر کرنے کے لیے اور کبھی  
 حسن عالم آشوب کی من سرائ میں سننے گئے۔ اور انہوں نے اپنا ایسا کاسیانی کا  
 اثر نمایان کیا کہ جس کام کے لیے انکا جادو چلا گیا تھا فوراً پورا ہوا۔

بہت وہ بھی منکا جسم تھک رہے اور وہ بھی جن کا دل تہہ کا ہے دونوں پر اگر  
 کوئی جادو کار گر ہوا ہے تو وہ اسی نظم کا جادو ہے۔ تینے دیکھا ہو گا کہ عالیشان  
 مندر وں میں جان عجیب و غریب سورتیں اس پر دروکار عالم کی منظر قدرت  
 خیال کی جاتی ہیں وہاں نظم کا جادو بڑھا جاتا ہے اور لوگ ذوق و شوق سے  
 اس جادو بہری جادو سے کے ساتھ اپنی تمنائیں اور آرزوئیں ظاہر کر رہے ہیں  
 وہ جادو اپنا اثر نمایان کرتا ہے اور آرزوئیں برآتی ہیں۔ تینے ہی دیکھا ہو گا  
 کہ وہ آفت زدہ مسیح مصلوب کی تصویر کے سامنے نہایت رقت قلب کے ساتھ  
 کھڑے زار و قطار روتا جاتا ہے اور چرت آرائی کے نعون کے ساتھ اپنی تمنائیں  
 ظاہر کرتا جاتا ہے۔ خدا اسکی آرزوئیں ہی باقی نہیں رکھتا۔

نظم حقیقت میں جادو ہے۔ اس سے آپ سب قسم کا کام چاہیں لے لیں۔ بنے  
 ہوئے کو بگاڑنا اور بگڑے ہوئے کو بنانا دونوں کام اس سے پورے ہوتے ہیں  
 ایسی تاثیر دنیا کی اور کسی چیز میں نہیں ہے جیسی کہ نظم میں ہے۔ اور نظم ہی وہ چیز ہے کہ



موسیقی کے جادو کو آئینہ نشیں ہو۔  
 دنیا میں دو چیز ہیں۔ یادہ موثر مانی گئی ہیں۔ حسن۔ آواز۔ ان دونوں کو اکثر  
 عقلا جادو ہی تصور کیا کرتے ہیں۔ اور ہر ان تک خیال کیا جاتا ہے ہیں بھی یہ  
 دونوں چیزیں گویا جادو ہی حسن تو نیز اپنے جذبات سے جو کیا اثر ان کے  
 دلوں پر کیا کرتا ہے۔ اسکا حال لوگوں کو معلوم ہی ہوگا۔ باقی رہی آواز۔ اگر یہ  
 ہماری آواز کی کشش نے بہتوں کو زخود زخمہ کر دیا ہوگا۔ لیکن اس کا اثر  
 صرف اس نغمہ کی وجہ سے تھا۔ جس سے موسیقی میں کام لیا گیا اور جو نظم کی جان  
 ہے۔ اس میں کسی کو شک نہیں کہ موسیقی اور دراصل سچی موسیقی وہی ہے جسکا نامور  
 اس ولکش آواز کے ذریعہ سے ہوا۔

ان دونوں چیزوں میں جتنا اثر ہے وہ بدرجہا زیادہ ہوتا ہے جب نظم سے مدد  
 لی جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہی خیالات جو اپنی مدد پر فی نفسہ جادو کا اثر نہ کرتے  
 تھے جب کہ آئینہ نشیں صورت اور حسن صوت کے تھرے جادو لگنے تو یہ سب سے کہ  
 قیامت ہو گئی

## افریقہ میں مسلمانوں کی کامیابی

مسلمانوں کی عجیب و غریب فتوحات میں ایک واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے  
 بننے افریقہ کو ہمیشہ کے لیے انکی قسمت میں لکھ دیا اور وہ ان کے لوگ اپنے  
 زمانہ میں ایک زمانہ میں ایک گوشہ نشین کرے مگر وہ دین اسلام سے نہیں پرہیز کرتے۔  
 اس سے قبل یونانی زبان اور ان کی طائفہ نے افریقہ کی قوموں کو عیسائی بنا کر  
 اپنا مطیع کر لیا تھا۔ اگرچہ شام اور ایشیا مینر کی ٹریبون میں مسلمانوں نے ہر قلوب  
 شاہنشاہ روم کو مطیع اور پائیکہ کر دیا تھا۔ اور اس میں اتنی قوت نہیں باقی رہی  
 تھی کہ ان اسلام کے مقابلہ کا خیال بھی کر سکے۔ لیکن وسط افریقہ کی بربری قوموں  
 پر بنیاد یمن اور دین عربی کا اثر پڑا ہوا تھا۔ گو نصیر نے انکی اعانت نہیں کی۔ بلکہ  
 یونان لہنا چاہتا تھا کہ نہ کر سکا۔ مگر وہ ان کی قوموں نے بے ضابطگی ہی کے جوہر سے

خلفاء کی فراہمیت میں ایک آخری کوشش دکھادی۔ اور اس کوشش میں  
ایک حد تک انہیں کامیابی ہوئی۔

لیکن اس واقعہ کے شریعتی ہونے سے پہلے در اس عہد کی ایک مختصر سی تصویر  
تو دیکھ لیجئے۔ اسلامی بھادری کے شباب و عروج کا زمانہ ہے عرب ہمسایوں  
نے ساری دنیا کو مطیع کر لیا۔ جناب یالت کے صحبت یافتہ گونہین درجہ ہے  
نہ وہ ہیں وہ خوب خوب رہا فشانیاں دکھا کے اسے نام کو چار دانگ عالم میں  
نور کر چکے اور اب خانہ کعبہ پر جو۔ دل میں بیٹھ کے یا د الہی میں تغول ہیں  
نہ وہ فون کے سینے میں حرارت دینا ہی کسی آگ شعلہ زن ہوئی ہو انہوں  
نے ترقی اسلام کا جذبہ اپنے کندھوں پر رکھا ہے اور ڈبو نہ دیتے پھرتے ہیں  
کہ کوئی موقع ملے جہاں جابنازمی کا امتحان دے کے استحقاق ہو ان ملازمین  
ماتما آباء دنیا پر ظلم سلام لہر رہا ہے ان غیر آباد اور وحشیوں سے برہی ہوئی  
چند ستر مینین نظر آتی ہیں جسکی طرف وہ وطن کی خوبیاں اور مہذب دنیا کی لذتیں  
اور دسایٹیاں چھوڑ چوڑ کے جاتے ہیں کہ اور کہیں نہیں تو ہمیں ہی۔ ہاتھ  
پاؤں سے مشق پہ گری تو نہ چوڑے اور دل میں جوش جہاد تو نہ پھیکا پڑے۔  
دشوق کے تحت خلافت پر بنی اسہ میں کا با جبروت خلیفہ عبدالملک بن مروان  
چلوہ آ رہے اور اس کی اولوالعزبان دنیا سے اسلام کو ہر روز ایک نئی فتح کی  
نہ خبری سناتی ہیں۔

طراس و قوافیہ کی لڑائی میں مقتدا سے نصارا اگر گوری کو شکست ہو چکی ہے۔  
اس کی بھادریا نہیں اور ذی طہ لڑکی اپنے باپ کے قافلہ عبداللہ بن زبیر کے  
پہلو کو آباد کر رہی ہے۔ اور نا کامیابیوں کے بعد فریقہ و بربر کے صحرا نشینوں نے  
روہوں کی کمک سے مایوس ہوا اپنی آزادی بچانے کی خود اپنی قوت کے بہرہ  
پر ایک جدید کوشش کی ہے یہ کوشش کیونکر کی گئی؟ سنئے

افریقہ میں ان دنوں ایک عورت تھی جو دعویٰ نبوت کرتی تھی نبوت کا دعویٰ  
جو مانہ ہو گا اتنا ضرور تھا کہ غیب کی باتیں بتاتی تھی اور معجزات پیشین گوئیوں کا  
ادعا تھا۔ اس عورت کا نام موزنین کاہنہ بتاتے ہیں۔ اب خدا جانے یہ نام کس

یاقوت کا انسانی لقب۔ خیر جو کچھ ہو وہ قدیم بت پرستی کی پابند تھی اور تمام بربر کے  
 وحشیوں کو اپنی طرف سمیٹ کے اُسے مقابلہ کا جہد بلند کیا وہ وحشی جو  
 اوپر اوج نہ نہتے تھے اور ایک بے صوابگی کے عالم میں مارے مارے بہرتے  
 تھے انہیں اُسے ایک باضابطہ فوج میں مرتب کیا۔ اور مقابلہ کے لیے لے گئے  
 برہی کا بہنہ کوئی معمولی عورت نہ تھی۔ بلکہ اہل بین دیان کی ایک ملکہ تھی  
 حسن والی افریقہ کی فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ اور ایسی سخت شکست مسلمانوں  
 کو چولی کہ بقول گلبن کے ایک صدی کی فتوحات پر پانی بہ گیا عربی  
 سرداروں نے مجبوراً افریقہ کو چھوڑ دیا اور پلٹ کے مصر کی دودھین  
 لے گئے۔

اس فتح نے کاہنہ کا درجہ اور دماغ بہت بلند کر دیا گمراہ عیسائی سفیرات نے بی  
 کاہنہ کو کچھ ایسی عجیب غریب پالی سکھا دی تھی کہ مسلمانوں نے اس شکست پر  
 کچھ مسلمان ہی نہیں افسوس کرتے، بلکہ عیسائیوں اور دنیا کی تمام مہذب  
 قوموں کو ردنا پڑتا ہے۔ بی کاہنہ نے تمام سردارانِ مرافہ اور بربر کو فراہم  
 کیا اور ان کے سامنے ان الفاظ میں اپنی وہ عجیب و غریب وحشیانہ پالی  
 ظاہر کی ”ہمارے شہروں میں جو سونا چاندی ہر اسی لی طمع میں ہمیشہ اہل عرب  
 ہتیار باندہ باندہ کے آیا کرتے ہیں۔ مگر ہمارا حوصلہ کچھ ان ذلیل چیزوں کے  
 لیے نہیں ہر ہم روئے زمین کی سامی اور معمولی پیداوار ہی میں خوش ہیں  
 آؤ۔ ان سب شہروں کو سمار کر دیں اور ان تمام دولت مند کے خزانوں کو ان  
 سمار شدہ شہروں کے کندھروں اور ویرانوں میں توپ کے صنایع کر دیں جب  
 ہمارے دشمنوں کو اپنی طمع میں سو اٹھسی اور لاکھاری کے اور کچھ نہ نظر آئے گا  
 تو غالباً اپنا سرمایہ کے چلے جائیں گے۔ اور ہماری جنگ جو قوم کے اطمینان میں  
 خصل انداز نہ ہونگے“ اس تجویز پر ہر چار طرف سے صدائے تحقیر و آفرین بلند  
 ہوئی اور بڑے جوش و خروش سے یہ امر منظور کیا گیا۔

اس کی تعمیل سبب جاہلانہ اور ہیبت ناک طریقہ تھا۔ ظنہ سے (جو افریقہ کو اپنا  
 ارض خرب میں واقع ہے) طرابلس تک کل عارتین منہدم اور سمار کر دی گئیں

یہودی گرنہ تھا جو بیچ رہا ہو جسے کہ قلعہ بھی توڑ پھوڑ کے برابر کر دیے گئے  
 ہاں سے بیان تک جتنے ہلدار و زنت تھے سب کاٹ کے گرا دیئے گئے  
 الغرض ہلدار کے جتنے ذریعہ تھے ان عقل مندوں کے ہاتھوں سب نثار ہو گئے۔  
 مختصر یہ کہ جو سرزمین تروتازہ اور شاداب باغ کی حیثیت پرستی تھی  
 ایک لح ووق صحرا بنا دی گئی۔ اوپر پچھلے مورخوں کو اکثر ان لوگوں کی فحاشت  
 اور اس عہد کی تباہی و بربادی کے سٹے سٹے آثار آج بھی جا بجا نظر آتے  
 ہیں اور حسرت کا سماں دیکھ کے متاثر ہو جانے والے آج بھی وہاں جا کے  
 آنسو بہا آتے ہیں۔ افریقہ کے یہ بلاد جو سواحل بحر روم پر واقع ہیں اصل  
 میں نہایت ہی زرخیز اور سرسبز و شاداب واقع ہوئے ہیں۔ مگر انکی دولت مند  
 کی ان انون شہرت تھی۔ مگر کاسینہ کے ہاتھوں وہ ملک بالکل تباہ و برباد ہو گیا  
 در ایام تباہ ہو کر زمانے نے اتنے دنوں میں بہت سے حکمرانوں کو کھائے۔ مسلمان  
 تو میں بارہ سو برس کے بعد ضعیف ہونے لگیں اور بر عظم افریقہ کے گورنر  
 دواں یورپ سے جہاز چکر لگانے لگے۔ مگر اس عہد کی تباہیاں آج بھی اسی  
 طرح نمودار ہیں۔

انگریزی و زرخیز اعتراض کرتے ہیں کہ اہل اسلام کو چونکہ عموماً خلافت عقل بانوں  
 سے انیس سو ہزار انہوں نے کاسینہ کو بھی ایسا ازام دے دیا وہ کہتے ہیں  
 اس سے تین سو برس پہلے جو تباہی و نڈال وغیرہ تو مومن کے ہاتھوں سلطنت  
 روم کو وزیر اس کے ماتحت مالک کو نصیب ہوئی تھی اس میں کاسینہ کی پاسی  
 نے شاید کچھ اضافہ کر دیا ہو گا۔ مگر یہ نہیں قیاس میں آتا کہ اسنے سارا ملک  
 کیونکر تباہ و برباد کر دیا مگر ہمارے نزدیک مسلمان مورخوں کا بیان اتنا حیرت انگیز  
 نہیں ہے جتنا کہ ان پہلے اصحاب الراے مورخین یورپ کا انکار حیرت خیز ہے  
 مسلمان اس سے بہت پہلے سرزمین افریقہ کے مالک ہو چکے تھے انہوں نے  
 طرابلس میں گریگوری اور اسکی بیٹی کی نوجوان کو شکست دی تھی اور ان کا  
 نامور سردار عقبہ بن نافع مراغہ کی سرزمین طے کر کے افریقہ کے مغربی سواحل پر  
 ہاکڑا ہوا تھا۔ جہاں اسنے سمندر میں گھوڑا ڈال دیا تھا۔ اور درگاہ جناب بابی

میں کمال خلوص و جوش غرض کیا تھا کہ ”بارالہا اگر یہ سمندر سرد راوند موتا  
 کو جان تاکہ زمین پانی میں تیرے مبارک نام کی پوہمین سناری کرنا چلا جائے  
 بہر حال کاہنہ لے قبضے میں آنے سے پہلے مسلمان افریقہ کو دیکھنے کے  
 کیا انہوں نے نہ دیکھا ہوگا کہ سارا افریقہ پیشتر ہی سے تباہ و ویران پڑا ہے  
 اور جب دیکھا تھا تو پھر انہوں نے جان بوجہ کے کاہنہ کو کیوں ملزم ٹھہرا دیا تھا  
 اگر زبردستی ہی الزام دینا تھا تو انکی تاریخوں میں ایسا الزام کسی اور کو کیوں  
 نہ دیا گیا ہم یہ نہیں سمجھتے کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے محفوظ رکھنے کے لیے ملک کا  
 ویران کر دینا بعد از قیاس ہی کیوں کر۔ دنیا کی تاریخ جانے والوں کے بارے  
 دیکھا جائے گا کہ اکثر فرزند اداؤں نے حریف کے ہاتھ سے بچائے یا اسکے فائدہ مند  
 نہ ہونے کی غرض سے اکثر شہر سمار کر دیے۔ اور وحشی قوموں کا تو یہ عام دستور  
 ہے۔ ورنہ ال اور کالیا والوں نے کاہنہ سے پہلے ملکوں کو تباہ و برباد کیا۔ تباہ  
 کر دینا کوئی ایسا امر نہیں ہے جو ایک شہر یا انسانی خیر کے خلاف ہو۔ ہماری غرض  
 اس تحریر سے یہ بتانا ہے کہ عیسائی موزیوں اپنے قیاسی محاکمین پر تاریخ کو اور  
 خصوص غیر قوم کی تاریخ کو ایسا آلٹ پلٹ کر دیا کرتے ہیں

افرنس کاہنہ نے چند روز کی حکومت میں اپنی صدیوں تک نہ ٹٹنے والی اور  
 ہر دور مند کوڑ لانے والی یادگارین خوب نکالیں کو نہ پہونچائی تھیں کہ جس سے  
 بعد موسیٰ والی مصر فوجین لے کے پہونچا اور عربی گھوڑے جوش و خروش کے  
 ساتھ مغربی افریقہ کی طرف بڑھے۔ ہمیں کوئی شک نہیں کہ کاہنہ کی ان حرکتوں نے  
 اسکی طرف سے عام ناراضی پیدا کر دی تھی اُس کے ہمراہیوں میں سے بھی  
 وہ لوگ جو سوسائٹی اور تمدن کو پسند کرتے تھے حیران ہو گئے تھے۔ وہ شوق اور  
 غلبہ کی آنکھوں سے کسی ایسی قوت کا انتظار دیکھ رہے تھے جو اُن کے ملک کو  
 اُن تباہیوں سے بچائے۔ انہوں نے رومیوں کی طرف نظر دوڑائی مگر ادھر  
 حوصلہ پست تھے۔ اور مسلمانوں کی دہشت سے رومیوں اور یونانیوں کو مدد  
 کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ آخر وہی لوگ پھر مشرق کی طرف سے بڑھتے نظر  
 آئے جو ابھی شکست اٹھا چکے تھے۔ کاہنہ کی فوج سے اور مسلمانوں سے سخت

مقابلہ ہوا۔ لیکن اہل بربر کو امتحان ہو گیا کہ مسلمانوں نے افریقہ کو چھوڑ دیکر  
کے لیے نہیں فتح کیا تھا۔ بربری اور راعہ والے پسپا ہونے کے بجائے کھائے  
مسلمانوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئی اور اپنے جرائم کی پاداش میں سپہ سالار  
عساکر اسلامیہ کے سامنے قتل کی گئی۔ اپنی ملکہ کی آخری تقدیر دیکھ کے وہ  
بھی جو اس کے دلی ہمدرد تھے سحارا اور ریگستانوں میں منتشر ہوئے اور  
بہر کوئی قوت مسلمانوں کے مقابلہ کو نہ آئی۔ جسکے بعد انہوں نے مشرق  
مغرب تک تمام شمالی افریقہ پر اپنا قبضہ کر دیا۔

اس فتح کی بہت شہرت ہوئی مسلمانوں نے تین لاکھ آدمی افریقہ میں  
پہلے غلام بنائے۔ پھر تین سے ساٹھ ہزار غلام بطور مال فروش کے دارالرشید  
و مسنون میں بھیجے گئے۔ اس تعداد پر وجود وہ زمانہ معترض ہو گا۔ لیکن مسلمان جن  
لوگوں کو غلام بناتے تھے سو اس کے کہ ایک آزادی کو انکے پاس ہو جاتی تھی  
باقی تمام پیشہ وارانہ سے وہ نہایت خوشحال اور مطمئن رہتے جاتے تھے۔ انکی  
دولت کا اظہار غلاموں ہی کی وضع و لباس میں کیا جاتا تھا علاوہ بربرین روم  
ایرمان و لہ و کنا۔ قدس مجاہدین دین عیسوی کا دہن ہی ان کو ن بلکہ اس  
ماند کے بہت بعد تک اس اعتراض سے پاک نہ تھا۔ اور اصل یہ کہ بردہ فروشی  
کی اہمیت نہ ہونا اگر کسی مذہب کو ملزم ٹھہرا سکتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی مذہب  
اس الزام سے بری نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بعض راویوں کی بنا پر تو کہا جاسکتا ہے کہ صرف  
اسلام ہی محفوظ ہے۔

تینا سے افریقہ میں سے جو لوگ غلام بنائے گئے انکے علاوہ تیس ہزار بربری  
نوجوانوں کا نام اسلامی فوج کے ریٹیر میں درج کیا گیا۔ اور مجبور کیے گئے کہ ضرورت  
کے وقت علم اہل دین کے لیے بھیجے کہڑے ہو کے دشمنوں سے مقابلہ کریں۔

دسی گئے یہ بھی کوشش کی کہ تمام افریقہ پر دین اسلام کا اثر پڑ جائے چنانچہ  
کل افریقہ والوں کو تسلیم قرآن دلانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اور چند ہی روز میں  
انکو اس قابل بنا دیا کہ جناب رسالت صلعہ اور خلیفہ وقت کے سچے اطاعت  
ہوں۔ وہ عموماً مسلمان ہو گئے۔ اور وضع و رفتار میں بالکل بدوی عرب بن گئے۔

مذہب کے ساتھ اُنکو اس فخر کے حاصل کرنے کا بھی شوق ہوا کہ عربی زبان عربی نام اور عربی اصول کو اختیار کریں۔ چند ہی روز میں وہاں کے باشندے اور فاتح عمانون کا خون مل جل گیا۔ اور یہ معلوم ہونے لگا کہ گویا دریائے فرات سے لے کے بحر مغرب تک ایک ہی قوم ایک ہی وضع اور ایک ہی خیال کی تمام صحارائے ایشیا اور افریقہ میں آباد ہے۔ اور دنیا کی اتنی وسعت تک پہنچتی چلی گئی ہے۔ باوجود اس کے کہ افریقہ والے گویا عرب ہو گئے تھے۔ مگر اسپر ہی عربوں نے اس قدر اُس ملک کی بود و باش اختیار کی تھی کہ دریائے نیل کی ترائیوں میں خالص عربی نسل کے لوگوں کے پچاس ہزار تھیمے پڑے ہوئے تھے۔

افریقہ والے عربوں سے اس قدر مل جل گئے تھے یا عربی سائین اس قدر وہاں کی قدیم رعایا پر غالب آگئی تھیں کہ ایک ہی صدی کے بعد دارالخلافہ اسلام میں یہ رپورٹ والیان افریقہ کی طرف سے پیش ہوئی کہ اب جتنے لوگ ہیں سب نسل عرب سے ہیں اور کل مسلمان ہیں لہذا خبر یہ موقوف کیا جائے کیونکہ بیان کوئی نہیں جب سپر خبر یہ واجب الادانہ۔

## محرز و دانان دگلڈ از

آپ کو دگلڈ از کے حساب کا خیال رکھنا چاہیے۔ روز بروز تجربہ ہوتا جاتا ہے کہ آپ اپنے فرائض سے غافل ہیں۔ حالانکہ اصل یہ ہے کہ یہ غفلت خود آپ ہی کو ضرر پہنچانے والی ہے۔ چاہت یہ بخوش نتیجہ آپ کے خیال میں نہ ہو۔



# فہرست کتب دفتر و گلہ از و مہند

۴۰	صبح آمید	مولوی عبدالحلیم صاحب
۴۱	المامون مع البحرہ	کتاب عزیز در جہا - ۴۱
۴۲	ترجمہ ناول رینالڈز	منصور موبہا - ۴۲
۴۳	سوزن عشق	حسن ایچلسا - ۴۳
۴۴	عسرت وصل	وگلہ از - ۴۴
۴۵	جنت الفردوس	وگلہ از ۱۹۱۶ - ۴۵
۴۶	غوبی قسمت	زیاد - ۴۶
۴۷	راز و نیاز	شہید وفا - ۴۷
۴۸	نیرنگی فلک	دلیپ ہر دو حصہ - ۴۸
۴۹	بت سیمین	وسف نجمہ حصہ اول - ۴۹
۵۰	نیرنگ	در گیش ندنی - ۵۰
۵۱	جہانگیر	دلکش ہر دو حصہ - ۵۱
۵۲	متفرق ناول قابل دید	مولوی نذیر احمد صاحب
۵۳	دلفکار	ابن الوقت - ۵۳
۵۴	رزم بزم ہر دو حصہ	موعظ حسنہ - ۵۴
۵۵	نازک ادا	مرآة العروس - ۵۵
۵۶	سلطان	بنات انش - ۵۶
۵۷	نادین ہر دو حصہ	توبہ الصوح - ۵۷
۵۸	نشتہ	پندت رتن ناٹھ صاحب
۵۹	اختر حسینہ ہر دو حصہ	فسانہ آزاد نمک در چار جلد - ۵۹
۶۰	عقد الجواہر	جام سرشار - ۶۰
۶۱	دلبر	خدا کی فوجدار - ۶۱
۶۲	حاجی بابا صفہانی	کاسنی - ۶۲
۶۳	فسانہ دلپذیر	طوفان بے تیزی حصہ اول - ۶۳
۶۴	آدین و لیلی	مولوی شکیل صاحب



فریب محبت - ۱۲  
 طلسم حیرت - ۱۲  
 کرشمہ قدرت - ۸  
 جذبہ عشق - ۸  
 دام محبت - ۱۲  
 کوچک باختر - ۷  
 تواریخ اردو قابل دید - ۷  
 اعمال نامہ ڈوکس - ۷  
 تاریخ اسپن کی پہلی جلد - ۹  
 جنگ ہفت سالہ - ۶  
 تاریخ فرشتہ - ۷  
 ارشاد الملک - ۷  
 تاریخ بغاوت ہند - ۷  
 سیر المتاخرین - ۷  
 تواریخ سلاطین - ۷  
 آثار الصنادید مولفہ جناب احمد خان - ۷  
 حسن نقص - ۳  
 دقائع نگار انگلستان - ۷  
 یادگار ہندی - ۸  
 طب اردو - ۷  
 طب احسانی - ۳  
 علاج الغربا - ۹  
 کلیات سیدی فن اول - ۱۲  
 علاج الموشی - ۳  
 کلیمات و دواوین - ۷  
 کلیات موت - ۱۱  
 کلیات سودا - ۷  
 کلیات انشاء اللہ خان - ۷  
 کلیات طالب - ۷

ثنوی گلزار نسیم - ۷  
 ثنوی یوسف زلیخا - ۷  
 دیوان یاس - ۷  
 ثنوی صبح خندان - تسلیم لکھنوی - ۷  
 گوہر تفتیش - ایک عمدہ حرب زمانہ ثنوی - ۷  
 سانی نامہ عشق شقیہ - ۷  
 دل و جان - ۷  
 متفرق کتب اردو - ۷  
 برکات الاسلام - ۲  
 رسالہ نور العین - ۰۲  
 شمار سلف - ۲  
 چار گلزار حالی - ۳  
 بختری طمان - ۳  
 تاریخ مدینہ منورہ اردو - ۹  
 اوشحہ المجید ثبوت تقلید امام اعظم حرکی - ۷  
 سوانح عمری - ۲  
 جبل المتین - ۶  
 قصص الانبیاء - ۰۶  
 سوانح عمری بوعلی سینا ہر سہ جلد - ۷  
 پارہ عم - تین زبان میں ترجمہ - انگریزی - ۷  
 اردو - فارسی - ۳  
 ظفر جلیل شرح حصین اردو - ۷  
 تقویت الایمان - ۱۱  
 مالا بد اردو - ۳  
 آیات بنیات ہر دو حصہ - ۷  
 ایضاح - ۶  
 آہ بیوگان - ۲  
 میخبر گداز و مہذب - لکھنوی - ۷

دگلدار ۹۳ ۱۸۰۰ء



مُصَنَّفُ مَوْلٰی عبدالحلیم صاحب سرِ مصنف  
ملک الغزیز و رجا تصور مونا - حسن انجلنا - دگلش  
دلچسپ - شہید وفا - مترجم در کیش ندانی و غیرہ

۱۸۹۶ء

دگلدار ۹۳ ۱۸۰۰ء

لکھنؤ کا عطر اہر قسم اور ہر قیمت کا!  
 ہر موسم اور ہر درجہ کے آدمیوں کے لئے!  
 اسے دس، توم، اگراپ اپنے دماغ کی تعزیت  
 اور ترقی چاہتے ہیں۔ یا ملکی تجارت میں آپ کو ذرا  
 بھی دلچسپی حاصل ہوتی ہے تو اس کا خانے کو اپنا  
 بہت بڑا دوست اور اپنا ملکی خادم تصور فرمائیے۔  
 ہر کو زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ آپ خود معاملہ  
 کر کے امتحان کر سکتے ہیں۔ آپ کا دماغ ہی آپ کے  
 مجبور کرے گا کہ اس کا خانے سے ہمیشہ معاملہ رکھئے۔  
**فہرست عطر موجودہ کا رخسانہ**

عطر خا- قسم اول - فی تولد - ص - دوم - لہو - سوم -  
 چارم - عا - پنجم - ص - ششم - ۱۲  
 عطر مہتابا قسم اول - فی تولد - ص - عا - ۱۲  
 عطر شہناک قسم اول - فی تولد - ص - دوم - ۱۲  
 عطر گلہب قسم اول - فی تولد - ص - دوم - ص  
 عطر کیوڑہ قسم اول - فی تولد - ص - عا -  
 سوم - ع - ۱۲  
 عطر گلاب لہو - فی تولد - ع - عطر عروس فی تولد  
 عطر شہناک قسم اول - ص - دوم - عا  
 عطر جمیل قسم اول - ص - عا - ۱۲  
 عطر عینری فی تولد - ص - عطر جوہی فی تولد  
 عا - دوم - عطر روح خس اصلی - ص  
 روح یارزی - ص - عطر آرزو - فی تولد - ص  
 عطر خس قسم اول - عا - دوم - عا - عطر بولسری  
 قسم اول - فی تولد - عا - دوم - عا  
 عطر جمیا - فی تولد - عا - دوم - عا - عطر مجموعہ فی تولد  
 عطر فینہ قسم اول - فی تولد - لہو - دوم - عا

عطر نازدک ایجاد بندہ - فی تولد - ص  
 عطر رگ خا - فی تولد - ص - عطر گل خا - عا  
 عطر شہناک قسم اول - فی تولد - ص - دوم -  
 سوم - ص - دوم - عا - فی سیر - لہو - عا  
 دوم - جمیل - لہو - عا - فی سیر -  
 دوم - کیوڑہ - فی سیر - قسم اول - لہو - دوم - عا  
 زندہ لکھنے کا کو غوردی خوشبودار عطر و عینری  
 خوش ذائقہ و لطیف گولیان - فی تولد -  
 توام گولون کا - عا - ۳ - تولد -  
 لکھنؤ کا ہر قسم کا استایہ کارخانہ بہ کفایت اور عمدگی  
 نہایت دبانڈاری سے ساتھ روپیہ وصول ہونے پر  
 روانہ کر سکتا ہے -

کارندہ کارخانہ محمد شاعر حسین نہ تار - لکھنؤ

**پیام بارس**  
 (آر و شاعر سہری اور نظم کا ایلاہ مدد)  
 جذبات کا دریا خیالات کا چشمہ فشان کا منتقل  
 شوقا فدا وطن کا آئینہ یعنی وہ چہرہ جیہ صبر و  
 حکمت کا حسن نازل ہونے والے لکھنؤ کا فراہم کئے گئے  
 ہیں - یادہ شہساز مجھ کو ملک کے زبان اردو کے  
 حسن و خوبی بچانے کا نظم کیا ہے - جیسے  
 یہ پیام بار "کتنے ہیں - قومی پرس لکھنؤ جو کہ  
 ماہوار چودہ برس سے نہایت حسن و خوبی سے شائع  
 ہوتا ہے -

شعار ہے ایک دلچسپ ناول بھی اسکے ساتھ ایک نیشنل ہوتا  
 قیمت مع ناول عام سے عا سالانہ مع محصول -  
 علاوہ ناول - عا سال مع محصول -  
 صرف ناول - عا سال - لیکن بغیر وصول قیمت بھی  
 روانہ کی ممکن نہیں - ایک نیشنل بطور نمونہ ۵ روپے پر ارسال  
 ہوتا ہے - اہم پیغام بار - لکھنؤ -

## قدیم غمیت بعد زوال

کئی برسوں سے یہی جملہ ہمارے دوستوں نے دگداز کے کسی صفحہ پر دیکھا تھا۔ اس جملہ کا مقصود اس وقت تصویر خیالی جستجو اور تفتیش کے ذریعے سے مؤثر و پردرد واقعات کے نمونے دکھلا کے بتایا گیا تھا۔ لیکن ایک فلسفی کی نظر میں غالباً اس مضمون کی چندان قدر نہ ہونی ہوگی۔ کیونکہ واقعات پر نظر رکھنے والے شہر میں باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ لیکن اب ہم ایک ایسے موقع پر اس مصرع کو پیش کرتے ہیں جبکہ ہمیں صرف واقعات ہی سے بحث کرنا ہے اور کسی فرضی معاملے سے کام لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

دگداز، جسکو پبلک نے مدت تک بڑی عزت کی نظر سے دیکھا اور جیسے اپنے کان بھر اردو لٹریچر پر بہت کچھ احسانات کیے اور جبکہ یہ دعویٰ کسی حد تک قابل تسلیم خیال کیا جانے لگا تھا کہ اس نے اردو زبان میں ایک نئی روح پھونکی۔ اور جو اپنی مذکورہ یادگار زمانہ کی کارگزاریوں کی بنا پر ہلکو اور نیرماری قوم کو بہت پیارا تھا۔ افسوس کہ زمانہ کی سرد مہر یون اور قومی بے پردائیوں نے کچھ ایسا ستایا کہ مجبوراً اسے گناہی کے پردے میں چھپتے ہی بنی۔ گو اس کی شکایت نہیں کہ پبلک نے دگداز کو کسی اعتبار یا کسی حیثیت سے ناپسند کیا تھا۔ لیکن ہاں اس کی عدم موجودگی اور غیبت کے زمانے میں ششاقوں کی طرف سے جو بے وفائی ظاہر ہوئی اس سے ثابت کر دیا کہ دگداز کیسا پرچہ تھا۔ یہ گذشتہ ڈیڑھ سال کی مدت جس میں قوم کی پُرشوق آنکھیں دگداز کے دیکھنے کو ترس رہی تھیں اور جبکہ اکثر اٹھ صرت اُس کے پانے کے ہوس میں پھیلے رہتے تھے۔ اس میں دگداز تو گناہی کے غار میں پڑا سورا تھا مگر لوگ اس کے سحر نما مضامین اُس کے مؤثر فقر و ن اد کے جادو بھرے الفاظ اور اس کے پردرد و غم کو حیرت و تعجب سے یاد کر کے افسوس کر رہے تھے۔ اور زمانہ پُچار پُچار کے کہہ رہا تھا کہ ”ان اصحاب الکہف والرقیم کا نوام

آیا نا عجیباً " ہم بھی گو اپنی مصیبتوں میں مبتلا تھے مگر اسکا بھی اندازہ ایتنے جتنے تھے کہ " عالم ہمہ افسانہ مادارد دیا کیسچ "۔

ممکن ہے کہ مانہ اور اجاب کی گذشتہ نامہریون اور پھر بعد کی نہ ہتوں کے خیال کر کے ہم کہہ دیں کہ

کلی مرے قتل کے بعد اوسنے جفا سے توبہ مانے اوس رُوشیمان کا پشیمان ہونا لیکن نہیں اتنے دنوں کی گردش زمانہ نے ہمیں قومی مدافعتوں کے ایسے عمام اور غیر متشنے انونے دکھا دیے ہیں کہ اونکے بعد جنت خشکیت زبان پر لائے کی ہم سے جرات نہیں ہو سکتی۔ ہننے ایسے ایسے گران پایہ قومی نامورون کو ایسے ایسے قومی جرائم کا مرتکب پایا ہے کہ ہماری قوم نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا وہ بہت ہی کم بہت ہی تھوڑا اور بالکل معمولی ہے۔ ہم اپنی قوم کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اوسنے ہمیشہ ہمیں ذکر خیر سے توبہ یاد کیا۔

الغرض اشاعت دگلدا زمین جو کچھ کوتاہی ہوئی اور اسکا الزام ہم اپنے ہی سر لیتے ہیں اور قوم سے معافی چاہنے کے بعد پھر پبلک کے اُس آئین پر آتے ہیں جس سے افسوس کہ بغیر کسی کو اپنا جانشین چھوڑے ہم رخصت ہو گئے تھے۔

ہم نے جو وقت پبلک آئین کو چھوڑا ہے اُس وقت ہم صرف دگلدا زمین کو نہیں شاہی کر رہے تھے بلکہ دگلدا زمین کے دفتر سے " مہذب " نام ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری تھا جسکی رنگ عبارت جسکے مضامین۔ اور جسکے ذریعے سے شاہی ہونے والی مرحوم و معذور علماء اسلام کی زندہ تصویرون کو زمانہ مدقون یاد کرے گا۔ اگرچہ مہذب کی نسبت بعض اجاب کی یہ رائے تھی کہ ملک کو چند ان اسکی ضرورت نہیں۔ ہمارے بعض اجاب بھی اسکے خلاف تھے مگر ہم اب بھی کہتے ہیں کہ چاہے ہندوستان کو نہ ہو لیکن اسلام کو اسکی ضرورت اُس وقت بھی تھی اور اب بھی ہے اور ہمیشہ رہیگی۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ نیز اپنے دیگر مشاغل اور تیز مصارف کے لحاظ سے ہم ابھی مہذب کی کمی پوری نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ہکوا اسکا بڑا صدمہ ہے اور غالباً ہمارے وہ اجاب بھی افسوس کرینگے جو اسکو بڑے ہی شوق اور بے انتہا متناؤن کے ساتھ لیا کرتے تھے تاہم نہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ کمی کبھی پوری ہی نہ ہوگی۔ اگرچہ زندہ ہیں اور زمانہ نے

ان مجبور یوں سے ذرا جی سخت دی تو ہم فوراً مہذب کو جاری کر دیئے۔

مردست دگداز ۱۹۱۲ء کے پہلے ہی میں سے جاری ہوتا تھا اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہمارے دوست اسے اسکے قیدی رنگ پر پائیں گے۔ وہی پر جوش مضامین ہیں وہی ناپختہ واقعات ہونگے۔ وہی پردہ و نمٹے ہونگے۔ وہی دلفریب و عازین ہونگی۔ عین عین وہی چند دگداز ہو گا اور وہی قردان ہونگے۔ وہی دنیا ہو گی اور وہی ہم ہونگے۔

دگداز کے ساتھ جو نااہل لکھنے والے آئے ہوا تھا اور پستہ اخبار نامہ تھا، ہمارا تھا اسکو اس موقع پر ہم ابھی نام تمام چھوڑتے ہیں۔ اور اسے لکھنا کہ وہ جو بچائے گئے وہ اسی سال کے اندر ایک جگہ اکا جلد میں شائع کر دیا جائے گا۔ اسلی قیمت لوگوں کو بروقت اشاعت معلوم ہو جائے گی۔ ابھی اسکے معلق زیادہ ہونگے تو کرنا قبل از وقت ہے۔

اس موقع پر ہمیں ان لوگوں کے قرض کا بھی فیصلہ کرنا چاہیے جنکا وہ پہلے بابت قیمت دگداز و مہذب ہم پر فاضل ہے۔ اگرچہ ہم نہایت افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ نامہربان احباب جنکے ذمے ہمارا روپیہ باقی ہے نیز انکی تعداد اور نیز اس رقم کی مجموعی تعداد جو اس طرح پر بقایا میں پڑی ہوئی ہے بہت زیادہ ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان حضرات کو ہم سے اپنا قرض وصول کرنا ہے انھیں اسکی کچھ پروا نہ ہو گی کہ اسی دفعہ انکی اس رقم میں ہم اس قدر ستائے گئے ہیں۔ اور ہم بھی انکی اس بے پروائی کو نہ کرے گے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے قرضہ سے زیادہ کچھ اور بھی بہت جبرانہ دینے کو موجود ہیں۔ وہ یہ کہ بن صاحبون نے ۱۹۱۲ء کی قیمت ادا کر دی تھی انکی وہ قیمت ۱۹۱۲ء کی قیمت سمجھی جاوے گی اور بغیر ان چار پرچوں کی قیمت مجروری ہو جو ۱۹۱۲ء میں ان کی خدمت میں بھیجے گئے۔ سال حال کے آخر تک ان کی قیمت میان خیال کی جاوے گی اور ان چار پرچوں کی قیمت کو ہم بطور جبرانہ چھوڑے دیتے ہیں۔ باقی رہے وہ حضرات جن کے ذمہ ہمارا روپیہ باقی ہے امید ہے کہ اب وہ توجہ فرمائیں گے اور کوشش کریں گے کہ ۱۹۱۲ء کی قیمت کے ساتھ گذشتہ بغا یا ارسال فرمائیں۔

تو رہے وہ حضرات جنکی قیمت بابت مہذب ہمارے ذمہ باقی ہے۔ ایسے بہت کم ہیں

کیونکہ ہند ب اپنے دوسرے سال کی زندگی شروع کرتے ہی بند ہوتا تھا، جن دگر گن کا پتہ باقی ہوا، اسکو ہم نقد تو واپس نہیں کر سکتے لیکن اگر وہ دگلداز کے خریدار رہیں تو دگلداز کی قیمت اور نیز بعض دیگر کتب کے ذریعے سے چند وزین اونکا روپیہ بھی بیباق کر دینگے۔

خاتمہ پر ہم ان شہیدین منہ حضرات کا بہت شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے دگلداز کے بند ہونے کے زمانے میں ہماری نسبت طرح طرح کے خیالات قائم کئے۔ اجازت کے کالموں میں ہکو بڑی عزت کے الفاظ سے یاد کیا۔ ہمارے قرضخواہان کو آج بھلا بیشک ہکو ان سے ایسی ہی امید تھی۔ لیکن ایسے حضرات کی شرافت مزاجی کا حال خود ہی کھل گیا اور ایسے واقعات پیش آئے کہ ہکو کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ اور یہ مثل خود بخود صادق آگئی کہ ”جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے لوے“ عار سے بعض خاص دوست ہمیں بار بار تاکید کرتے رہے کہ آنکے اثبات کا جواب ہم کسی اخبار کے کالم میں دین مگر نہ سکوت ہی کو مناسب سمجھا اور اب اس پر مسرت ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارا وہ سکوت ہی کامیاب ہوا۔

## مجنون عامری

دنیا کی کسی زبان کا لٹریچر عشق کی چاشنی سے خالی نہیں۔ یوں تو تمام اخلاقی باتوں سے بحث کیجاتی ہے۔ مگر جہاں عشق کا تذکرہ آیا جادو نگاروں کے تسلیم اور جادو بیانون کی زبانیں خود بخود زیادہ زور دکھانے لگتی ہیں۔ اگر ہم جستجو کریں تو غالباً کسی زبان کو اس کے مستثنیٰ نہ پائیں گے۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اخلاقی مضامین میں بھی اگر دلچسپی پیدا کرنا ہوتی ہے تو وہ بھی عشق ہی کے رنگ سے رنگ کے دلفریب بنائے جاتے ہیں۔ اور شعرا تو خواہ ایشیا کے ہوں یا یورپ کے۔ اکثر ادعات عشق ہی کو اپنا دین و ایمان سمجھا کئے۔

غرض مضمون آفرینوں کو اپنے خیالات اور اپنی تحریر دن میں عشق کے فرشتہ سے مدد لینے کی اکثر ضرورت پڑتی ہے۔ اور ایسے ہی موقعوں کے لیے دو چار ایسے نامور عاشقوں کو منتخب کیا کرتے ہیں جنکی سوانح عمری اتنی دلچسپ اور اسقدر موثر ہوتی ہیں

چاہے کہنے ہی بار بار کا تذکرہ کیا جاتا مگر سننے سے کسی کا دل نہیں اکتاتا اور ہر بار  
 زبان پر ایک نیا اثر ڈالتی ہیں۔ ہر زبان کے انشا پر دازون نے ایسے ہی دو چار  
 اثرات اپنے منتخب کر لیے ہیں۔ سنسکرت کے جادو بیا فون نے نل دمن کی رہم کہانی  
 سنائی۔ شعر سے فارس نے شیرین و فرما د کے بیان سے غزل خوانی کی فصحا سے  
 عرب نے یسعی و مجنون کے واقعات میں اعجاز سخن کی کرشمہ ساز زبان دکھائی۔ غرض  
 بونہیں زبان کے انشا پر دازون نے اپنے لطف بیان کے لیے کسی نہ کسی کو منتخب  
 کر لیا ہے۔

اس قسم کے تمام عشاق کے واقعات اسی زبان میں مرقوم ہیں جس کے لٹریچر میں  
 جان ڈالنے کے لیے وہ منتخب کیے گئے۔ لیکن عربی زبان نے چونکہ دنیا کی بہت سی  
 زبانوں کو فتح کر لیا۔ اور اس کا میابی سے فتح کیا کہ اسکے تمام محاورات اور خیالات  
 ان مقوقہ زبانوں کی رنگ و پے میں سرایت کر گئے۔ حتیٰ کہ عربی کی اکثر ضرب اشلیں  
 کبھی پوری پوری انہیں مروج ہو گئیں۔ لہذا عربی لٹریچر کے عاشقانہ سہر و مجنون عامری  
 کا نام فارسی وار دو کے نظم و شعر کا بھی ایک زیر دست منظر بن گیا۔ لیکن یہ بات بڑے  
 تعجب کی ہے کہ مجنون کے نام کو عربی فارسی۔ اردو۔ اور دیگر اسی قسم کی زبانوں نے  
 انہوں کو اس حد تک کیا کہ اسلامی دنیا کا کوئی بچہ بھی شاید اس سے نا آشنا نہ ملے گا  
 مگر سب کے واقعات اور اس کی زندگی سے حالات صحت و اعتبار کے ساتھ کبھی فارسی میں  
 بیان کیے گئے اور نہ کبھی اردو میں۔

شاید یہ پچھلا جملہ سن کے بہت سے لوگ چونک پڑینگے۔ کیونکہ مجنون نے فارسی میں نظمی  
 و ماتی کی اور اردو میں ہوس کی وہ شویان ویکھی ہیں جو ”یلے و مجنون“ کے  
 نام سے یاد کیجاتی ہیں وہ کہیں گے کہ یہ ہماری ہی کوتاہی ہے جو ہم نے ان شویان کو  
 نہ لکھا اور الزام دیدیا ورنہ اردو اور فارسی میں تو بہت سی متقل نظمیں خاص مجنون  
 کی کا تذکرہ بیان کرنے کے لیے تصنیف ہوئیں۔ ہم ان شویان کو دیکھ چکے ہیں مگر  
 جو اصلی حالات کسی میں نظر نہ آئے لہذا دعوے کرتے ہیں کہ اس مرحوم عاشق عرب کی  
 لائیف میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

اسی یہ سیرت کی بات ہے کہ مجنون کی نسبت ایسی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور ایک



ایسا بڑا بھاری قبضہ بنا کے اسکی طرف منسوب کر دیا گیا کہ اگر ہم کہیں قویہ بنیں  
 نہیں ہو سکتا کہ مذکورہ مخبرین میں جس شخص کا تذکرہ بیان کیا گیا وہ مخبرین عامری  
 نہیں کوئی اور مخبرین ہو گا اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ "دو  
 ٹیلے و مخبرین" جو سرسبزلی میں مقیم تھے اور کسی مارچھٹے شائع ہو چکا ہے اگرچہ  
 اوسمیں اشعار مخبرین عامری اور لیلہ عامری ہی کے ہیں مگر واقعات جو غچہ  
 بیان کیے گئے ہیں اکثر بے اصل ہیں۔

ہم جہاں تک غور کرتے ہیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ مخبروں کی لالفت تاریکی میں  
 چڑی ہوئی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ جس قبیلے مشق کا نام ہر زبان پر افسوس کے  
 ساتھ آتا ہے اور جسکے جوش و خروش کو آج تک لوگ ضرب المثل کی طرح عیش  
 عیش کی بتایوں اور بقیارین کی تشبیہ میں پیش کیا کرتے ہیں وہ اصل تھا کوئی  
 اور اسکی سرگذشت کیا ہے۔ انداز چاہتے ہیں کہ مخبرین عامری کے وہ حالات  
 جو مستند مورخین کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں انکو بیان کریں۔

مخبروں تو لقب تھا جو عشق کی انور رنگیوں کی بدولت نصیب ہوا۔ مگر اصل نام  
 "قیس" ہے۔ قبیلہ بنی عامر کے ایک رئیس و سردار ملوچ بن مزاحم کا بیٹا تھا۔ قیس  
 لوگوں نے مشہور کر دیا ہے کہ جناب امام حسن علیہ السلام کا ضاعی بھائی تھا۔ لیکن یہ ایک  
 دھوکا ہے جو شاید نام کے التباس سے ہو گیا۔ کیونکہ جناب امام حسن علیہ السلام کا ضاعی  
 بھائی ایک دوسرا قیس تھا جو قبیلہ لثامین سے تھا اور قیس بن ذریج کے لقب سے  
 مشہور تھا۔ اور بنی کعب کی ایک بیٹی بنت جناب کے عشق میں مبتلا تھا۔ لہٰذا قیس کے  
 مان باپ اپنی بیٹی کے عقد میں دینے سے انکار کرتے تھے۔ لیکن جناب امام حسن علیہ السلام  
 کی سفارش بجا آمد ہوئی اور دونوں عاشق و معشوق کا عقد ہو گیا۔ دونوں ایک  
 زمانہ تک ایک دوسرے کے وصل سے کامیاب رہے۔ مگر کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ذریج نے  
 اپنی بی بی کے اشارے سے بوجہ قیس کو دوسرا عقد کرنے پر مجبور کیا اور کہا لہٰذا  
 اولاد ہونے کی امید نہیں۔ اور مجھے خوف ہے کہ تمھاری لاوادی میری نسل کا انقطاع  
 نہ کر دے۔ قیس باپ کا نہایت ہی اطاعت گزین بیٹا تھا اسنے عقد کرنے سے تو انکار کیا  
 مگر باپ کو اجازت دی کہ آپ دوسرا عقد کر لیجئے۔ باپ نے یہ بھی نہ مانا اور آخر قیس

تو دلائل کہ لبنی کو طلاق دیدے۔ اطاعت مندی کے جو سن میں اوسنے طلاق تو دیدی مگر یہ حالت تھی کہ شب در در زیبا تھا۔ ہاتھا تھا۔ گواہ لبنی سے تعلق نہ رہا تھا۔ مگر آئیلے پاس جا جا کے دیا کرتا تھا۔ یہ امر لبنی کے مان باپ کو ناگوار ہوا اس نے اسے منع دیا کہ نہ جانا۔ عاویث نے قیس کو تو بدریہ حکام سے کہلی دی کہ آئیلے لبنی سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ اور لبنی کے باپ کو حکم دیا کہ لبنی کا کالج خالد بن عازہ غطفانی کے ساتھ کر دے۔ اس حکم پر قبیل بنو نضیر اور تیس کی بی بیان اور بڑھ گئیں۔ لبنی بھی تیس کے ذات میں بے قرار رہا کرتی تھی لیکن اب ہر مقدار ت اسیدرہ کو چھوچ گئی تو عیش نے شدت سے پکڑتے پکڑتے بیمار ڈال دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز بیمار رہ کے اسنے جان دی۔ یہ حال تیس بن ذریح کے گوشت گذرا ہوا تو خاک اڑاتا ہوا اسکی قبر پر چھوچا اور دوشعر پڑھتے پڑھتے من گھا کے گر پڑا۔ لوگ اس پھوٹی کے عالم میں اسے اس کے گھر اٹھائے گئے۔ باپ نے بہت کچھ دوا دوشن کی لیکن اسنے بھی چند ہی روز بیمار رہے جان دی۔ یہ اس دلدادہ تیس کا قصہ تھا جسکے اشتباہ سے قیس عامری کو لوگوں نے جناب بڑا کبر امام حسن علیہ السلام کا رضاعی بھائی بنا دیا ہے۔ اب ہم قیس عامری کے حالات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

قیس کی مشوقہ ایلائے عامریہ بھی ہے۔ عامر کی ایک پاکہ امن لڑکی تھی عوام میں مشہور ہے کہ ایلائے قیس کے چچا کی بیٹی تھی۔ اسکی بالکل صلیت نہیں۔ اصل یہ ہے کہ چونکہ اہل عرب کے عشق کا پہلا نشانہ چچا کی بیٹی ہوتی ہے۔ لہذا اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ قبیلہ ہر عاشق اپنی مشوقہ کو بنت عم یعنی چچا کی بیٹی کہہ دیا کرتا ہے۔ قطع نظر اسکے تمام قبائل عرب میں ہر قبیلہ کے کل افراد چچا ایک دادا کی اولاد سمجھے جاتے تھے لہذا ہر شخص اپنی قوم کی ہر مرد کو ابن عسم اور ہر عورت کو بنت عم کہہ سکتا تھا اور کہتا تھا۔ انرض اگر ایلائے قیس کی چچا زاد بہن ہو سکتی ہے۔ تو اسی رشتہ سے۔

نہ قیس کے اشعار بتاتے ہیں کہ وہ ایلائے پرچین ہی میں عاشق ہوا۔ اور قبل اسکے کہ اس بلوغ دونوں کے کا فون میں عشق کے بر خطر راز چھونکے دونوں ایک دوسرے

کے عشق میں مبتلا ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی ایک پرجوش نظم میں لکھتا ہے۔  
 تَعَفُّفٌ لِّیْلَی دَہِی غِشْرَ صَنِیرَہٗ  
 وَ کُنْتُ اَبْنُ سَمِیْعَ مَا کُنْتُ اَلثَّانِیَا

میں لیلے پر اوقات عاشق ہوا جب وہ بھولی بھولی اور چھوٹی سی تھی + اورین  
 سات برس کا لڑکا تھا۔ ہنور آٹھواں برس بہین شہر دہریا ہوا تھا۔  
 لیکن صرف اسی بچپن کے عشق نے طرح طرح کے واقعات شہور کر دیئے جو آج  
 عوام کی زبان پر ہیں مگر یہ نہیں چلنا کہ اُن کی اصلیت کہاں سے ہے۔ نمبت کا  
 واقعہ جو تھپڑ تک میں نہایت دلچسپی کے ساتھ دکھایا جاتا ہے وہ بھی کسی مستبر  
 ذریعے سے ہم تک نہیں پہنچا ہے۔ ابھی فی الحال بیروت میں قیس کا ایک جدید  
 دیوان چھپا ہے جسکی ترتیب بہ نسبت پہلے دیوان کے زیادہ دلجو ہے + حسین ان  
 دونوں کے معصومانہ عشق کا ایک بہت ہی مؤثر واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے۔  
 لیلے اور مجنون کا مکان پاس ہی پاس تھا۔ اور دونوں گھر دن میں یکجہت کے لیے  
 گھرے تعلقات تھے کہ ایک بار قیس کے گھر میں کچھ لوگ جہاں آئے۔ اس وقت گھر میں  
 مسکانہ تھا جسکی بہانہ اری کے لیے سخت ضرورت تھی۔ قیس کی مان نے قیس سے  
 کہا کہ جاؤ لیلے کی مان سے تھوڑا سا مسکالے آؤ۔ قیس نے جا کے لیلے کی مان سے  
 کہا تو اس نے لیلے کو پکارا۔ او۔ کہا۔ بیٹی قیس کو مسکا دیدو۔ لیلے کے کا بظاہر  
 اٹھلائی قیس نے جو طرف اپنے ہمراہ لایا تھا پنجا کیا اور لیلے اپنے گھر کی شکل  
 جھٹکا کے منڈیلنے لگی۔ لیکن احوال میں دونوں ایک دوسرے کی صورت نہایت ہی  
 محویت کے ساتھ دیکھنے لگے۔ اور یہ محویت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ مجنون کا برتن برتن  
 ہو کے چھلک گیا۔ اب مسکا برابر زمین پر گر رہا تھا۔ لیکن ان دونوں سادہ دل اور  
 پاکباز عاشقوں کی نگاہیں ایک دوسرے پر لگی ہوئی تھیں۔ اس حیرت انگیز اور  
 مؤثر سین کو لیلے کی مان نے دیکھا۔ اسکے ٹوکنے سے دونوں بچوں کو ہوش آیا۔  
 مجنون اپنے گھر گیا اور لیلے اسکے کی شکل رکھنے کے بہانے سے لوٹھری میں جا چھپی۔  
 لیکن اس کا ردوائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لیلے کی مان نے قیس کو اپنے گھر آنے سے  
 روک دیا۔ اس قصہ کی نسبت بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ کہاں تک سچ ہے۔  
 مستبر ذریعے سے ہم کو جو کچھ ملا ہے وہ یہ ہے کہ بیان قیس کو عشق سے پہلے بھی کچھ

توڑی سی سنک تھی۔ صورت اور شکل کے لحاظ سے دیکھیے تو بڑے ہی خوشرو اور  
 طہرہ دار تھے اور اسکے ساتھ لباس کا بڑا ستوق تھا۔ کپڑے ہمیشہ اچھے پہنا کرتے تھے۔  
 ایک دن اس دج سے آپ اپنے گھر سے نکلا کہ دو بہاری اور شاہانہ ٹیٹا کی  
 قبائلیں بدن مین تمین۔ اور خوب صورت اونٹنی پر سوار تھے۔ یہ دج عرب کی  
 لڑکیوں کے ہسپتال کے لیے بہت کچھ موثر ہو سکتی تھی اور غالباً آپ نکلے بھی  
 اسی غرض سے تھے۔ جاتے جاتے آپ کا گزرا ایک ایسے مقام پر ہوا جہاں بہنیں  
 قبیلہ کی ایک عورت کریمہ نانہ اپنی چند بچوں کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔  
 یہی ہیں اسکی بچوں میں سے تھی جو اس وقت شریک صحبت تھی۔ قیس کے  
 حسن و جمال اور ان کی بانگی وضع کا جادو ان لڑکیوں پر چل گیا۔ سہوون نے ان  
 سے درخواست کی کہ آؤ دم ہر ہمارے ساتھ بیٹھ کے باتیں کرو۔ یہ تو اس ناک  
 میں نکلے ہی تھے اور تر پڑے۔ اور فرہ میں جو آئے تو اپنے ہمراہی غلام کو حکم  
 دیا کہ میری اونٹنی دج کر کے پکا۔ غرض اونٹ کے کباب سہوون نے خوب مزے  
 سے کمائے اور دن بھر اسی پُر لطف صحبت میں میان قیس خوش گپیاں اور آتے  
 رہے۔ وقت آخر ہو چلا تھا کہ ناگہان منازل نام ایک شخص جو قبیلہ بنی عامر ہی کا  
 ایک نوجوان تھا وارد ہوا۔ اور سب لڑکیاں اسکی صورت دیکھتے ہی قیس کو دھڑکے  
 اس سے باتیں کرنے لگیں۔ یہ امر قیس کو ناگوار ہوا۔ برہم ہو کے اوتھہ کھڑے ہوئے  
 اور چند اشعار پڑھتے ہوئے چل دیے جنکا مطلب یہ تھا کہ دو واہ میں نے اپنی اونٹنی  
 اسی لیے دج کی کہ میرے وصل میں منازل شریک ہو۔ اسکی صورت دیکھتے ہی سب  
 کی سب اپنے گھونگھرو بجاتی ہوئی اور چل دیں۔ حالانکہ ان گھونگھروں کی آواز مجھے  
 سخت ناگوار ہے۔

اس صحبت میں اور سب باتیں تو دل لگی ہی میں ٹل گئیں۔ مگر لیے کے دل پر قیس  
 کے حسن نے اپنا پورا قبضہ کر لیا۔ قیس کو تو لیے کا خیال بھی نہ ہوا۔ اور وہ انکی  
 محبت میں پریشان ہو گئی۔ یہ چلے آئے اور اس کی رات خدا جانے کس پتھری  
 میں اوجھتے گذری۔ میان قیس کل کی فریادوں کو یاد کر کے دوسرے دن ایک  
 دوسری اونٹنی پر سوار ہوئے اور وہی شاہانہ لباس پہن کے قبیلہ بنی عامر کے

خیموں میں چکر لگانے لگے۔ پرتے پرتے لیے کے خیمے پر گزرے۔ آج وہ اپنے خیموں میں اپنی دو ایک بھولیوں کے ساتھ بیٹھی دل بہلا رہی تھی۔ لیے کی صورت دیکھتے ہی قیس نے اپنی اونٹنی ٹھہرائی اور صاحب سلامت کی۔ لیے کے اٹھا۔ سے سے اوسکی بھولیوں نے قیس سے کہا۔ آؤ وہ بھر بیٹھ کے لطف صحبت اوٹھیں اور۔ کیون جی ایک ایسی عورت سے باتیں کر کے کو تمہارا جی چاہتا ہے جو تم کو چھوڑے نہ منازل کی طرف متوجہ ہو اور نہ کسی اور کی طرف، دو قیس اونٹنی پر سے یہ کہتا ہوا اوتر ا۔ ہاں ہاں۔ خدا کی قسم ہی چاہتا ہوں۔

لیے ایک عقلمند لڑکی تھی اس ملاقات میں اسنے اس بات کا اندازہ شروع کیا کہ میرے دل کی جو حالت ہے آیا کچھ اسکا اثر قیس کے دل پر بھی ہے یا نہیں بھولیوں تو مجھوں سے باتیں کرتی تھیں اور وہ بار بار اسکا ذکر کاٹ کے کسی اور کا ذکر چاہتی تھی۔ اور اسکے ساتھ ہی کن انکیوں سے دیکھتی جاتی تھی کہ اسکا اثر قیس پر کیا ہوتا ہے لیکن عشق کے غماز دونوں کی آنکھوں سے ناز و انداز کے سوال و جواب کرتے جاتے تھے۔ عشق کی جڑیں دونوں دونوں میں جگہ جگہ ہی رہی تھیں کہ لیے نے ایک بہت ہی سخت امتحان کیا۔ وہ یہ کہ اتفاقاً قبیلہ نبی عامر کا ایک اور لڑکا آگیا۔ لیلانے صرف قیس کے چہرے کے لیے اوسے الگ لیا کے دیر تک گوشیاں کیں۔ عرصہ کے بعد اوسے رخصت کر کے آئی اور قیس کی صورت دیکھنے لگی۔ بیان اس کے جو دیکھتی ہے تو قیس کے چہرے کا عجب حال ہے۔ مارے غصہ کے تمنا یہاں ہے اور شدت غیرت سے یہ عالم ہے کہ ایک لڑکا آتا ہے اور ایک جاتا ہے۔ لیلانے کے دل میں تو آتش عشق بھڑک ہی رہی تھی۔ صبر نہ ہو سکا۔ اور خود رفتگی میں اسی زبان سے دو شعر بھل گئے جنکا صاف مطلب یہ تھا کہ ہم دونوں کے دس میں عشق بوش مار رہا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے سینہ میں گہرا لیا ہے۔ ہاں شور سنتے ہی قیس کے رہے سہے حواس غائب ہو گئے غش کہاں زمین پر گر پڑا۔ لیے کی محجولیاں گہرے دوڑیں منہ پر دیر تک پانی چہرہ کا تو قیس کو بوش آیا قیس و لیے کی عشق کی یہ ابتدا ہی اونکے درس عشق کا دراصل یکتب تھا وہ نہیں جو عام طور پر مشہور کیا جاتا ہے اسی ایک صحبت نے دونوں کے دل کو گرفتار محبت کر دیا۔ لیے تو گھر کی بیٹھنے والی

و ایک سنجیدہ اور شریف طبیعت رکھتی تھی۔ اس نے دل پر ہزار کوفت اٹھائی۔ مگر گھر سے مدد پر نہ نکلا۔ مگر قیس پر یہ اثر ہوا کہ مراقبت کا چوش ہوا۔ مان - باپ - عزیز - ب - گہرا - سب کو چھوڑا اور خراکی راہ لی۔ قبیلہ بنی عامر کے مرد و گاہ کے گرد جو ٹھیکہ بنی تو وہ - نہ ہمیشہ ان پر ہا کرتا اور شب و روز لیلے ہی نیلے پکارتا ابابا سے بھی قطع اعلان کیا۔ اور اوپر سے گزرنے والے قافلے ہمیشہ اسے ہر نہ پائا کرتا وہ صحر اور مہستان ہی میں رہتا تھا مگر لیلے کی کشش نے وہ اسی نجد کو مرکز بنا دیا تھا زمان نبیلہ بنی و کا وزو گاہ و سکین نما۔ اور قیس کو ہمیشہ انہیں تو دونوں سے ملا رہتا تھا۔ قریب قریب کے قریب قریب تھے۔ آپ ان تو دونوں پر رہتے تھے اور ہر آنے جانیو لایا یا جو بیت دیا کرتے تھے کہ لیلے تک پہنچا دے۔ اگر کوئی پاس جاتا تو اس سے بات کرتے اور اس کی بات کا جواب دیتے۔ ہاں اگر اس نے لیلے کا ذکر چھیڑ دیا تو اسے بڑبڑ چھوڑا نا شغل ہو جاتا۔ اور آپ باتیں بھی جوش و حواس کی کرنے لگتے۔

ان زمانے میں اسلامی حکومت کا یہ قاعدہ تھا کہ جس طرح کفر سے جزیہ وصول کیا جاتا اسی طرح مسلمانوں سے۔ جی ایک تاس وصول کیا جاتا تھا۔ جس سے مراد زکوٰۃ ہے۔ اور اس اسلامی ٹیکس کے وصول کرنے کے لیے ایک سرکاری عہدہ دار معین کیا جاتا تھا۔ ان بن مساحق نام ایک شخص ان دنوں بحقیق زکوٰۃ کے لیے بنی عامر پر معین کیا گیا۔ نفل حب اوہر سے گزرا تو مجنون کو، مہستان میں آہ و نالہ کرتے دیکھ کے متفسر ہوا کہ یہ کون ہے اور کیوں رہتا ہے۔ لوگوں نے قیس کا حال بیان کیا۔ نفل کو ترس آیا تو چہ بانہ پاس جا کے حال پوچھے۔ ہمارے بیٹوں نے کہا جب تک لیلیٰ کا تذکرہ نہ کیجیے گبات نہ رہے گا۔ نفل نے مجنون کے سامنے آ کے لیلے کا تذکرہ چھیڑا۔ مجنون نے نفل سے خوب باتیں کیں اور خوب خوب اشعار سنائے۔ نفل نے کہا ”اچھا تم یہ جانتے ہو کہ میں ایسے کے ساتھ تمہاری شادی کر دوں“ مجنون کی اور تمنا کیا تھی۔ کہا ”ہاں“ مگر بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے! نفل نے مجنون کو عمدہ کپڑے پہنائے اور اپنے ہمراہ لے کے قبیلہ بنی عامر کی طرف روانہ ہوا۔

جب بنی عامر کو اس امر کی اطلاع ہوئی تو سب کے سب ہتھیار بند ہو کے لڑنے کو تیار ہو گئے اور نفل سے کہا۔ ”در خدا کی قسم یہ نہ ہو گا کہ مجنون ہمارے گہروں میں داخل ہو“

پہلے تو نوفل نے سب کو دھمکایا اور اپنی طرف سے بھی لڑائی کی مستعدی دکھائی۔ مگر جب دیکھا کہ بنی عام جان ہی دینے پر آمادہ ہیں تو مجنوں کی طرف مخاطب ہو کے کہا۔ ”بہی میرے نزدیک تمہارا ناکام واپس جانا صدمہ آرمیون کے مارے جانے سے زیادہ اچھا ہے۔ لہذا میں اب مجبور ہوں اور تمکو اجازت دیتا ہوں کہ تمہارا جہان بنی چاہے چلے جاؤ۔ نوفل کی یہ تقریر سن کے مجنوں بہت برہم ہوا اور غضب آلود لہجہ میں یہ اشعار پڑھتا ہوا اپنے اُنہیں رنگ تانی ٹیلون پر چلا گیا۔

جب یہاں تک نوبت پہنچ لی اور لیلے کے باپ کو کسی طرح رسم نہ آیا تو بنیوں کے باپ نے اپنے تمام اعتراضات کو جمع کیا اور سب کو لے کے لیلے کے پاس گیا اور درخواست کی کہ خدا کے لیے اب تو مجنوں کے حال پر ترس کھاؤ۔ اس عشق نے اسے بالکل دیوانہ بنا دیا۔ جتنا مہر چاہو۔ ہم دینے کو تیار ہیں۔ مگر مجنوں کے ساتھ لیلے کا عقد کر دو اس دستاویز نے رسم کی جگہ لیلے کے باپ کو اور غضب آلود کر دیا۔ اس نے کہا میری جو کچھ سہائی ہو چکی وہ تھوڑی سی نہیں ہے جو اب اس رسوائی کو خود آپ اپنے سرواڑہ لون اور مین قسم کھاتا ہوں کہ چاہے کچھ ہو جائے اپنی بیٹی مجنوں کو نہ دوں گا۔ مجنوں کے واسطے دارا دہرنا کام واپس آئے اور اودھ لیلے کے باپ نے اپنی قوم کے ایک شخص کے ساتھ لیلے کا عقد نکاح کر دیا۔ یہ سب مشہور ہوئی اور مجنوں کی مایوسیوں نے اور ترقی کی۔ اب اسے وہاں ریاستان میں بھی کسی طرح چین نہ پڑتا تھا۔

مجنوں کی یہ حالت دیکھ کے اوس کے قرابت داروں سے کسی طرح خاموشی بھٹکا جاتا تھا۔ آخر سبہوں نے مل کے مجنوں کے باپ سے کہا اب تو اوسکی حالت کیسی طرح دیکھی نہیں جاتی۔ اب کی بار موسم حج میں مجنوں کو اپنے ساتھ لے جا کے حج کراؤ اور وہاں درگاہ الہی میں عاکرو۔ شاید خدا تمہاری دعا قبول کرے۔ اور اس کی حالت درست ہو جائے۔ اس مشورے پر بھی عمل کیا گیا۔ اور مجنوں حیران و قہر پکڑے باز ہے اپنے باپ کے ساتھ مکہ معظمہ میں گیا۔ بعد فراغت حج شب کو مسجد ان منا میں جہان تمام حجاج جمع تھے کسی عورت نے کسی دوسری عورت کو اوس کا نام لے کے پکارا دیا لیلے، اوس عورت کا نام بھی لیلے تھا۔ اس آواز نے مجنوں

کے سینہ میں آگ لگا دی۔ آواز کے سنتے ہی ایک چیخ ماری کہ لوگوں کو خیال ہوا شاید اس چیخ ہی کے ساتھ اس کا دم کل جاے گا۔ اور چیخ مارتے ہی غش کما کے زمین پر گر پڑا۔ رات بہرہوش پڑا۔ صبح کو ہوش آگیا تو آئندہ کہو گی۔ اپنے مذات دل کے ننوں سے عزتوانی شروع کر دی باپ کو یقین آگیا کہ اب نبون کے مرض کے لیے کوئی علاج کارگر نہیں ہو سکتا۔ حج سے واپس آیا۔ اور پھر وہ ہی نبون تھا اور وہی خد کا گیسٹان۔

سنتے ہیں کہ نبون کا معرے بخارین پر تے بہتے ایک بار لیے کے شوہر کی حرکت گذر ہوا۔ نبون نے اس کو چپا تو پاس کیا اور اسے سانسے دو پر دروا شمار پڑے جنکا مضرب نہ تھا کہ۔ تجھے اپنے پروردگار کی قسم تاکہ کبھی صبح کے پتھر تو سنے لیے گا اپنے گھ سے لگایا ہے یا اس کے منہ کا بوسہ لیا ہے؟ اور کبھی تیرے جسم پر اس کی زینیں لہرائی ہیں؟ یہ اشعار نیکے لیلکا کا شوہر مارے شرم کے پسینہ سپینہ ہو گیا اور نراست کے لعجہ میں بولا در اگر تو قسم دلاتا ہے تو بان الیا ہوا ہے۔ یہ جملہ سنتے ہی نبون طیش میں آیا اور لپک کے دذنون ہاتھوں میں دو انگارے اٹھالیے۔ اگرشت چرخہ کے جلنے کی آواز لیے کے شوہر کے کان میں آئی اور اس نے نہرت سے دیکھا کہ انگاروں کے ساتھ مجنون کی تفصیلیوں کی کھال چربی کی طرح بہ کر گر پڑی اور آخر وہ گہرا کے اوسٹہ کڑا ہوا اور مجنون کے حال پر تاسف کرتا ہوا ہب گا۔

نبون کے اشعار بہت ہیں۔ اور ہر شعر سے اس کی از خود رفتگی اور اس کی پاک محبت کی بوا آتی ہے۔ آخر میں اس کا حال یہ ہو گیا کہ انسان سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا حیوانات سے۔ بڑھتا۔ و خوش صحر او سے اپنا دوست سمجھنے لگے تھے۔ یہ اون میں پہرا کرتا تھا اور وہ بہاگن کیسا بھڑکتے نہ تھے۔ سب سے زیادہ اونس مجنون کو ہر نبون سے محبت کی انگین اداسے معشوقانہ دکھایا کرتی تھیں۔ وہ اکثر ہر نبون کو ”شبہ لیے“ یعنی تصویر لیے کے لفظ سے تعبیر کیا کرتا تھا۔ بلکہ اپنے ایک شعر میں تو وہ صحر کی ہر نبون کی طرف مخاطب ہو کے کہتا ہے ”اے ہر نبو! مجھے خدا کے لیے بتاؤ کہ لیلے تم میں سے ہے یا آدمیوں میں سے“

کہتے ہیں کہ مجنون اپنے انہیں جنون انگیز دلوں میں کوہ و صحر کی خاک اوڑھتا



پہرہ تھا کہ لیے اسکے غم میں گرہ بستے گرہ بستے مر گئی۔ لوگوں نے دفن کروایا اور مجنون کو خبر بھی نہ ہوئی۔ دو چار روز بعد جب اس کے گوش گزار ہوا کہ لیے مر گئی تو بنی عامر کے قبرستان میں پہونچا۔ اور لوگوں سے پوچھنے لگا کہ لیے کی قبر کہاں ہے۔ لوگوں نے اس خوف سے کہ اس کی بی جان جائے گی قبر کے تانے سے پرہیز کیا۔ مجنون نے قبروں کی مٹی اوٹھا اوٹھا کے سونگھنا شروع کی۔ جب لیے کی قبر کی مٹی اس کے ہاتھ میں آئی تو اس سے سونگھ کے ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ ہے کہ "لوگ چاہتے ہیں کہ اُسے عاشق سے اس کی قبر کو چھپائیں مگر خود اس کی قبر کی مٹی کی خوشبو بتا رہے ہیں" یہ اس کی قبر ہے، یہی شعر پڑھتے پڑھتے گرا اور مر گیا۔

لیکن یہ واقعہ بھی کسی قابل اعتبار ذریعے سے نہیں معلوم ہوا اور جو کچھ ہمیں مقبرہ ذریعوں سے ملا وہ یہ ہے کہ مجنون رکیب خان کے تو دونوں پر پہرتے پہرتے ایک دن مرا ہوا ملا۔ اس کی موت کے وقت کوئی شخص موجود نہ تھا۔ ایک دادی بین جہان مقبرہ کی چٹانیں کثرت سے تھین اس کی لاش پڑی ہوئی تھی جس شخص کی نظر پہلے پہل اس کی لاش پر پڑی وہ قبیلہ بنی مرہ کا ایک شخص تھا جو کسی ضرورت سے اس دادی بین ہوئے گذرا۔ مجنون کی لاش دیکھتے ہی وہ بنی عامر میں آیا اور مجنون کے اعوذہ کو اس کی موت کی اطلاع کی۔ بنی عامر کے لوگ روئے اور سر پیٹتے اس مقام پر پہونچے۔ اس کی لاش کو غسل دیا۔ اور تجیز و تکفین کر کے دفن کر دیا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ بنی عامر کو کسی نے کہی اتنا روتے اور ماتم کرتے نہیں دیکھا تھا۔ جبنا کہ وہ لوگ مجنون کی تجیز و تکفین کرتے وقت روئے تھیں۔ ایک عام ماتم تہب جس میں مرد بھی شریک تھے اور عورتیں بھی۔

لیکن یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ لیا مجنون سے پہلے مچلی تھی۔ مجنون بنی عامر رہا ہے۔ جن دنوں کہ بنی امیہ کا دور تھا۔ اور ان کی سطوت و جبروت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا تھا۔

یہ تھا وہ مجنون جس کا نام قریب قریب ساری دنیا سے اسلام میں ہمیشہ خوش شمس کے موقع پر لیا جاتا ہے۔ جس کو ہمارے شعرا کبھی محل لیے کے ساتھ دوڑاتے ہیں اور کبھی جس کے لیے دشت نجد کی خاک چھانٹتے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جس کی تصویریں

ہر روز تے ہوئے گئے مین انعامی ہے۔ اور جسکے مالہ جاگاہ لی آواز ہر دشت مین دو  
نہ لیا کرتے ہین۔ یہی تھی وہ لیلہ جسکے نعل کو ہر شاخ ایک نئی دہوم دہام سے نکالتا ہے  
اور جسکے گ سے مجنون کے خون کے فوارے جاری کرتا ہے۔ اور یہی ہیں وہ  
خاتون بن کی شادی مین بقول ہماری عورتوں کے وہ شخص شریک ہوگا جسکی وارہی  
میں بھی استرا نہ لگا ہو۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ لیلہ و مجنون د۔ اصل کوئی نہ تھے۔ صرف شعرا نے اپنے خیال  
سے۔ ہمن و عشق کے پہلے بنا کے تیار کیے ہیں۔ جنکو ہمیشہ اپنی عاشقانہ ضرورت کے  
دور میں ر دیا کرتے ہیں لیکن یہ قول زندان قابل تسلیم نہیں ہے۔ اس لیے کہ اکثر  
موجود ہیں پورے پورے واقعات اور زمانہ بتاتے ہیں۔ اور قطع نظر سب کے ہمارے  
ہاتھ مین سیلے و مجنون کا دیوان موجود ہے جو ایک خاص ایسے پر جوش مذاق کی  
نہرو دیتا ہے جو تمام شعرا سے ب کے مذاق سے جداگانہ ہے۔ ہاں اس میں ہنس  
نہیں کہ ان دونوں کے احوال کے مرنے کے بعد یثامین شہ سے نصیب ہوئی اور یہی  
وجہ سے غالباً ان کی موجودگی ایک شبہ امر ہو گئی ہے۔ بہر حال کسے ضرور۔ اور خدا  
عالمیت جنت کرے اس لیے کہ بقول جناب سرور کائنات علیہ الف الف تحیات (سن  
عشق نعت فحمت نموشہید) "جہ شخص عاشق ہوا اور پاکبازی سے بسر کی اور مگر یادہ  
شہید ہے۔" دونوں شہید مرے۔

گفت کاے پروردگار بے نیاز  
عشق لیلہ و رطل چون کردہ  
نہ تھی شاہ جہاں دین ہاشم  
اسے خدا سے من ازین زاری کن  
در محبت کردم این غمنا نصیب  
حسن لیلہ عکس ز سار من است

ایک شبے مجنون بخلوت گاہ۔ از  
احسبہ نامہ تو مجنون کردہ  
کردہ خسار منیلان را  
تو چہ خواہی زین گرفتاری کن  
باغش گفتہ کہ اسے مرد غریب  
عشق لیلہ نیست این رین است

خوش نہا بد گریہ شہما۔۔۔ تو  
ذوق ہمارم بہ بارب ہا سے تو

## گذشتہ عورتوں کی لیاقت

ہندوستان میں فی الحال یہ سلسلہ اکثر چھڑا جاتا ہے کہ آیا عورتوں میں تعلیم کا رواج ہونا چاہیے یا نہیں۔ ہندوستان ہی پر منحصر نہیں ہم اپنی دانفیت کی حد تک اگر بیان کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ ساری دنیا میں اسلام میں انفاہ نسوان کے متعلق بہی بری عین مد رہی ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے ہم نے بیروت و اتح شام کے ایک عربی مفتہ دار پر جو میں تعلیم نسوان پر ایک بڑا بھائی اور سبب اثر کل دیکھا تھا۔ اگرچہ تعلیم یافتہ گروہ نے اب قریب قریب مخالفین تعلیم نسوان پر فتح حاصل کر دی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس بحث کے چھیڑنے سے اتنا نتیجہ ضرور حاصل ہوا کہ موافق خواہ مخالف سبب اپنی ایکوں کو چند روز پہلے کے یہ نسبت اب زیادہ تعلیم دلائے گئے ہیں۔ تاہم ابھی تک ہمارے کانون میں کبھی کبھی یہ آواز آہی جسالی ہے کہ عورتوں کے دلانے سے ان کے اخلاق پر بڑا اثر پڑے گا۔ اس بات کو ہم کافی اطمینان کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں کہ نیز شرعی حیثیت سے اور نیز فلسفیانہ حیثیت سے۔ نیز عقلاً اور نیز نقلاً سے ثابت کر لیا کہ تعلیم کے اعتبار سے مرد اور عورت میں کسی قسم کی تفریق نہیں کیجا سکتی۔ مگر ہاں اتنی بحث باقی رہ گئی ہے کہ ہندوستانی اخلاق کے لحاظ سے ہم عورتوں کے لیے ابھی تک جس آزادی کو ناپسند کرتے ہیں تعلیم اوسکو پیدا کر دے گی۔ لیکن یہ صحت ایک غلط فہمی ہے جو بعض تجربات پر بے سبب کلیہ قاعدہ بانڈھنے کی وجہ پیدا ہوئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان اسی بعض نظائر پیش کر رہا ہے جنکو مخالفین تعلیم نسوان ہمیشہ ہمارے سامنے پیش کر دیا کرتے ہیں۔ لیکن وہ نظائر ایسی نہیں ہیں کہ بد اخلاقی کو تعلیم کا لازمی نتیجہ ثابت کر دیں۔ اصل یہ ہے کہ ہندوستان میں جس عورت کا چال چلن بگڑتا ہے اوس کا نام عام پبلک میں مشہور ہوتا ہے اور اس کا تعلیم یافتہ ہونا اس شہرت کو اور ترقی و لا دیتا ہے۔ بخلاف اسکے پاکدامن عورت کا نام چاہے وہ کتنی ہی تعلیم یافتہ ہو گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس دستور کی وجہ سے سبکو یہ ضرر پہونچ رہا ہے کہ اگر ہمارے تعلیم یافتہ عورتیں پاکدامن ہوں

تو ان کا نام ہم کو نہیں معلوم ہوتا کہ پیش کریں۔ اور اگر ایک تسلیم یافتہ لڑکی بھی  
 سب سے زیادہ جانتی ہے تو اس کا نام ہر شخص تک پہنچ جاتا ہے اور تعلیم بنوان کی محافت  
 کے موقع پر ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ہند اگر ہم نظائرہ پیش کر سکیں تو ان کو  
 یقین کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ تعلیم یافتہ لڑکیوں میں سے مگر نے والیوں کی تعداد  
 اتنی ہی ہے جتنی تعداد کہ غیر تسلیم یافتہ لڑکیوں میں ہے۔ مگر ان کی تعداد  
 یہ ہے کہ ہمارے مخالف حسیں طرح بگڑنے والیوں کی ہرست میں کر سکتے ہیں  
 اسی طرح ہم پاکدامن تعلیم یافتہ لڑکیوں کی فہرست نہیں مرتب  
 کر سکتے۔

تو ہمارے لئے اس موقع پر استدلال کا سب سے عمدہ پہلو یہ ہے کہ ہم اسلامی تاریخ  
 سے ثابت کریں کہ قرآن اولیٰ میں عورتیں تعلیم یافتہ تھیں یا نہیں۔ اسمیں کوئی  
 کتاب نہیں کہ ان کا زمانہ علما کے ہر طبقے میں ہمارے سامنے عورتوں کے نام پیش  
 کرتا ہے۔ خصوصاً فصاحت و بلاغت میں تو عورتوں کی لیاقت کبھی کبھی مردوں کے  
 برابر ہی ہوتی ہوئی ثابت ہوتی ہے۔ ہم ایک عورت کا حال بیان کرتے ہیں جو تیج تاج  
 کے عہد میں تھی اور فصاحت و بلاغت کے کمال سے اسے قرآن مجید پر اس قدر نظر  
 پڑا کہ اس نے ہمارے نظریں اس کی ذکاوت اور نیز اس کا وہ ملکہ جسکی بدولت  
 وہ قرآن کی ہر آیت کو نہایت مناسب موقع پر استعمال کرتی تھی بہت ہی حیرت انگیز  
 چیز ہے۔ اور شاید اپنے اس کمال کے اعتبار سے اسلام کا تیرہ سو برس کی مدت  
 میں وہ منفرد ثابت ہوگی۔

عبداللہ بن مبارک جو امام اعظم ابوحنیفہ کوفی علیہ السلام کے رشد تلامذہ میں ہیں بیان  
 کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مکہ معظمہ گیا۔ اور ارادہ کیا کہ مدینہ طیبہ جا کے تربت حضرت  
 رسالت پناہ صلعم کی زیارت سے بھی شرفیاب ہوں۔ ان میں اپنے اونٹ پر سوار تین ہونا  
 چاہتا تھا۔ اور عرب کے ریگستان اور پہاڑوں کی لہائیوں میں قطع کرتا چلا جاتا تھا کہ  
 راستہ میں ایک جگہ دو پر کچھ سیما ہی نظر آئی۔ یہ جا کے غور سے دیکھا تو معلوم  
 ہوا کہ ایک ضیفہ عورت بیٹھی ہوئی ہے نہ کوئی آسہ نہ کوئی تیچھے۔ ایک سوئی  
 چادر اوڑھے ہے اور ایک سوئی خار سر پر پڑی ہوئی ہے۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف

دیکھا اور کہا "السلام علیک درحمتہ اللہ وبرکاتہ" اسنے جواب دیا "سلام  
 تو لا من رب رحیم" میں نے کہا خدا تمپر رحمت کرے یہاں کیا کر رہی ہو جواب  
 نہ دینے لگی "فلا ما دنی لہ" اس جواب میں مجھا کہ یہ راستہ بھول گئی ہے  
 یہ پافت کیا اور چاتی کہاں ہو؟ بولی "اللہم انزل من السماء ماء فیتیموا صیداً طیباً" میں نے کہا "میرے پاس کھانا ہے  
 احرآم الی السجد الا قصہ" میں سمجھ گیا کہ حج سے فراغت کر کے اب بیت المقدس  
 جاتی ہے۔ پوچھا "کب سے تم اس مقام پر پڑی ہو؟" بولی "ثلاث لیلای سوتاً"  
 میں نے کہا "تمہارے پاس کچھ کھانے کو تو ہے نہیں آخر جنے بسر و تکرلی؟" کہنے  
 لگی۔ "ہو یطعمنی و یطعمین" میں نے پوچھا۔ "اور تم وضو آج حیرت کرتی تھیں؟"  
 بولی۔ "فلنم سجداً و ماؤ فیتیموا صیداً طیباً" میں نے کہا "میرے پاس کھانا ہے  
 کھاؤ گی؟" بولی۔ "ثم اتموا لصیام الی اللیل" میں نے کہا "یہ رمضان کا  
 مہینہ تو نہیں ہے۔" جواب دیا۔ "ثم من تطوع حۃ آ فان اللہ رشا لہ علیم" میں نے  
 کہا "لیکن سفر میں تو ہمیں روزہ نہ رکھنا مباح ہے" کہا۔ "وان تقصوا فلیس بکرم"  
 ان کنتم تقصون" آخر اسکی وہ آن خوانی سے عاجز آکے میں نے کہا "جس طرح  
 میں تم سے باتیں کرتا ہوں اسی طرح آزادی سے تم مجھے باتیں کیوں نہیں کرتیں؟"  
 کہا۔ "اما یلفظ من قول الا لکدیر رقیب عتید" میں نے پوچھا۔ "تم کس قبیلہ  
 کی عورت ہو؟" کہا۔ "ولا تقف ما یفسدک بعلم ان السمع قد لبصر و افوا  
 و کل اولک کان عنہ منسواً" میں نے کہا "مجھے سے خطا ہوئی معاف کرو"

۱۱ سلام قول ہے پروردگار مہربان کی جانب سے ۱۲ لکھ؟ سکوا اللہ مگر اہ کر دے اسکو راہ بتلائے اللہ  
 کوئی نہیں ۱۲ لکھ پاک ہے وہ اللہ جو بے گیا اپنے بندہ کو سجد حرام (کعبہ) سے سجد قضی (بیت المقدس) سے  
 ۱۱ تین سو تین ہدی ۱۱ وہی مجھے کھاتا ہے اور پلاتا ہے ۱۱ اور نہ پاؤ تم پانی تو تم کو پاکی ۱۱  
 ۱۱ پھر تمام کرو تم روزے کو رات تک ۱۱ اور جو بطور نفل نیک کام کرے تو اللہ قبول کرے ۱۱  
 اور جاننے والا ہے ۱۱ اور اگر روزہ رکھو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانتے ۱۱ ۱۱ نہیں منہ  
 سے نکالتا ہے کوئی بات مگر یہ کہ اسپر ایک جاموس تمہارا ہے ۱۱ اور نہ واقف ہو تو ادا  
 چہنہ سے جسکا تجھے علم نہیں ہے۔ تحقیق کان اور آنکھ اور دل سب سے اسکے متعلق  
 باز پرس ہوگی +

ہوں۔ "لا تشریب علیکم ایوم یغفر اللہ لکم" میں نے کہا۔ "میں تمہیں اپنی اور منی پر چڑھا  
 ہے۔ پھر ان چلوں؟" کہا۔ "ایہ تو مافقو اس فیہ علیہ اللہ" میں نے اور منی بٹائی اور کہا "او  
 کہنے لگی۔ "قل لمومن ینصوا من البصائر ہم" میں نے آنکھیں اس کی طرف سے پھیر لیں اور کہا  
 "سو سواری ہو" اس نے جیسے ہی سواری ہونے کا قصد کیا اور منی بھڑکی اور اس کی چادر پھٹ گئی  
 اپنی پادر کو پھٹے دیکھ کر بولی "ما اھضاکم من مصیبتہ فمما کسبت ایدیکم" میں نے پھر کہا  
 "اچھا فوراً اٹھ جاؤ میں اور منی کو باندھ دوں تب تم سواری ہونا، جواب دیا۔ "نعمت"  
 سلیمان "میں نے اور منی کو باندھ رکھے کہا "اب سواری ہو" وہ سواری ہوئی اور اور منی  
 کی پیٹھ پر بیٹھ کے کہا "سبحان الذی سخر لنا ہذا وما کنا لہ مقرین وانا الی ہست  
 المعبود" میں نے اور منی کی ہمارا ہاتھ دین لی اور دوڑتا اور چلنا ہوا چلا۔ یہ حالت  
 دیکھ کے ہوں "واقصہ فی شیک وقصص من حصنات" یہ سن کے میں کہتا  
 ہوتا چلنے لگا اور چلائے کی جگہ ضعیف آواز سے بطور ترجمہ کچھ اشارہ پڑھنے لگا۔ تو  
 بولی "فاقرؤ ما تیسر بن لقمر ان" میں نے کہا۔ "اللہ نے تم میں بہت سی نیکیاں  
 پیدا کی ہیں" بولی "وما یدکر الا اولوالالباب" ٹھوڑی دو چل کے میں نے دریافت  
 تھا۔ "شوہر بھی ہیں!" کہنے لگی "یا ایہا الذین آمنوا لاتسلوا عن اشیاء ان تبدلکم  
 اللہ تم" یہ سن کے میں خاموش ہو گیا اب ہم چلتے چلتے قافلہ میں چھوٹے اور اس  
 ضعیف سے دریافت کیا کہ "قافلہ میں تھا راکون سے؟" کہا "المال والبنون زینۃ  
 الحیوۃ الدنیا" میں سمجھا کہ اسکے بیٹے قافلہ میں ہیں۔ میں نے کہا "اور ان کا پتہ کیا ہے؟"  
 بولی "واللہ مات و باطنم ہم یتدون" نیچے معلوم ہوا کہ اسکے رکے قافلے کے رہبر ہیں۔

لکھنؤ میں پر سبز رنگ آج اللہ تھا۔ سے گناہ مافق کرے ۱۵۲ حویلی کا کام تم کرو اللہ اسے جانتا ہے  
 اللہ بہ نوموسین سے لہ اپنی آنکھیں بند کر لیں اللہ اور ملو جو صیبت پھونچے وہ خود تمہارے ہاتھوں  
 سے ہے اللہ پر سمجھایا ہے وہ سلیمان کو اللہ پالے وہ اللہ جسے اسکو ہمارا مطیع کیا اور ہم اسکی  
 وصیت کرتے تھے اور ہم اپنے پروردگار کی طرف توجہ کرنے والے ہیں اللہ اور نرمی کرو اپنی حال  
 میں اور بہت لڑا پس آواز کو اللہ اور پڑھو جس قدر توفیق ہو قرآن سے اللہ اللہ سمجھتے ہیں مگر صلیبان  
 اصل اللہ اور وہ تو لو جو ایمان لائے ہوا کہ اگر ظاہر ہو جائیں تو تم کو بڑی علوم ہوں اللہ  
 مان اور اولاد جو یاد دی زندگی کی رحمت ہیں اللہ اور عاتقین ہیں اتنا کہ وہ راستہ پائے ہیں

میں اونٹ کی ہمار پکڑے ہوئے خیموں میں پھرنے لگا۔ اور سہ دن کے حلقے میں بھونچے۔  
 میں نے کہا ”تھا۔ اخیر کون سے بچاؤ، کہنے لگی ”وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا وَقَالَ لَهُ  
 مُوسَى نَبِيَّكَمَا يَا حَبِيبُ اتَّخَذَ إِلَکَ ابْنُؤُورَ“ میں سمجھ گیا کہ یہ اسکے بیٹوں کے نام ہیں۔ اور  
 آواز دی ”اے ابراہیم اے موسیٰ اے عیسیٰ“ ناگہان تین نوعمر بچے نکلے جو اس سرد  
 خوبصورت تھے کہ گویا چاند کے ٹکڑے ہیں۔ لڑکوں نے اپنی ماں کو اوتارا۔ اور ہم سے  
 بیٹھ کے باتیں کرنے لگے یکایک اُس عورت نے چلائے کہا۔ ”فَاَبْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوَرِقٍ مِّنْهُ  
 إِلَى الْمَدِیْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَیُّهَا الَّذِیْ لَهَا مَا فَلِیَا تَلْکُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ“ یہ سنتے ہی انہیں سے ایک  
 باندار دوڑا گیا اور جو پہنچے بلا لاکھ میرے سامنے رکھ دیا۔ وہ عورت بولی۔ ”کَلَّوْا بَنُو  
 هِنَا بِمَا اسْتَفْتَمْنَا نِیْ الْاِیَّامِ الْاَخْلَیْہِ“ میں ضعیفہ کی باتیں سن سن کے اس قدر حیرت میں  
 تھا کہ میں نے لڑکوں سے کہا سنو۔ میں اپنے اوپر اُٹھارے کھانے کو حرام سمجھتا ہوں جب تک  
 یہ نہ بیان کر دو کہ یہ کون خدا کی پاک بندی ہے اور اسکی دستان کیا ہے۔ ”اُنوں  
 نے کہا ”ہمیں بیان کر دینے میں کوئی عذر نہیں۔ یہ ہماری والدہ ہیں۔ چالیس برس  
 ہوئے جب سے سواقرآن کی آیات کے اور کوئی لفظ انکی زبان سے نہیں نکلا۔ اور  
 انھوں نے اس خوف سے اور باتیں کرنا چھوڑ دی ہیں کہ مبادا کوئی ایسا لفظ زبان  
 سے نکلیجائے جسکی قیامت کے دن جواب دہی کرنا پڑے۔ ابن مبارک کہتے ہیں میں نے  
 ”نکے تعجب کیا اور کہا ”یہ خدا کی ہر بانی ہے جسکے حال پر ہو جائے“  
 اس قصہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم نے اس عورت میں کس قدر لیاقت پیدا کر دی  
 تھی کہ اپنا ہر کام قرآن ہی سے نکال لیا کرتی تھی۔ اور پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم  
 نے اُسکے دل پر کس قدر پاک اثر پیدا کیا اور اُس نے کتنا اعلیٰ درجہ ارتقا کا دکھا دیا  
 جو شاید کبھی مردوں میں بھی نہ نظر آئے ہو گا۔

اسلہ اور لیا اللہ نے ابراہیم کو دوست اور بات کی اللہ نے موسیٰ سے بات کرنے کو اسے بچلے تو  
 کتاب کو مضبوطی سے اسلہ پس بھیجوا اپنے میں سے ایک کو اپنے اس روپیہ کے ساتھ شہر کی جانب  
 ناکہ دیکھے کہ کون چیز زیادہ پاک ہو کھانے سے لیے۔ پھر لائے وہ اُٹھا رہے پاس اُس میں سے ٹھوڑی  
 اسلہ کھاؤ اور بروکت کے ساتھ موض اُسکے جو گذشتہ خالی دنوں میں ٹم کر چھپے ہو۔



## اسلام یورپ اور امریکہ میں



فی الحال ایک غیبی تائید سے خود بخود اسلام کا قدم اون ممالک میں جم گیا ہے جن میں اس کے پہلے کسی توسیع کی آواز نہیں مئی تھی۔ ہمارے فتوحات کی ہرین یورپ کے سوا مل سے البتہ کھڑائی نہیں بلکہ بعض ممالک یورپ نے ہمارے آگے سرطاعت ہی جو کا دینا لیکن اس میں شک نہیں کہ یورپ پر ہم اپنا اثر اس قدر نہیں ڈال سکے تھے جس قدر کہ ایشیا اور فریقین عرب میں ہمارے تبلیغ دین کے لیے توجہ کی تھی۔ امریکہ ایسا مقام ہے جسے اُس وقت جبکہ ہم تبلیغ دین میں مصروف تھے کوئی جانتا ہی نہ تھا۔ بہر حال یہ دونوں ملک (پہلا تو جزیرہ اور دوسرا قلمیہ) دین الہی کی برکتوں سے محروم تھے۔

الغالب زمانہ جو ہر قوم کو شہرت کے آسمان پر چڑھا کے ہمیشہ تحت اثری میں پھینک دیا کرتا ہے اس نے اپنی رفتار کے مطابق جب ہمیں بھی ہوا و ہوس کا بندہ و مکبہ کے تحت اثر میں پھینکا تو یہ حالت ہوئی کہ دوسروں کو سمجھانا کیسا ہم کو خود اپنا ہی سمجھانا مشکل ہو گیا اور ایسی بد افلاقیان اور جہالتیں ہم میں پیدا ہو گئیں کہ بالکل گئے گزشتے ہوئے اور ایسے ہو گئے کہ نہ دین ہی کے کام کے رہے اور نہ دنیا کے۔ ایسی حالت میں پیچ پوچھنے تو اسلام بالکل بے بس و بے کس تھا۔

لیکن اس سے زیادہ حقیقت اسلام کی کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ جب خدا نے ہمیں بیکار و یکسا تو خود اپنے دین کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے ہم کو ہماری ہی حالت میں چھوڑا اس لیے کہ اسے قیامت کے دن ہم سے بہت کچھ باز پرس کرنا تھی۔ اور اپنے پاک اور اطمینان کا الہام کو چند ایسے لوگوں کے دل میں بھیجا جو یورپ و امریکہ کے رہنے والے۔ وہاں کے مذاق سے واقف وہاں کی خوبو سے خبردار اور اون ممالک میں تبلیغ اسلام کے لیے ہر نفس سے زیادہ مناسب ہیں۔ اور جس طرح عرب کے جاہلون کی ہدایت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تھا جو انہیں لوگوں کے ہم قوم اور انہیں کے ہم مذاق تھے اسی طرح خدا نے یورپ کی ہدایت کے لیے مسٹر کوٹلیم کو اور امریکہ والوں کی رہبری کے لیے



مسٹر لکزنڈروب کو پیدا کیا۔ اور بالکل وہی ہوا جو خداوند جل و علانے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے کہ ”ہم نے تم ہی میں سے ایک رسول تمہارے پاس بھیجا۔

بے شک ہمارے لیے یہ تھوڑی عمرت کا معاملہ نہ تھا کہ باوجود مسلمان ہونے کے خدا نے یہ دینی کام لینے کے لیے ہم میں سے کسی کو منتخب نہیں کیا۔ اور اس نعمت سے ہم یوں محروم رکھے گئے۔ اور اس عمرت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہم اپنے گناہوں سے توبہ کرتے۔ اپنے اخلاق کو درست کرتے۔ اور جہاں تک امکان میں ہوتا اور خدا کے بھیجے ہوئے فرشتوں کی اعانت و قدر کرتے جو کو تسلیم اور رب کے نام سے یورپ و امریکہ میں ظاہر ہوئے ہیں لیکن نہیں ہم کو اب بھی عمرت نہیں ہوتی۔ اور آج تک گویا ہم یہ سمجھتے ہی نہیں کہ قدرت نے دینی کام میں ہماری طرف سے کتنی بڑی بے پروائی کی۔ اور خدا نے کس وضاحت کے ساتھ بتا دیا کہ ہم کتنے بڑے مورد غضب ہیں۔

لیکن نہیں ہماری بد اعمالی اس حد سے بھی زیادہ گزری ہوئی تھی کہ ایسے عمرت کا موقع ہم صرف سکوت ہی کیے بیٹھے رہتے۔ یا ہم سے فقط بے حسی اور لامہدائی ہی ظاہر ہوتی نہیں ہم اور ان معصوموں کو بڑا بھلا بھی کہہ۔ ہے ہیں جو تمام گزشتہ گناہوں سے توبہ کر کے ابھی ابھی پاک و صاف ہوئے ہیں۔ اور جن پر ہمت لگانا صرف گناہگار ہونا ہی نہیں ہے بلکہ خدا کی ناشکری کرنا ہے۔ اور کافر کے لنوی معنوں میں شامل ہو جانا ہے۔

واقعی ہم سے زیادہ بدتر شاید کوئی قوم نہ ہوگی۔ ابھی چند روز ہوئے لکزنڈروب حیدر آباد میں تھے۔ ایک لائڈز شخص نے ان سے مل کے کہا: آپ مسلمان تو ہوئے ہیں لیکن اگر یہ بیان کے مسلمانوں کی حالت و کمین گے تو آپ دین اسلام کو بُرا کہنے لگیں گے۔ لکزنڈروب نے نہایت معقول جواب دیا جو حقیقت آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اور انہوں نے کہا: میں مسلمانوں کو دیکھ کے مسلمان نہیں ہوا ہوں۔ بلکہ میں اسلام کو دیکھ کے مسلمان ہوا ہوں۔ ہماری طرح سے مسٹر ڈوب کے اس جواب کی داد دینے کو تو غالباً سب ہی موجود ہو جائیں گے۔ لیکن اس پر غور کرنے والا اور عمرت ماحصل کرنے والا شاید کوئی نہ نکلے گا کہ سوال کرنے والے نے کتنی سچی اور پتہ کی بات کہی تھی۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس لائڈز کا یہ جملہ کسی اعتبار سے غلط ہے؟ یا اس میں کوئی متعصبانہ مبالغہ ہے؟ ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ بے شک ہم ایسے ہیں کہ ہم کو دیکھ کے مسلمان ہونا درکنار لوگوں اور

اولے مرتد ہو جائیں تو تعجب نہیں۔

عرصہ سے ہندوستان میں مسلمان کو شش کر رہے تھے کہ کسی واعظ کو تبلیغ دین کے لیے انگلستان روانہ کریں جو انگریزی میں اس فصاحت سے دین الہی کی منادی کرے۔ وہاں کے لوگ اسلام کی حقیقت کو سمجھیں اور ان کے دل پر اس کے پند و نصائح کا اثر ہو۔ باوجودیکہ اس بارہ میں بہت جستجو کی گئی مگر آخر الامر یہی ثابت ہوا کہ بیان کے مسلمانوں میں ابھی کوئی اسکی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اور یقین ہو گیا کہ سو برس کی تعلیم کے بعد ایسے مسلمان پیدا ہوں تو ہوں ابھی کوئی نہیں ہے۔ اس وقت کو خدا نے ایک بیک یون رن کر دیا کہ بہت تعلیم یافتہ اور خوب سوچ سمجھ کے ایمان لائے والے ورہم سے بد رجہاز باوجود ہرچیز مسلمان اور انہیں کی قوم میں پیدا کر دے جو انکی خوب سے واقف ہوں اور ان کے مذاق سے چروار ہوں۔ اور وہاں تبلیغ دین کے لیے تمام دنیا کے واعظوں سے اچھے ہو سکتے ہیں۔ شرم کی بات ہے کہ قدر کرنا درکنار ہم اولے انکی آزار دہی پر آمادہ ہو جائیں۔

اس بارہ خاص میں سب سے زیادہ جمالت اور نالائق کا اظہار مدراس میں ہوا۔ سنا جاتا ہے کہ مشروب مدراس والوں کے حسب الطلب جب مدراس میں گئے تو صرف اتنی بات پر کہ مشروب لے اذان سنتے وقت موزن کی زبان سے ددا شہد ان محمد رسول اللہ سن کے انگوٹے نہیں چومے تھے۔ ان کو دغا باز۔ مکار سب ہی کچھ سمجھ لیا گیا۔ اور سخت ناراضی ظاہر کی گئی۔ ہم اس موقع پر کوئی فتنی بحث نہیں چھیڑنا چاہتے ورنہ یہ بھی پوچھتے کہ انگوٹوں کا چومنا ہے کیا۔ اور اس کا ثبوت کہاں سے ہے۔ لیکن اتنا کہنے پر مجبور ہیں کہ اس سے زیادہ جہالت شاید کسی قوم سے نہ ظاہر ہوگی جیسی کہ مشروب کے مقابلہ میں مسکیمون سے ظاہر ہوئی۔ مشروب جو ابھی نئے مسلمان ہوئے ہیں۔ جن کو توحید و سالمت کے اہم مسائل کے سوا اور کسی طرف توجہ کرنے کا ابھی موقع نہیں ملا ہے۔ جو اپنی زبان کے سوا عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ اردو کسی ایسی زبان سے واقف نہیں ہیں جس میں مسائل دینی لکھے ہوئے ہیں اور جو دراصل ہنوز کسی جزئی مسئلہ کی پابندی کے مکلف ہی نہیں ہیں ان پر اعتراض ہی کیا گیا تو کس مسئلہ کا جو خود اہل سنت میں بتایا سے زیادہ مختلف فیہ ہے اگر ایسا ہی اسلام یورپ میں پھیلا نا ہے کہ تثلیث کے ابطال سے پہلے وہابی بدعتی یا سنتی شیعہ کے مسائل چھڑ جائیں تو ہمارے نزدیک شاید وہ

اب بہ مقابلہ اوس حالت کے اچھے مین جسکی طرف بلاتے جاتے ہیں۔

ہم تو یہ خیال کرتے ہیں کہ مشروب اور شر کو ٹیلیم کا اسلام ہمارے اسلام سے ہر جہاں  
اچھا اور بالکل وہ خالص اور ٹھیکہ اسلام ہے جس کی طرف تیرہ سو برس ہوئے ہمارے  
پیغمبر (روحی فدہ) نے اہل عرب کو بلایا تھا۔ وہ جانتے ہیں کہ خدا ایک ہے۔ وعدہ الایثار  
ہے۔ اوسکے کوئی بیٹا نہیں۔ تثلیث باطل ہے۔ شرک بڑا بہاری گناہ ہے۔ قرآن  
کلام الہی ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اوسی طرح پیغمبر برحق ہیں جس طرح تمام انبیاء  
تھے۔ آپ خاتم الرسل ہیں۔ اور گو آپ بعد آئے مگر یہ مخاطب اغراض نبوت آپ کی شان سب  
سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہی اعتقادات ہیں جن کی طرف آن حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام  
ساری دنیا کو بلاتے تھے۔ اور یہی اعتقادات ہیں جن پر شر کو ٹیلیم اور مشروب پر  
لائے ہیں۔ اور جنکی طرف اپنے ہم وطنوں کو بلاتے ہیں۔ جن لوگوں نے قرآن پاک  
کو سوچ سمجھ کے پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اسلام کا مقصود سوا اسکے کہ شرک کی بیخ کنی  
ہو جائے اور کچھ نہ تھا۔ نہ کوئی شرک کی رسم رہے نہ کوئی شرک کا شاہد باقی رہے۔  
جسے کہ مسلمانوں کے حرکات و سکنات سے بھی توحید کی شان نمایاں ہو۔ دیکھو قرآن میں  
اول سے آخر تک ہر مقام پر صرف شرک کی مخالفت ہے اگر قصہ ہیں تو اون کا نتیجہ بھی یہی  
نکلتا ہے اگر مسائل ہیں تو اسی قسم کے۔ مگر افسوس کہ ہم نے اسلام کی غرض شاید  
توحید کے سوا کسی اور چیز کو سمجھ لیا ہے۔

آنحضرت صلی علیہ وسلم کے مبارک عہد میں نہ خلافت کے جگڑے تھے۔ نہ ابو بکر و علی کی پارٹیاں  
تھیں۔ نہ ادن میں سے کسی کی بے انتہا تعریف کی جاتی تھی نہ کسی کو گالیان دی جاتی  
تھیں۔ نہ فقہائے اربعہ کی فقہ تھی۔ نہ محدثین کی کتب حدیث۔ نہ شیعہ تھے نہ سنی۔ نہ  
معتزلہ تھے نہ اشاعہ۔ نہ وہابی تھے نہ بدعتی۔ ایک سید ہا سادہ اسلام تھا جس میں  
چون و چرا کی بہت کم گنجائش تھی۔ یہی اسلام تھا جو آنحضرت کے مبارک زمانہ میں تھا  
اور یہی اسلام ہے جو اب مسٹر کو ٹیلیم کے دلون میں القا ہوا ہے۔ جو اسلام ان لوگوں  
میں شروع ہوا ہے اوسکا دامن اون دہیوں سے بالکل پاک و صاف ہے۔ جو  
ہماری نالایقیوں کی وجہ سے ان گزشتہ تیرہ سو برس کے اندر دامن اسلام  
پر لگائے گئے۔ عبرت کا مقام ہے کہ اپنی اصلاح درکنار ہم جانتے ہیں کہ اپنی

طرح ان لوگوں کو بھی انہیں فساد انگیز جگہوں میں ڈال کے مبتلا کر دیں۔ ہم کو تو چاہیے تھا کہ ان لوگوں کی مثالوں کو دیکھ کر اور اپنی اصلاح کرتے۔ نہ کہ اپنے ساتھ انکے ہی خراب کرنے کی کوشش کریں۔

سب سے زیادہ لوگوں کو اس امر میں خدہ کا ذکر ناگوار ہوتا ہے یہ آواز ابتداً کئی بار سرسید کے گروہ سے سنی گئی تھی۔ لیکن جہاں تک دریافت کرنے کا موقع ملا یہ معلوم ہوا کہ خود سرسید کو تازہ مسلمانان یورپ و امریکہ کے ایمان میں تو کوئی شک نہیں مگر ان کا خیال کسی مصلحت سے یہ البتہ ہے کہ مسلمانان ہند کو پہلے روپیہ اپنے ہی اصلاح میں صرف کرنا چاہیے۔ اور ان کا یہ کہنا اور انکے لیے کسی حد تک زیبا بھی ہے۔ کیونکہ ادھون نے ایک بہت بڑے کام کو اپنے ذمہ لیا ہے اور دراصل وہی ایک کام کر سکے ہیں جس کو قوم کی تاریخ میں ایک وقعت کے ساتھ جگہ دی جاسکے۔ اور اس بنا پر اگر وہ اپنے معاملہ میں خود غرضی کریں تو ان کا حق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جو خود قوم سے روپیہ کے طالب ہیں۔ اور یہ عام قاعدہ ہے کہ ایک مانگنے والا ہمیشہ یہی کہے گا کہ جو کچھ ہو میں کو دو اور ہم سے زیادہ کوئی مستحق نہیں۔ مگر وہ لوگ جو روپیہ کے دینے والے ہیں وہ بجائے خود خیال کر سکتے ہیں کہ مسلمان سب بھائی ہیں اور سب کی اعانت ایک ذمی استطاعت پر فرض ہے۔ ان تمام فرائض میں سے جو جس فرض کو پورا کر دے سمجھنا چاہیے کہ اس نے اپنا قومی یا دینی حق ادا کیا۔ اور اگر قیاسات کی بناء پر ترجیح کی بحث کی جائے تو ہم کو یہ کہنے کا پورا موقع ملے گا کہ ہمارے نزدیک تو سب سے پہلے ہمیں کو ان مسلمانان یورپ کی مدد کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک مسلمانان ہند کی دولت کی مار کھائے ہوئے (مسلمانان ہند سے ترقی کی کبھی امید نہیں کی جاسکتی) اگر اب اسلام ترقی کر سکتا ہے تو اسی وقت جبکہ جدید ترقی یافتہ قومیں الم اسلام کدھے پر لکھ کے علمی جہاد شروع کریں۔ لہذا جبکہ جو کچھ دینا ہوا انہیں لوگوں کو دے۔ اور اپنے لیے کوئی کوشش کرنا تو ایک لاعلاج مرض کا علاج کرنا ہے۔ شاید بعض حضرات کو ہمارا یہ خیال ناگوار ہو گا۔ کیا کریں۔ مجبوری ہمیں اپنی اصلی رائے ظاہر کرنے پر مجبور کیے دینی ہے ابھی چند روز ہوئے مغز لوکل سمعہ اتحاد کے کالمون میں کئی مراسلہ اسی شکایت میں شائع ہوئے تھے کہ مسلمان کیوں ایسی بے وقوفی کر رہے ہیں جو اپنا روپیہ لیور پول یا

۱۔ والون کو دے رہے ہیں۔ اون مضامین میں بہت کوشش کی گئی تھی کہ مسلمان اوس آواز کو سنیں اور اپنی ایسی دیندارانہ فیاضیوں سے ہاتھ روکیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں نے نور پول والون کو دے ہی کیا دیا جس پر یوں لٹ جانے کی دہائی مچائی گئی۔ تمام روپیہ جو پرس بہر کی کوشش سے فراہم ہوا اوس کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ پھر اگر پانچ کروڑ آدمیوں نے دس ہزار بارہ ہزار روپیہ دے دیے تو کون بڑی فیاضی کی۔ یہ وہی ہندوستان ہے جو لاکھوں روپیہ چندہ مجروحان روم اور نہر زبیدہ کی مرمت میں دے چکا ہے۔ کیا اشاعت اسلام کا کام اون کاموں سے بھی اونے ہے؟ یہ بات کسی طرح سمجھی میں نہیں آسکتی کہ اون چند دن کے وقت ہندوستان کی مفلسی اور اپنے مصائب کا ذکر کیوں نہ رویا گیا۔ اگر آپ نے دس بارہ ہزار روپیہ دے دیے تو اون کا کونسا کام مکمل کیا۔ بیچارے جن اغراض کے لیے کمر بہت باندھ ہی ہے اونکو ابھی تک استقلال کے ساتھ اور اپنی آرزو کے موافق شروع ہی نہیں کر سکے۔ اور کیونکر شروع کر سکتے ہیں یورپ میں کسی اہم کام کا چیلر نا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ وہ ان ایشیا کی طرف کوئی کام تو دے رہا یہ سب سے نہیں چل سکتا۔

الگز نڈرو ب نے ان دنوں سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اور قریب قریب کل بڑے شہروں میں جا کے اپنے اغراض مسلمانوں کے سامنے بیان کیے۔ انہوں نے ایک خاص دینی غرض کے لیے اتنی ہزار روپیہ کی ضرورت بیان کی تھی آج تک امید نہیں کہ اس رقم کی فراہمی کی صورت بھی پیدا ہوئی ہو۔ اور پھر انہوں نے اس کام میں بعض مقامات کے متعصب یورپین حکام کے ہاتھوں جو سختیاں برداشت کیں وہ اس ناکامی کے علاوہ ہیں۔ الگز نڈرو ب کو ہم نے دیکھا۔ ہم ہی نے نہیں ہمارے ساتھ ہزاروں آدمیوں نے دیکھا۔ ہر طرح سے انکے خیالات اور ارادوں۔ اور اون کے عقائد اور نیت کی جانچ پڑتال کی۔ او قطعاً طور پر ہر شخص نے اپنا اطمینان کر لیا کہ ایسا آدمی ہرگز فریبی اور مکار نہیں ہو سکتا۔ ہمارے دوست جنہوں نے غالباً ایک پیسہ ہی ان اغراض کے لیے اپنی جیب سے نہ دیا ہوگا اور صرف اوروں کی فیاضیوں کے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں اونکو کبھی اس پر غور کرنا تھا کہ ہندوستانی جو کچھ دے رہے ہیں وہ صرف اپنے اسلام اور اپنی دینداری کے اظہار کے لیے۔ ورنہ جو کام ہونے والا ہے وہ انکے روکے نہ رکھے گا۔ خدا نے

حس طرح ان پاک نداد لوگوں کے دل میں اسے امام کے ذریعہ سے اسلام کا نور جمایا۔ اور تبلیغ دین کے واسطے ان غیبی فرشتوں کو کھڑا کر دیا اسی طرح وہ دوسرے کا بھی سر انجام کر دیگا۔ جس کام کو خدا نے چاہا ہے وہ کئے والا نہیں ہے۔ سہم قیاس کر سکتے ہیں کہ یورپ و امریکہ میں اسلام پھیلانا خدا کی مرضی میں ہے۔ اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ایسے لوگوں کو پیدا ہی نہ کرتا جو ہماری بنے تو جی سے: تو ان لوگوں کا کچھ بگڑے گا اور نہ یہ کام کر کے گا۔ ہاں اللہ یہ نجات ہو جائے گا کہ ہم کیسے مسلمان بنیں اور ہم کو اسلام سے کمان تہمت تعلق ہے۔ ہماری مال لایق کا اثر خود ہمیں پر پڑے گا۔ ۱۔ ہمیں اس جرم میں پکڑا سے جائیں گے۔

کتنے ٹرے افسوس کی بات ہے کہ نور افشان اور چنڈا اوس کے ایسے دیگر عیسائی اخباروں کے ساتھ چنڈ مسلمان اجا۔ یہی اس امر میں اوس کے ہم زبان اور ہم مذاق نظر آتے ہیں۔ اور اوس کے ہاتھوں ہی اسلام پر وہی ظلم ہو جو تعصب سیموں کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔

ہمیں اس مخالفت کے پر وہ میں بعض پارٹی فیڈنگ والے بھی نظر آتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض غیر مقلد ایسے اختلاف پر جسے ہوئے ہیں کہ یہ نو مسلم مقلد ہونگے۔ اسی طرح بعض حضرات شیواں خیال میں ہیں کہ یہ لوگ سُنی ہونگے۔ لیکن ہمیں ایسے لوگوں کی سمجھ پر نہیں بلکہ مسلمانوں میں ایسے لوگوں کے موجود ہونے پر شرم آتی ہے۔ اول تو ابھی کون جان سکتا ہے کہ یورپ کے مسلمان کون ہونگے۔ اور کس طریقہ کو پسند کریں گے۔ کیونکہ ابھی تک وہ ان مباحث میں پڑے ہی نہیں۔ اور اگر بالفرض کسی فرقہ میں ہوں ہی تو کیا مضائقہ ہے۔ مسلمان تو ہونگے۔ اہل قبلہ میں تو اون کا شمار ہوگا۔ توحید و رسالت پر تو ایمان رکھیں گے۔ مگر افسوس تعصب نے ہمیں اسلام کے اغراض اس قدر بھلا دیے ہیں کہ ہم نے صرف فروعات کو ایمان سمجھ لیا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک شاید نہ خدا پر ایمان لانا موجب نجات ہے۔ نہ رسول پر ایمان لانا۔ موجب نجات ان کے نزدیک اگر سُنی ہیں تو ابو بکر و عمر کی محبت۔ اگر شیعہ ہیں تو علی کی ولایت اور امام حسین کی شہادت۔ اگر مقلد ہیں تو ائمہ اربعہ کی تقلید۔ اور اگر غیر مقلد ہیں تو محدثین کی صرف زبانی تعریف۔ اگر بدعتی ہیں تو قبروں کے آگے سجدہ کرنا۔ اور اگر وہابی ہیں تو بزرگان دین کو گالیان دینا۔ یہ ہے وہ اسلام کی طرف ہمارا ہر فریق تازہ ایمان لانے والوں کو بلاتا ہے۔ لیکن ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ان سب کے اسلام سے وہ اسلام اچھا اور پاک و صاف ہے جو مسٹر کوٹلیم اور مسٹر ب

دل میں ہے۔ خدا مسلمانانِ یورپ کو ان آفتوں سے بچائے۔ اور اگر وہ بھی ان بلاؤں میں پھنسے تو پھر ترقی اسلام کی کوئی اُمید نہ باقی رہے گی۔

اسلام کی اصلی غرض توحید تھی۔ جو اول سے آخر تک قرآن پاک کی ہر آیت سے محکم نظر آتی ہے۔ جب تک صحابہ صرف اوس غرض کو پورا کر رہے تھے اور توحید کے سوا کوئی خیال اونکے ذہن میں نہ جاتا تھا اوس وقت تک خدا نے اونکی ایسی مدد کی جو دنیا میں ہمیشہ یا دو کار رہے گی۔ لیکن مسلمان نے ادھر اوس غرض کو چھوڑا اور اُدھر خدا نے اپنا برکت اور اعانت کا ہاتھ اون کی جماعت پر سے اٹھالیا۔ بعد والے مسلمانوں کا کیا ذکر ہم تو کہتے ہیں کہ جس وقت علی اور معاویہ کی سہمہ روسی کے خیالات پیدا ہوئے اوس وقت خدا نے خود صیاب کی مدد کرنا چھوڑ دی اور گویا اوسی وقت سے عمارت اسلام میں زوال کی دیمک لگ گئی۔

اب تو اس بات کا زمانہ ہے کہ ان سب جھگڑوں کو ہم چھوڑیں اور اوس وعدہ لاشریکہ کی طرف توجہ کریں جو ہر مصیبت سے انسان کو نجات دلاتا ہے۔ کیونکہ بغیر اوسکی مدد کے کچھ نہیں ہو سکتا۔

## حاتم طائی

یہ عجیب و غریب بات ہے کہ جن لوگوں کے نام شب و روز ہماری زبان پر رہتے ہیں ان کی حالات سے واقف ہونا درکنار ہم یہی نہیں جانتے کہ وہ تھے کون۔ ہر قوم کی سوسائٹی اور ہر زبان کے عام محاورات میں چند ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کا نام کسی خاص صفت کے موقع پر ہر خاص و عام کی زبان سے سنا جاتا ہے۔ اور ہر کچھ ہی اون ناموں کو اون اوصاف کا ہیہ و خیال کرتا ہے جن کے اظہار کے لیے وہ نام بار بار لیے جاتے ہیں۔

اوپر مذکورہ ہو گا جنہوں عامری کا نام کسی نہ کسی پہلو سے یاد ہی آجائے گا۔ حسن کی تعریف کی جاتی ہوگی تو ممکن نہیں کہ یوسف صمدیق کا معجزہ حسن نہ پیش کر دیا جائے۔ اور اسی طرح جب سخاوت کا تذکرہ چڑے گا تو حاتم کا نام خواہ مخواہ کسی نہ کسی کی زبان سے نکل ہی جائے گا۔ ایسے لوگوں کو عموماً قومیں اور بڑی بڑی سوسائٹیاں اون اوصاف کا

شہر کمال تسلیم کرتی ہیں جن کے ساتھ کہ ان کے نام کو مناسبت ہے اسی قسم کے لوگ اگلی قوسوں میں خاص اوصاف کے دیوتا مانے جاتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہمارے ذاتی توجہ سے بدل نہ دیا جوتا تو اس قسم کے اون لوگوں کو جو ہماری سوسائٹی میں کسی خاص صفت سے ساتھ مشہور ہیں ہم بھی دیوتا ہی مانتے۔

روح پرست کی بات ہے کہ اس قسم کے وہ لوگ جو ہماری سوسائٹی میں مشہور ہیں اون کی شہرت تو اس قدر ہے کہ شاید دنیا بھر اسلام کا کوئی بچہ بھی ان کے نام سے ناواقف نہ ہو سکے لیکن یہ کتنے بڑے غضب کی بات ہے کہ اون میں سے شاید ایک ہی آدمی ایسا شخص ہو جس کے حالات زندگی سے ہمیں کسی قدر واقفیت ہو۔ گذشتہ نمبر میں ہم مجذوب عامری کے حالات پر سے لاعلمی کا پردہ اڑھانے میں آج ہمیں حاتم طائی کا نام یاد آ چکا ہے جس نے مغرب کے سوانح عمری نویس سے بھی زیادہ تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں۔ حاتم طائی کا ایک قصہ اردو کی اونے سوسائٹیوں میں شائع ہے۔ جو اپنے مقام پر ایک جہولی سی داستانِ افسانہ ہے۔ اون حالات کے خلاف نیچر اور بالکل مہمل و بے سرو پا ہونے کے علاوہ قیامت تو یہ کی گئی ہے کہ اس قصہ میں حاتم کی حالت اور اس کے کیرئیر کا بھی پتہ نہیں ملتا۔ رومیون اور یونانیوں نے اپنے دیوتاؤں کی مٹھالوجی (دیوبانی) بیان کرنے میں انقدر بندی کا وہ کمال نہ دکھایا ہوگا جو مسلمانوں نے حاتم کے حالات بیان کرنے میں دکھایا ہے۔ بہر تقدیر ہمیں افسوس ہے کہ حاتم کا ایسا نامور شخص اور اس کے اصلی حالات یوں لاعلمی کے پردے میں چھپے ہوئے ہوں۔ اور اسی وجہ سے آج ہم حاتم طائی کے وہ حالات بیان کرتے ہیں جو واقعی ہیں اور جھگے جانے کی لوگوں کو ضرورت ہے۔ جاہلیت میں چار آدمی ایسے تھے جن سے زیادہ فیاضی کا اظہار اور کسی شخص سے نہیں ہوا حاتم بن عبد اللہ طائی۔ تھرم بن سنان۔ فزالد بن عبید اللہ۔ اور کتب بن مائتہ المایادی۔ انچہ ان چاروں کی فیاضیوں کی دہم تھی مگر حاتم اور کتب ایسے تھے کہ جو دو سخا میں ضرب المثل قرار پائے۔ اور گمرون کی بیٹھنے والیاں تک ان کو مجسم فیاضی خیال کرتی تھیں۔ خاصیت حاتم طائی کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ تو شاید دنیا میں کسی کو بہت کم نصیب ہوئی ہوگی۔ کعب کا واقعہ تو یہ ہے کہ ایک مرتبہ سفر میں پیاس کی شدت تھی۔ اور اس وقت کہ وہ دم کلا جاتا تھا۔ ایک دوست ہی ساتھ تھا۔ جسکی بھی یہی حالت ہو رہی تھی۔ اتفاقاً اتنا



پانی ایک مقام پر مل گیا جس سے ایک شخص پیاس بجھا سکے کعب نے وہ پانی تو اپنے دوست کو بلا دیا اور خود اوسی تشنگی میں تڑپ تڑپ کے جان دی۔ اس میں شک نہیں کہ کعب نے ایسے موقع پر فیاضی کا ثبوت دیا جس وقت شاید کسی سے نہ ہو سکتا لیکن چونکہ اوسکی زندگی کا صرف ایک ہی واقعہ معلوم تھا لہذا اہل عرب میں اوس کے نام کی اتنی شہرت نہیں ہوئی جتنی کہ حاتم کے نام کی۔

حاتم طائی کا نام سارے عرب میں اس قدر ہر دل عزیز تھا کہ ہم قیاس کرتے ہیں شاید اُن حالات بیان کرنے میں ہی کسی قدر بہالغہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ اوسکی فیاضی کا ایک ایسا نمونہ بتایا جاتا ہے جو بالکل خلاف قیاس ہے۔ عموماً عرب لیتے ہیں کہ جب حاتم مر تو لوگوں نے تجویزی کی کہ اوسکے بھائی کو سرداری فوج کے لیے منتخب کریں۔ حاتم اور اس خلیفہ عموماً بھائی کی عذوہ مان ہنوز زندہ تھی۔ یہ تجویز سن کے بہت بگڑی اور کہا در بھلا اس کو (دوسرے بھائی کو) حاتم سے کیا نسبت ہے جو اوسکے مقام پر بٹھایا جائے۔ خدا کی قسم حاتم جب پیدا ہوا ہے تو اوس نے سات و ناک کسی طرح دودھ نہیں پیا۔ جب میں ایک بڑا اوس کے غریب بچے کو دودھ پلا لیا تب اوس نے دودھ پینا شروع کیا۔ اور اس (دوسرے بھائی کا) یہ حال تھا کہ ایک طرف تو دودھ پیتا تھا اور دوسری چھائی پر ہاتھ رکھ رہتا تھا کہ کوئی اور نہ پی جائے۔

عہد جاہلیت میں اہل عرب میں تاریخ نہ تھی اور نہ اونسکے وہاں کوئی سلسلہ تاریخ نگاری کا تھا۔ اسی وجہ سے اوس زمانہ کے لوگوں کی تاریخ ولادت و وفات کا پتہ لگانا محال ہے۔ جاہلیت کی لڑائیاں جو ایام عرب کے نام سے نامزد ہیں اونسکے مختصر حالات تو معلوم ہو جاتے ہیں مگر اون میں سے ایک کے متعلق بھی یہ پتہ مشکل سے لگتا ہے کہ کس تاریخ اور کس سنہ میں ہوئی۔ لہذا ہم نہیں بتا سکتے کہ حاتم کس دن پیدا ہوا اور کب مرا۔ مگر یہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کے مبعوث ہونے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ اور اوسکے بیٹے اوس وقت موجود تھے جب عرب نے دین اسلام اختیار کیا ہے۔ حاتم کے بیٹے عدی نے جب آنحضرت کی مخالفت پر آمادگی ظاہر کی تو آپ نے حضرت علی کو مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ لڑائی ہوئی اور عدی شکست کھا کے مع اپنے اہل و عیال کے ملک شام میں بھاگ گیا۔ اوسکی بہن سفانہ بنت حاتم چھوٹ گئی اور اوسکے ساتھ نہ جاسکی

حکیم جناب علی گرفتار کر کے مدینہ میں لائی اور آنحضرت کے سامنے پیش کیا۔ آپ کے سامنے آتے ہی سفانہ نے کہا: "افسوس اباجان کا انتقال ہو گیا۔ بہائی نے بہاگ کے اپنی جان بچائی۔ مناسب ہو تو مجھے چھوڑ دیجیے اور مجھے ذلیل کر کے تمام قبائل عرب کو قریب نہ کیجیے۔ میرے والد سردار قوم تھے۔ اور میں حاتم طائی کی بیٹی ہوں۔" اس کے ساتھ ہی سفانہ نے حاتم کے تمام اوصاف بیان کرنا شروع کیے۔ آنحضرت نے سُن کے فرمایا: "وہ اسے لڑکی۔ یہ سب تو خاص مسلمانوں کے اوصاف ہیں۔" اسکے بعد آپ نے صحابہ کی طرف دیکھ کے فرمایا: "کوئی امیر قوم غریب ذلیل ہو جائے تو اوسکی عزت کرو۔" پھر آپ نے سفانہ کے چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ اور اوسپر بہت کچھ احسان کیا۔ سفانہ نے عرض کیا: "جسے اپنی اجازت دیجیے کہ آپ کے حق میں چند دعائیہ کلمات کہوں۔" آپ نے اجازت دی اور وہ دعائیں دیکے رخصت ہوئی اور اپنے بہائی سے جاملی۔ وہاں جا کے اس غمگینی کے ساتھ آنحضرت کے محامد بہائی سے بیان کیے کہ دونوں بہائی بہن سید اہل و عیال کے حاضر ہوئے اور صدق دل سے ایمان لائے۔ سفانہ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ بھی فیاضی میں بالکل اپنے آپ پر پڑتی تھی۔ حاتم اپنے اونٹوں میں سے چند اونٹ اوسکو دیتا تھا اور وہ ہمیشہ غریبوں کو دیدیا کرتی تھی۔ آخر یہ رنگ دیکھ کے ایک روز ہاتھ نہ لگا کر بیٹھی۔ مال و دولت پر جب دستوں جمع ہو جائیں گے تو اوسے تیار کر دیں گے۔ یا تو تم سخی۔ یہ اور میں خلیل بنوں اور یامین سخی ہوں اور تم بخل ہو جاؤ۔" اسکے جواب میں سفانہ نے کہا: "اباجان میں نے یہ عمدہ اخلاق آخر آپ ہی سے سیکھے ہیں،" خیر حاتم کی اس نصیحت پر سفانہ فطرۃً عمل نہ کر سکتی تھی مگر حاتم کی بی بی اس غرض کے لیے نہایت مناسب تھی۔ جو اوسنی ہی بخل تھی تبنا وہ فیاض تھا۔ حاتم کی کیفیت ابوسفانہ اور ابوعدی تھی۔ اور اس سے بہہ لگتا ہے کہ دونوں اولادوں اور سے بڑا پر محبت تھی۔ عرب کے معمولی بہادروں کی طرح حاتم کی زندگی بھی لوٹ مار پر مبنی تھی۔ مگر اپنے مال غنیمت کا چوتھائی حصہ ہمیشہ لازمی طور پر غریب اور معذوریں کی نذر کر دیا کرتا تھا۔ اوس کا شمار شعراے جاہلیت میں ہے۔ اسکے ساتھ بہادر اتنا بڑا تھا کہ کبھی کسی سے نہیں دبا۔ قول کا اتنا بڑا دہنی تھا کہ جو کہتا تھا وہی کر گزرتا تھا۔ فیاض اتنا بڑا تھا کہ سائل کبھی اوس سے درخواست کر کے خردم نہ رہ سکتا تھا۔ رحم دلی اوسکے

نزلج میں اس قدر تھی کہ میں کسی کو گرفتار کرتا تھا فوراً ترس کھا کے چوڑ دیتا تھا۔  
 فیاضی نے اس قدر ہر دل غریب بنا دیا تھا کہ میں وادی میں جا کے پڑاؤ ڈالتا تھا فوراً اسکا  
 مسکن لوگوں میں مشہور ہو جاتا تھا۔ جاٹوں کی راتوں میں اپنے غلاموں کو حکم دیتا تھا  
 کہ جا بجا مقامات پر آگ روشن کریں تاکہ مسافروں کو معلوم ہو اور آگ کے اوسکے مکان میں  
 یا کوئی راستہ بھول گیا ہو تو آگ کے پاس چلا آئے۔ ماہِ رجب کی تمام قبائلی مصرعین  
 بڑی تعظیم کی جاتی تھی۔ حاتم کا قاعدہ تھا کہ اس میں پہلی سے تیسویں تک ہر روز سٹ  
 فوج کرتا تھا جن سے دور دور تک لوگوں کی صفائی کی جاتی تھی۔ مسافر اور محتاج کے  
 سامنے اسے اپنے تمام مال و دولت میں سے کسی چیز کے ساتھ محبت نہ ہوتی تھی  
 بے تکلف ہر چیز کو دے ڈالتا تھا۔ ہاں اس کے فیاض ہاتھ سے اگر کوئی خیر محفوظ نہ  
 رہا تو اسکا گھوڑا اور تمام سامان جنگ۔ جو دراصل اس کی سپہگرمی کا زیور اور اس کے  
 معاش کا آل تھا۔

ماہِ یونینت عمیر اوسکی بی بی تھی۔ ماہِ یونینتے ملکان نے ایک بار اس سے کہا کہ  
 دو چوچی کچھ حاتم کے حالات بیان کرو، اس پر ماہِ یونینتے نے کہا کہ اور سب باتیں تو خیر  
 ہوتی ہی رہتی تھیں مگر مجھے حاتم کے ایک واقعہ پر حیرت ہو گئی۔ ایک سال قحط پڑا تھا  
 اور ہر طرف بھوک کی ایسی شکایت پیدا ہو گئی کہ لوگ اپنے سولشیوں کو کھا کھا کے بھاگ  
 اترے ہوئے۔ قحط کا اثر ہم پر ہی پہونچا اور ایک دن کھانا نہ نصیب ہوا۔ دن تو بس  
 طرح بنا کاٹ دیا اب رات ہوئی۔ اور بھوک کے مارے ہم دونوں کی یہ حالت تھی کہ کسی  
 طرح قرار نہ آتا تھا۔ اور سب سے زیادہ آفت یہ تھی کہ دونوں بچے عدی اور سفانہ ملک  
 ملک کے دور سے تھے۔ آخر ایک بچہ کو میں نے گود میں لے لیا اور ایک کو حاتم نے اذکو  
 بڑی مصیبتوں سے ہسپلا ہسپلا کے سلایا۔ اور ہم دونوں لیٹ کے باتیں کرنے لگے  
 یہ میں جانتی ہوں کہ حاتم کو مجھ سے زیادہ بھوک لگی تھی۔ اور اوسکی گرسنگی پر مجھے بار بار  
 ترس آتا تھا آخر میں نے خیال کیا کہ انکو کسی طرح نیند آجائے تو اچھا ہے۔ مگر وہ باتیں  
 کیسے جاتا تھا جن سے زیادہ تر میری ولد ہی مقصود تھی۔ آخر میں منہ لپیٹ کے پڑ رہی  
 تاکہ وہ چپ ہو اور غمو شمی میں خواہ مخواہ آنکھ لگ جائے گی۔ حاتم نے دو ایک بار  
 مجھے پکارا مگر جب میں نہ بولی تو سہما کہ میں سو گئی۔ یکایک ایک آہٹ سے معلوم ہوا

کو کوئی شخص تھا۔ سے خیمہ میں آیا ہے۔ حاتم نے اوٹھ کے دیکھا تو ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔  
 پوچھا کون۔ عورت نے کہا حاتم میں تمہارے پاس وہ ایسے لوگوں کے پاس سے آئی ہوں جن کی  
 بھوک کے مارے بہت بُری حالت ہو رہی ہے۔ یہ بھگتے ہی حاتم نے بلاتال کہا۔ اچھا جاؤ اپنے بچوں  
 کو لے آؤ۔ یہ جواب سن کر عورت تو اپنے بچوں کو لینے گئی۔ اور مجھے اس قدر حیرت تھی کہ  
 ضبط نہ ہو سکا اور میں نے تکیہ سے سر اوٹھا کے کہا حاتم ہم خود کئی دن سے تو بھوکے پرے  
 ہیں تم کھلاؤ گے کیا جو اس عورت کے بچوں کو بلایا ہے۔ حاتم نے کہا۔ خدا کی قسم میں تمہارا  
 اور اس کے دونوں کے بچوں کو کھانا کھلا دوں گا۔ یہ کہہ کے چھری ہاتھ میں لی اور اپنے  
 گھوڑے کو پیچ کر لایا۔ آگ روشن کی اور گوشت کے ٹکڑے اس عورت کے ہاتھ میں دیکے  
 بولا لو ہونو اور کھاؤ۔ پھر میں نے اپنے بچوں کو جگایا۔ ہم سب آگ کے گرد بیٹھے کھا رہے تھے  
 اور حاتم نے کہا ہمیں یہ تو بڑی بے فیرتی ہے۔ ہم بیٹھے انیاسیٹ بھر رہے ہیں اور سارا قبیلہ  
 بھوکا پڑا ہے۔ یہ کہتے ہی اوٹھا اور قبیلہ میں ہر ہر خیمہ کے دروازے پر گیا اور کہا آگ کے  
 پاس چل کے کھانا کھاؤ۔ انھیں سارے قبیلہ نے اس گھوڑے کے گوشت میں حصہ  
 لگایا۔ اور خود حاتم صرف بھانے اور محاذاری ہی میں مشغول رہا۔ میں قسم کھا سکتی ہوں کہ اس  
 گوشت میں سے ایک ریشہ بھی اس کے مُنہ میں نہیں گیا۔

اوس کی بی بی ماویہ سب کی زبانی گذشتہ واقعہ بیان کیا گیا۔ اپنے ذاتی بخل کی وجہ سے حاتم کو  
 ہمیشہ لعنت ملاست کیا کرتی تھی۔ مگر حاتم کا قاعدہ تھا کہ کُسن تو سب کچھ لیتا تھا مگر ماویہ  
 تھا جو اس کی فیاضی کا مقتضی ہوتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ حاتم تو اپنی بی بی سے تنگ نہیں  
 آیا مگر اوٹھے ماویہ ہی اس کے ہاتھوں عاجز آگئی۔ ماویہ کو شکایت پیدا ہو چلی تھی کہ  
 مالک نام اس کے ایک ہم قبیلہ ذمی ثروت نے اس سے کہا۔ حاتم کے پاس پڑے پڑے  
 ریشے سے فائدہ جو سب ادھر ادھر لٹا دیتا ہے اور تمہارے بچوں کے لیے بھی نہیں  
 نہیں چھوڑتا۔ حاتم کو طلاق دو۔ اور مجھ سے نکاح کرو کہ تمہارے لڑکے ہمیشہ خوش  
 رہیں۔ ماویہ نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ اور حاتم ایک دن لپٹ کے آیا تو دیکھا کہ بی بی

۱ جاہلیت میں عورتیں بھی مردوں کو طلاق دے سکتی تھیں۔ اگر وہ اپنے شوہر کو طلاق دینا چاہیں تو  
 اس کے لیے یہ طریقہ مقرر تھا کہ بالوں کے جن خیموں میں رہا کرتی تھیں ان کا رخ بدل دیا کرتی تھیں

خمیہ کا رخ پلٹ دیا۔ سمجھا کہ عمر مہر کی رفیقہ سے مفارقت ہوئی۔ اپنے بچوں کو لیکے چلا گیا اور ایک داوی میں جا کے اوترا۔ دوسرے روز پچاس سوار ماویہ کے خمیہ کے گرد آ کے اوترے اس لیے کہ اس خمیہ کو وہ حاتم کا خمیہ خیال کرتے تھے۔ ماویہ پریشان ہوئی کہ ان کی خبر گیری کیونکر کرے۔ ماویہ نے اپنی لونڈی کو مالک کے پاس بھیجا اور کہا اس سے کہنا کہ حاتم کے پچاس مہمان ہمارے ہاں آ کے اوترے پڑے ہیں کچھ بھیجو کہ ہم اون کی خبر گیری کریں۔ اور تھوڑا سا دودھ بھیجو کہ اون کو پلائیں۔ اس کے ساتھ ماویہ نے اپنی لونڈی سے کہا تو یہ کہہ کے مالک کی صورت دیکھنا اگر وہ بن خوشی خاطر اور لبشاش چہرے سے یہ خبر سن دے تو لے آنا اور اگر چین بکسین ہو کے اور ہر ہم و منفص ہو کے دنیا جا ہے تو خبر دار نہ لیا اور خالی ہاتھ واپس آنا اور بیان یہ بھی کہہ دینا کہ یہ صرف آج ہی کی رات کے لیے ہے اس لیے کہ لوگوں کو ابھی یہ خیال ہے کہ یہ حاتم کا خمیہ ہے۔ یہ ضرورت نہ ہوگی۔

غرض لونڈی گئی۔ اور مالک نے یہ پیام سننے ہی غصہ سے اپنا سر پٹینا شروع کیا اور ڈاڑھی نوح کسوٹ ڈالی۔ اور کہا ماویہ سے میرا سلام کہہ کے کہنا کہ اسی لیے تو میں نے تم کو مصلح دی تھی کہ حاتم کا ساتھ چھوڑو۔ اور میرے پاس آنا دودھ نہیں ہے جو حاتم کے مہانوں کے لیے کافی ہو سکے۔ لونڈی جب خالی ہاتھ واپس آئی تو ماویہ نے اسے حاتم کے پاس روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ لوگ جانتے ہیں یہ تمہارا خمیہ ہے اور اس وجہ سے یہاں پچاس مہمان آ گئے ہیں۔ لہذا ایک اونٹنی بھیجو کہ فوج کو رکے کہلا لیں اور اتنا دودھ دو کہ اون کو پلائیں۔ لونڈی حاتم کے پاس گئی اور سارا حال بیان کیا۔ حاتم فوراً دو اونٹنیاں اور بہت سا دودھ لے کے خود آیا اور اطمینان سے بلیٹھ کے مہانوں کو کہلانے لگا۔ یہ حال دیکھ کے ماویہ خمیہ کے اندر سے چلائی در حاتم میں نے اسی وجہ سے تم کو حلاق دی۔

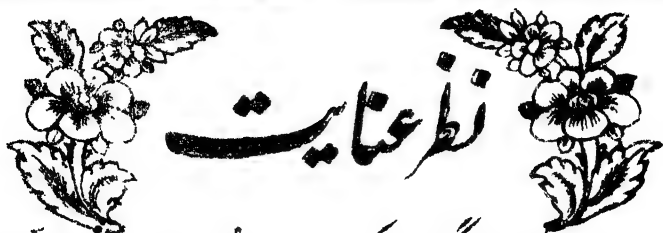
۴۔ فیضہ جد ہر دروازہ جوتا تھا اور ہر پشت کرتی تھیں۔ اور جد ہر پشت ہوتی تھی اور ہر دروازہ کرتی تھیں۔ مرویہ خمیہ کا رخ بدلنا دیکھ کے سمجھ جاتا تھا کہ بی بی کا مزاج بدل گیا اور اس گھر سے علیحدہ ہو جاتے تھے۔

تم مہانوں کے پیچھے دیوانے ہو رہے اور میرے بچے مرے جاتے ہیں ان کی  
 کچھ خبر نہیں لیتے۔ حاتم نے سن کے کہا:۔ ماویہ۔ یہ تمہاری غلطی ہے۔ جس نے  
 پسند کیا ہے وہ سب کے رزق کا ذمہ دار ہے۔ ہمارے دیے اور نہ دیے  
 سے کچھ نہیں ہوتا۔“

حاتم کی ایک اور عجیب و غریب فیاضی مورخین کے ذریعہ سے ہم کو معلوم ہوئی ہے  
 جو اپنی وضع پر ان سب باتوں سے زیادہ قابل حیرت ہے۔ لیکن صرف ایک  
 اسی قصہ سے اس کی طینت کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ ایک بار قبیلہ طے پر  
 کے کسی اور قبیلہ نے حملہ کیا۔ حاتم جو اپنی فیاضی کے برابر ہی جری اور بہادر  
 ہی تھا اسلحہ سے آراستہ ہو کے مقابلہ کو نکلا۔ اور اس بہادری سے مقابلہ  
 کیا کہ سب کو مار کے ہنگا دیا۔ خاصۃً دشمن کے سرگردہ کے تعاقب میں دور تک  
 بڑھتا چلا گیا۔ جس وقت یہ اس کے تعاقب میں چلا جاتا تھا اس نے ہر  
 کہاں حاتم یہ اپنا نیزہ مجھے دیدو۔ اتنا سنتے ہی حاتم نے اپنا نیزہ اوس کی طرف پھینک دیا  
 اور نہٹا واپس آیا۔ حاتم کی اس کارروائی پر دشمنوں کو بھی حیرت ہو گئی۔ جب اپنے  
 لوگوں میں واپس آیا تو سبھوں نے الزام دیا کہ ایسی فیاضی کس کام کی۔ اور اگر  
 وہ لوگ مار ڈالتے۔ یہ سن کے حاتم نے کہا:۔ رہاں یہ تو صحیح ہے۔ مگر جب کوئی کہے  
 کہ مجھے یہ چیز دیدو تو اسکا جواب سوا اسکے اور کیا ہو سکتا تھا۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حاتم نہیں کا لفظ جانتا ہی نہ تھا۔ اور فیاضی  
 اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر کے اس کا بیجر ہو گئی تھی۔ اور ایسے  
 شخص کی نسبت یہ کہنا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس نے بغیر دوسرے بچے کے  
 بلائے اپنی ماں کا دودھ نہ پیا۔

بہر حال حاتم نے اگرچہ اسلام کا زمانہ نہیں پایا۔ اور مشرکین عرب میں اس کا  
 بھی شمار ہے لیکن اس کی فیاضی کی بنا پر امید ہے کہ خداوند جل علاہ اس کے  
 دیگر گناہوں کو معاف کرے گا۔



# نظر عنایت

ہمارے احباب دگلداز کے دوبارہ اشاعت پائے پر مسرت ہیں  
 نہیں ظاہر کر رہے ہیں بلکہ بہت کچھ ہمدردی کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم ان کے  
 فیاضانہ توجہ کو دیکھ کے شکریہ کے بعد ان کی اس توجہ سے صرف اتنی امید  
 کرتے ہیں کہ اگر انکو دگلداز کے کارخانہ کو پوری قوت دینا ہے تو براہ  
 کرم کوشش کر کے صرف ایک ہی ایک خریدار پیدا کرنا اپنے ذمہ  
 لے لیں۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ان کی یہ ہمدردی اس دگلداز  
 کو جو انکو بہت زیادہ عزیز ہے انتہا سے زیادہ مضبوط کر دے گی  
 لیکن خریدار پیدا کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نام لکھ کے  
 بھیج دیں بلکہ ان کی قیمتیں وصول کر کے ارسال فرمائیں۔

مستتم دگلداز



## عاشقانہ مضامین

ہمارے بعض تعلیم یافتہ اور روشن خیال دوست ہی نہیں بلکہ بعض بزرگان قوم ہم پر بڑی سے سے کر رہے ہیں کہ دنگلڈاز کے صفحوں پر ایسے مضامین کیوں شائع ہوتے ہیں جن سے صرف دلی جذبات اور خاصۃً عاشقانہ بتیاہوں کا اظہار ہوتا ہے۔ ہمیں اب کی مرتبہ اپنے گہرے نکل کے معلوم ہوا کہ اکثر اہل الرائے کے نزدیک ہم بہت بڑے قومی خیرم ہیں۔ ہم اس حملہ کو کہیں نہ بھولیں گے جو ہمارے قومی بزرگ اور فاضل مولوی سید حسین صاحب بلگرامی نے پہلے ہی ملاقات میں ہم سے کہا تھا۔ وہ یہ کہ «ایسے مضامین دنگلڈاز کو بہت عمدہ کر دیتے ہیں۔ دنگلڈاز کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہم بے کشتک اسے اپنی عورتوں اور اپنی لڑکیوں کے ہاتھ میں دے سکیں» مولوی سید حسین کا یہ ریمارک بہت قیمتی اور اصل آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ہم ہمیشہ سے تعلیم نسوان کے بہت بڑے طرفدار ہیں۔ مگر افسوس کہ دنگلڈاز کے اس رنگ کو ہم نے اس پہلو سے کہیں نہیں دیکھا تھا۔

پیشتر ہی بار بار ہمارے پاس اکثر لوگوں کے خطوط آئے جن میں ایسے مضامین کی شिका تھی۔ یہ تو ہم نہ کہیں گے کہ ہم نے ان خطوط کی طرف توجہ نہیں کی۔ نہ سن پبلک سے دریافت کرنے کے بعد ہمیں ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ خریداران دنگلڈاز میں زیادہ طرفدار اوسے رنگ عبارت کے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عام لوگوں کو حسن و عشق کی داستان میں اکثر زیادہ مزہ آیا کرتا ہے۔ اور ہے ہی یہ ظالم عشق مزے کی خیر۔ دنیا میں کوئی درد مزے کا نہیں ہے۔ بلکہ فلسفیانہ طور پر درد کو بھی مزیدار تو ہی نہیں سکتا۔ لیکن عشق میں یہ قیامت کی معجزہ نمائی ہے کہ کجخت ہے تو درد مگر مزے کا ہے۔ بہر حال جو کچھ ہو ہمیں بزرگوں کا ادب کرنا چاہیے۔ ایسا لطف کس کام کا جو انسان کو سواؤ پٹنا کرے اگرچہ ہم نے اپنے بتیاہانہ جذبات کی ایک عالم میں دھوم مچا دی۔ توڑے عاشقانہ مضامین نہیں لکھے اور کم بدنام نہیں ہوئے۔ بلکہ بقول میر مرحوم ۶



## ” ہوملی ٹمہر شہر رسوائی “

تاہم اب اون خیالات کو چھوڑتے ہیں۔ اور اپنے اون عاشقانہ فنون اور جنون انگیز دلوں سے توبہ کرتے ہیں۔ بہتر ہو کہ ہمارے ساتھ ہمارے وہ اجباب ہی توبہ کریں جو ایسے جذبات کے والد و شہید تھے۔

قطع نظر اسکے ایک یہ بھی بات ہے کہ جس وقت ہم نے اوس رنگ کو شروع کیا تھا اوس وقت اکیلے ہم ہی تھے جو اوس قسم کی عبارت کے لکھنے والے سمجھے جاتے تھے اب زمانہ نہ بہتہ لوگ ایسے پیدا کر دیے ہیں جو اوس رنگ کی عبارت اخبارات اور رسالوں کے ذریعہ سے شائع کیا کرتے ہیں۔ اور کیا عجب کہ اون میں اکثر ہم سے ہی اچھے لکھنے والے ہوں۔ اب ہمارا جوش پھیکا پڑ گیا۔ اور وہ ہمارے قدیم جذبات دیگر نوجوانوں کے قلم سے ظاہر ہونگے جو ہم سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اور جن کے دل میں عشق کی آگ بڑے جوش و خروش سے بھڑک رہی ہے۔ لہذا جن حضرات کو ابھی توبہ کرنا نہیں منظور ہے وہ اپنے مذاق کے مضامین دیگر ذرائع سے ہم ہو سکتے ہیں۔

آئندہ دگلڈاز کے صفحوں پر تاریخی مضامین نامور متقدمین کی سوانح عمریان۔ یا وہ پولیٹیکل مضامین جن کو قومی اغراض سے تعلق ہو اور انتہا سے زیادہ متم بالشان ہو اور کسی کسی علمی مضامین شائع ہونگے۔ ہاں ایک حصہ ناول ضرور ہمراہ رہے گا جسکے صفحوں پر ضرورت کے اوقات میں کہیں کہیں عشق کی داستان البتہ نظر آجائیگی اسلیے کہ ہزار احتیاط کی جائے ناول کو ہم ایسے خیالات سے نہیں بچا سکتے۔

اگرچہ پالیسی کے اس تغیر سے بہت ہی روکے پھیکے سبب کٹ ہمارے ہاتھ میں رہ گئے ہیں۔ مگر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جتنے الامکان دگلڈاز پہلے سے زیادہ دلچسپ ثابت ہوگا۔ اور جو تاریخی حالات اور جو مضامین اس کے صفحات پر آئندہ شائع ہونگے اون کی نسبت اُمید کیجا سکتی ہے کہ ہر مسلمان اور نہیں اپنا حُر جان بنائے گا۔ یہ دعوے جو دگلڈاز کی اشاعت کے وقت ابداً کیا گیا تھا کہ دگلڈاز آرڈر وولٹر بحرین ایک نئی روح پھونکے گا۔ اس دعوے کی تکمیل کی اب بھی اوس ہی طرح کوشش کی جائے گی جس طرح پہلے کیجاتی تھی۔ بلکہ ہم دعوے کرتے ہیں کہ اب پہلے سے زیادہ ایسے مضامین شائع ہونگے جو اردو زبان میں ایک نوی اور پر جوش جان ڈالیں۔ تاکہ

قومی فیملنگ مین کامیابی کے ساتھ جوش و خروش پیدا کیا جاسکے۔

اس مین کوئی شک نہیں کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم دنگلدار کو ایک شرکا گلدستہ جڑائیں جن دنوں ہم نے اپنا کام شروع کیا ہے اس وقت ایک حد تک ضرورت تھی کہ ہم کو ان کے متوجہ کرنے کے لیے اخلاقی مضامین مین ہم توڑی بہت عاشقانہ باتوں کی چاشنی دیتے رہیں۔ لیکن اب ملک کو خود علمی اور تاریخی باتیں سننے کا شوق ہو گیا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ نوجوانوں کی نگاہ مین عموماً تاریخی باتوں کو ڈھونڈھتی رہتی ہیں۔ اور اس لیے اب کوئی ضرورت نہیں باقی ہے کہ اپنے پرچہ کے ہر دل عزیز بنانے کے لیے ہم اون ذرائع کو اختیار کریں جو اب تجربہ کے بعد ناجائز ثابت ہوئے۔ ان تمام گزشتہ خیالات کی بنا پر ہمیں اُمید ہے کہ دنگلدار اوس قدر نہیں بلکا اب پہلے سے ہی زیادہ قدر دانی اور چسپی کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا

## خاندان نبوت

انگلستان کے نامور اور مستند مؤرخ مسٹر گبن نے خاندان نبوت کی نسبت لکھا ہے کہ ایران کے شاہی خون سے ملا کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان مغز اور شریف بنا یا گیا۔ اگرچہ ہم کو یہ بیان دیکھ کر یقین ہو گیا کہ باوجود ایک بہت بڑی اور عمدہ تاریخ نگار کے مسٹر گبن عرب کی طبائع کا بالکل اندازہ نہیں کر سکے۔ لیکن سرزمین عرب کے حالات گبن نے جس تفصیل سے لکھے ہیں ان کے لحاظ سے یہ قیاس کرنا بھی مشکل ہے۔ کیونکہ کہدیا جاسے کہ اتنا بڑا مصنف اوسے ملک کی تاریخ سے اس درجہ ناواقف تھا جس کے حالات بیان کرنے مین اس نے بہت کچھ تتبع و تحقیق سے کام لیا ہے۔ دراصل ایسا خیال ناواقفیت یا لاعلمی کی وجہ سے نہیں قائم کیا گیا بلکہ اسکی بنا مقصد پر ہے۔ مقصدانہ خیالات کو تحقیق کے لباس مین ظاہر کرنا ایک فن ہے جس مین عیسائی مورخوں اور خاصۃً انگریزوں کو دنیا بھر کی قوموں سے زیادہ کمال حاصل ہے۔

بیشک جو لوگ جاہلیت عرب کے حالات سے ناواقف ہیں ان کو مسٹر گبن کے اس قیاسی فیصلہ پر یقین آجاسے گا۔ بلکہ کیا عجب اکثر ان کے نزدیک یہ امر بھی گبن کی نگاہ سے

اور حقیقت سچی کا ایک اعلیٰ نمونہ خیال کیا جاتا ہو۔ اس لیے کہ باوہی النظر میں اہل عرب بالکل سنی و جاہل تھے اور صحرائی لوٹیروں سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے۔ ان میں وہ ذاتی شرافت کہاں جس کو اپنی مفتوح شائستہ اور نامور قوموں کے سامنے پیش کر کے وہ سرخروئی حاصل کرتے۔ لہذا کوئی تعجب نہیں بلکہ بالکل قرین قیاس اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اس تدبیر سے خاندان نبوت میں شرافت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس بحث کو تفصیل کے ساتھ لکھیں تاکہ لوگوں کو عام طور پر معلوم ہو جائے کہ یہ کوئی تاریخی تحقیق نہیں بلکہ اسلام پر ایک نہایت ہی مقصدانہ اور شرمناک حملہ ہے بیشک ہم اوس طلسم کو توڑ دیں گے جسے مسٹر گبن نے قائم کیا ہے۔ گبن کے بعد عموماً یہ خیال غریب و بوزخون کے نزدیک طے شدہ مسئلہ ہو گیا ہے۔ ہم پہلے وہ واقعہ بیان کرتے ہیں جس کی وجہ سے مسٹر گبن کو ایسا کہنے کا موقع ملا۔

جناب وق اسلم رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب ایران فتح ہوا۔ اور فارس کا مال غنیمت اور وہاں کے لوٹسی غلام دار اخلتارین میں آئے تو اون میں کچھلے شہنشاہ ایران یزدجرد کی تین بیٹیاں بھی تھیں ان لوٹدیان جب بیت المال کی طرف سے فروخت ہو چکیں تو ان تینوں شاہزادیوں کی نوبت آئی۔ حضرت عمرؓ کو بالکل نیک نفس اور انصاف پسند خلیفہ تھے اور جن کی نظر میں دنیاوی مدایح و مراتب کی ایک ذرہ برابر وقعت نہ تھی انہوں نے بلا تکلف حکم دیدیا کہ وہ شاہزادیاں بھی فروخت کر ڈالی جائیں۔ حضرت علیؓ یہ کارروائی کبھی رہے تھے انہوں نے جناب عمرؓ کو روکا اور کہا ”شاہزادیوں کے ساتھ وہی برتاؤ نہ کرنا چاہیے جو عام قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے“ حضرت عمرؓ نے حیرت سے پوچھا پھر کیا کیا جائے جناب علیؓ نے فرمایا ”دائمی قیمت کا اندازہ کر لیجیے اور جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس سے زیادہ قیمت نہیں ہو سکتی تو وہ قیمت سب کو بتا دیجائے جو دینے پر آمادہ ہو عزت کے ساتھ انکا ہاتھ پکڑ لے جائے“ غالباً حضرت علیؓ کا یہ منشا ہوگا کہ انکے بکنے کا مال خود ان کو نہ معلوم ہو۔ حضرت عمرؓ نے اس کارروائی کو جائز نہ کہا اور جب ان لڑکیوں کی پوری قیمت ہو گئی تو حضرت علیؓ نے خود وہ قیمت ادا کر کے اونکو لے لیا۔ اور اوسی صحبت میں آپؓ نے وہ لڑکیاں قریش کے تین نوجوانوں پر تقسیم کر دیں۔ ایک جسکا نام سلاۃ تھا اپنے چھوٹے

۱۲ ان شاہزادیوں میں سے صرف ایک کا نام سورقین بتاتے ہیں جو جناب امام حسینؑ کو دی گئیں۔

صاحبزادے جناب امام حسین کو دوی ایک محمد بن ابی بکر کو اور ایک عبداللہ بن عمر کو۔ اگر سچ پوچھیے تو یہ تینوں قریشی نوجوان ہی شاہزادگی کی حیثیت سکتے تھے گو امام حسین کو یہ حیثیت اور سکے بہت دنوں بعد حاصل ہوئی۔ ان تینوں شاہزادیوں کے بطن سے تین بچے پیدا ہوئے جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک بہت بڑا عالم بہت بڑا فقیہ اور بہت بڑا محدث اور ائمہ سے زیادہ مستفی و پرہیزگار تھا۔ وہ تینوں لڑکے کون ہیں؟ اول قاسم بن محمد بن ابی بکر۔ دوسرے سالم بن عبداللہ بن عمر۔ تیسرے علی بن حسین بن علی بن ابی طالب الملقب بزین العابدین جو امانیہ اثنا عشریہ کے اعتقاد میں جو کچھ امام ہیں۔ اول دو دنوں بیٹے قاسم اور سالم کو بھی وہ وقعت حاصل ہوئی ہے جو شاید اس عہد میں کسی کو کم نصیب ہوئی ہوگی۔ تابعین میں انکا نام سب سے اول لیا جاتا ہے۔

یہ وہ واقعہ جس نے مسٹر گین کو ایسا خیال قائم کرنے کا موقع دیا ہے۔ اس لیے کہ سیدوں کا زیادہ گروہ جناب زین العابدین ہی کی نسل میں ہے جو باپ کی طرف سے جناب سیدۃ النساء زہرا کے پوتے اور مان کی طرف سے آخری تاجدار امیران یزدجرد کے نواسے تھے۔ لیکن تعجب ہے کہ مسٹر گین کو یہ یاد نہ آیا کہ سیدوں کا ایک معتد بہ حصہ جناب سبط اکبر کی اولاد میں ہے۔ اگرچہ امانیہ کے عقائد کے مطابق اہل بیت صرف امام حسین کی نسل میں رہی لیکن یہ حیثیت سیادت وہ لوگ بھی امام حسن کی اولاد کو اسی قدر قابل تعلیم اور متمنا ہی شریف تسلیم کرتے ہیں جس قدر کہ امام حسین کی اولاد کو۔ اور اہل سنت کے نزدیک تو ہر بات میں دو دنوں برابر ہیں۔ بلکہ ان کے عقائد میں داخل ہے کہ امام مہدی جناب امام حسن ہی کی نسل سے ہونگے۔ بہر حال جناب سیدہ کے دو دنوں صاحبزادوں کی اولاد میں باعتبار شرافت نسبی اسلام کے کسی فریق کے نزدیک کوئی امتیاز نہیں۔ اول تو مسلمانوں کے اعتقاد میں شرافت نسبی کوئی چیز ہی نہیں۔ اسلام ایک عام

ہے لیکن ادھکے نام میں ہی اختلاف ہے۔ مورخوں کا قومی گروہ تو سلفا کہتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اون کا نام غزالہ تھا۔ بعض شہر بانو بتاتے ہیں جو عوام میں سب سے زیادہ مشہور ہے قرظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلی نام تو شہر بانو ہی تھا مگر عرب میں آنے کے بعد یہ دو نام سلفا اور غزالہ رکھ دیے گئے۔ در نہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایران کی شاہزادیوں کے عربی نام ہوں۔

انہوں میں دنیا کی تمام قوموں کو لے۔ ہاتھ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس قسم کے تفرقہ نوع انسان میں باقی رکھتا۔ اسلام تو صرف دین کو اک شرافت سمجھتا ہے جس کے اندر ہر شخص شامل ہو سکتا ہے۔ اسلام نے شرافت کو کبھی ہندوؤں کے مذہب کی طرح آبائی ورثوں کے ساتھ وابستہ نہیں رکھا۔ اس کے نزدیک تو شرافت وہ چیز ہے جسکو ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ اور اسی ضرورت سے آنحضرت نے صاف صاف فرمادیا۔ **یہ ان بیگم و اعدوان ابکم و اعدوانہ لافضل لعربی علی عجمی و لا لآحمر علی الاسود و الا بالتقوی** الامل لغت کا خوب جان لو کہ تمہارا نبی ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ نہ عرب وائے کو کسی غیر ملک والے پر کچھ فضیلت ہے اور نہ عجمی چڑے والے کو سیاہ چڑے والے پر بان اگر فضیلت ہے تو پرہیزگاری کے اعتبار سے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ میں نے اپنا فرض تبلیغ ادا کر دیا۔ یہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دوسری قوموں کے اعتبار سے مسلمانوں میں کسی شرافت کے خیالات پیدا ہو گئے اور علماء کی کشتی سے روز بروز اتنی قوت پکڑتے گئے کہ اب ہر مسلمان کے رنگ و نشیہ میں سرایت کر گئے ہیں۔ آن حضرت نے اپنی محنت پر اولاد کے بارہ میں (جس سے مراد جناب سیدہ کی اولاد سمجھی جاتی ہے) مسلمانوں کو بعض نصیحتیں کی ہیں۔ مگر اس فقرہ کو خود آن حضرت کا یہ قول قطعی طور پر حل کر دیتا ہے کہ **من سلک علی طریقہ فہو آئے** جو میری راہ پر چلے وہی میری اولاد ہے۔ غرض اسلام میں بلحاظ دین شرافت نسبی کی کچھ وقعت نہیں۔ اور اس بنا پر یہ خیال کرنا کہ اہل اسلام نے ایران سے شاہی خون کوئی فخر حاصل کیا بڑی فاش غلطی ہے۔

تاہم ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی حد تک اپنے نسب پر فخر کرنے کا خیال رہا۔ جاہلیت میں اہل عرب کو اپنے نسبوں پر جس قدر دعویٰ تھا شاید دنیا کی کسی قوم کو نہ ہوا ہوگا۔ یہ دعوے عرب والوں کے نیچر میں داخل ہو گیا تھا۔ اسلام نے اسکو بہت کچھ مٹایا تاہم عرب میں کسی نہ کسی قدر اسکا مادہ باقی تھا۔ عرب اگرچہ جاہل اور وحشی تھے مگر انکو یقین تھا کہ آبائی شرافت میں دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی وہ ریگزاروں میں کمبلیاں تان کے رہتے تھے مگر اس دولت میں بھی کسرے دیتے تھے کہ اپنے آگے ذلیل خیال کرتے تھے۔ خصوصاً قریش جو سارے عرب میں اپنے آپکو افضل و اشرف جانتے تھے۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ اسلام نے انکے اون جاہلیت کے

دعویٰ میں بہت کچھ کہی کر دی تھی لیکن اوہ کی نسبت یہ کہد نیا کہ وہ کسری کی بیٹی کو اپنے لیے  
موجب ازدیاد شرافت سمجھے شاید کسی سمجھدار آدمی کا کام نہ ہوگا۔

نوشیروان عادل نے ایک عربی مشیر زید بن عدی کے کہنے سے جب شمالی و مغربی ضلع  
عرب کے سردار نعمان بن منذر کو لکھا کہ اپنی بیٹی یا اپنے قبیلہ کی کوئی لڑکی پیشکش کرے۔  
تو نعمان کو نہایت ناگوار ہوا۔ اور نوشیروان کو یہ معلوم ہو گیا کہ عرب لوگ اپنے آپ کو شاہان  
ایران سے بھی زیادہ شریف سمجھتے ہیں۔ نعمان کو اس انکار کا انجام معلوم تھا۔ اس نے  
حکومت سے کنارہ کشی کی اور اپنے اہل و عیال کو قبیلہ بنی شیبان کے سردار کی حفاظت  
میں چھوڑ کے دربار نوشیروان میں حاضر ہوا۔ نوشیروان نے اس کو قید کر دیا اور اسی  
کی قید میں مر گیا۔ نوشیروان نے نعمان کے مرنے کے بعد اس کے اہل و عیال کو بنی شیبان  
سے طلب کیا۔ وہ ہلاک و دینے والے تھے۔ اور جب ایرانی فوج مقابلہ کو آموغور  
ہوئی تو گوجا جاتے تھے کہ کسری کا مقابلہ کسی طرح نہیں ہو سکتا مگر مارنے اور مر جانے پر  
تیار ہو گئے۔ مقام ذی قار میں لڑائی ہوئی۔ اور بنی شیبان نے فی الحقیقت بڑی  
جواہر ذی کے نمونے دکھائے۔ اس سے پہلے عربوں کو ایرانیوں کے مقابلہ میں کسی  
کم جرات ہوئی تھی۔ اسی لڑائی کا تذکرہ ہے کہ ایک شیبانیہ لڑکی نے میدان میں  
آ کے ایک ایسا پر جوش شعر پڑھا کہ یکایک سات سو آدمیوں نے اپنی قباؤں کی گتھیں  
بچ کے چنک دین اس لیے کہ تلوار چلانے میں اوجھڑی تھیں۔ عرب نے ذی قار میں  
ایرانیوں کو شکست دی اور ایرانی اسے بہانے کہ پہر او دہر کا رخ نہ کیا۔  
کیا کسی کے قیاس میں آ سکتا ہے کہ یہی عرب جو اپنی بے مایگی اور دشت نوردی کے  
عہد میں اپنی شرافت کا اتنا بڑا دعوے رکھتے تھے کہ قبیلہ کے قبیلہ کٹ گئے اور شہنشاہ  
ایران کو ایک عربی نژاد لڑکی نہ دی گئی وہی عرب اب ترقی کر کے اور ساری دنیا میں  
فتح و نصرت کا ڈنکا بجا کے اپنے تئیں اتنا ذلیل خیال کرنے لگے کہ نبوت کے خاندان  
کو نیز و جبر کی بیٹی کے ذریعہ سے مغرب بتائیں۔ عرب تو بعد اسلام ہی اتنے سخت تھے  
کہ غیروں کو ہمیشہ اپنے آگے ذلیل خیال کرتے تھے۔ غیر تو غیر خاص قریشی نسل کے  
جو لوگ عرب سے باہر جا کے رہ پڑے تھے اگرچہ اون میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہوئی  
تھی مگر وہ اون سے بھی سہمہا نہ پیدا کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ عبدالملک بن ولید

جونی امیہ میں سب سے زیادہ زبردست خلیفہ تھا اس نے عقیل بن علقمہ سے جو صحابہ سے  
عرب میں اپنے قدیم مذاق کی سادی زندگی بسر کیا کرتا درخواست کی کہ اپنی کوئی بیٹی  
میرے کسی لڑکے کے عقد میں دو۔ یہ پیغام دار الخلافہ دمشق سے شاہی اہتمام کے ساتھ  
بھیجا گیا۔ عقیل نے پہلے تو انکار کر دیا۔ مگر خلیفہ کے زیادہ اصرار پر کہنے لگا: اچھا پھر مجھ پر  
ہی ہے تو میں راضی ہوں مگر دیکھو کسی غیر عربیہ کے لڑکے سے مجھے مصیبت میں نہ مبتلا  
یہ خیالات آخر عمدتاً باقی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح شیر جنگل ہی میں زیادہ شریف  
اور شجاع نظر آتا ہے اسی طرح ہم بھی اپنے صحراؤں ہی میں زیادہ شریف رہ سکتے ہیں  
یزید کی ماں میسون ایک بادینہ تھیں عرب کی بیٹی تھی۔ جناب معاویہ نے ہزار کوشش  
کی مگر اسے خلافت کے عیش و عشرت میں کسی طرح مزہ نہ آیا۔ یزید حمل میں تھا دمشق  
میں اس کے پیدا ہونے کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں اور میسون نے اپنے ریگزار کی  
تاریاں کر دیں۔ جناب معاویہ کی ایک نہ چلی۔ میسون اپنے صحرائی جو پڑے میں چلی  
گئی۔ اور یزید وہیں پیدا ہوا۔

ہم تو یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اولاد جو ان شاہزادیوں سے ہوئی عرب کی سوسائٹی میں  
باوقعت نہ سمجھی جاتی مگر بات یہ تھی کہ اہل عرب اپنی بیٹیوں کے دینے میں چاہے  
اکتہ ہی اعتقاد کرتے ہوں مگر سلسلہ نسب کو ہمیشہ باپ کی طرف سے لیا کرتے تھے  
مان کی شرافت کا خیال کم کیا جاتا تھا۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ جناب امام حسین اور  
عبد اللہ بن عمر اور محمد بن ابی بکر کی اولاد کو کسی کم وقعت کی نظر سے نہ دیکھی گئی۔ لیکن یہ  
خیال نہ کرنا چاہیے کہ عرب لوگوں میں مان کی شرافت کا خیال بالکل تھا ہی نہیں۔  
کسی حد تک ضرور تھا۔ بعض شرفا اس کا بہت کچھ خیال کرتے تھے۔ امام زین العابدین  
اور سالم اور قاسم جو ہمیشہ سب کے نزدیک وقعت کی نگاہوں سے دیکھے گئے اسکی  
یہ وجہ تھی کہ ان لوگوں نے کمالات دینی میں ایسی اعلیٰ ترقی کی تھی کہ انکے خاندانی  
نقصان پر کسی کی نظر پڑتی ہی نہ تھی۔ ماؤن کا عیب ان کے زہد و اتقا کے دامن میں  
چھپ کے فنا ہو گیا تھا۔

ابن خلکان نے امام نو میر سے ایک قریشی شخص کا واقعہ خود اسکی زبانی نقل کیا ہے  
کہ اسنے کہا: میں سعید بن مسیب کے پاس اکثر جایا کرتا تھا ایک دن اونہوں نے

مجھ سے پوچھا تھا انا مال کمان ہے۔ میں نے کہا میری ماں تو لڑی تھی۔ یہ جلد میری زبان سے نکلنے ہی مجھے معلوم ہوا کہ جیسے اونکی نظر میں میری بے وقعتی ہو گئی۔ میں بیٹھا ہی تھا کہ سالم بن عبداللہ بن عمر آگئے۔ جب تھوڑی دیر بیٹھ کے وہ چلے گئے تو میں نے سعید سے پوچھا جناب یہ کون بزرگ ہیں۔ اونہوں نے حیرتناک جو کے کہا واہ وا۔ ایسے شخص کو اور تم نہ جانو۔ یہ تمہاری قوم قریش میں سے ہیں۔ اور عبداللہ بن عمر بن الخطاب کے بیٹے سالم ہیں۔ میں نے پوچھا ان کی ماں کون تھیں۔ اونہوں نے کہا لونڈی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد قاسم بن محمد بن ابی بکر آئے اور جب وہ گئے تو میں نے اونکی نسبت ہی وہی سوال کیا۔ اونہوں نے بھی وہی کہا کہ پہلا ایسے شخص کو اور تم نہ جانو۔ یہ بھی تمہاری قوم کے نامور شخص قاسم بن محمد ہیں۔ میں نے کہا اور ان کی ماں کون تھیں۔ کہا لونڈی تھیں۔ اتنے میں اتفاقاً علی بن حسین بن علی بن ابی طالب آگئے اور جب اونہ گئے تو میں نے اون کی نسبت ہی تجاہل غار فائدہ کر کے دریافت کیا اور یہ کون ہیں؟ کہا واہ ان کو نہ جانتا قیامت ہے۔ یہ تو وہ ہیں کہ ممکن نہیں کوئی مسلمان ہو اور ان کو نہ جانتا ہو۔ یہ علی بن حسین ہیں۔ میں نے پھر کہا اور ان کی ماں کون تھیں کہنے لگے وہ بھی لونڈی تھیں۔ اب میں نے اون سے کہا اپنے آپ کو کینزک زادہ بتا کے میں آپ کی نظر میں ذلیل ہو گیا تھا۔ لیکن اب عرض کرتا ہوں کہ اس خاندانی معاملہ میں یہ میرا فخر نہیں ہے کہ میں اسے ایسے ایسے لوگوں کا ہمراہ ہوں۔ میری یہ تقریر سننے ہی سعید کے ہنسنے سے معلوم ہونے لگا کہ گویا وہ مجھے بہت ہی با وقعت خیال کرتے ہیں۔

بلکہ بعض تاریخی بیانون سے تو مراد معلوم ہوتا ہے کہ اہل مدینہ پیشتر لونڈیوں کی اولاد کو اپنی سوسائٹی میں نہیں ملا تے تھے مگر جب قاسم بن محمد اور سالم بن عبداللہ اور علی بن حسین نے نشوونما کے مارج علمی اور دینی میں ترقی کی تو وہ خیال جاتا رہا اور عموماً لونڈیوں کی اولاد خاندان میں شریک سمجھی جانے لگی۔ اصلیت تو یہ ہے کہ اہل عرب نے اون لوگوں کو بغیر اونکی دینداری کا امتحان لیے اپنی برادری میں لیا اور سٹر گبن فرماتے ہیں کہ نہیں اہل عرب نے اون کی رگوں میں ایمان کے شاہی خاندان کا خون دوڑا کے خاندان نبوت کی عزت بڑھائی۔ اگر تحقیق تاریخی چھوڑ کے مذہبی اصول سے ہم بحث کریں تو کہیں گے کہ جو مسلمان ایسا اعتقاد رکھے وہ کافر سمجھا جائیگا۔ نہ کہ مسلمانوں نے



ایسی کارروائی خود اپنی کوشش سے کی ہو۔

اور سب سے زیادہ گہن کے خیال کی بے وقتی اس واقعہ سے ہوتی ہے جبکہ ابن خلکان نے ابن قتبہ سے نقل کیا ہے کہ جناب امام حسین کی شہادت کے چند روز بعد امام زین العابدین نے اپنی والدہ کا عقد جناب امام حسین کے غلام زید سے کر دیا۔ اور اسی زمانہ میں اپنی ایک لونڈی کو آزاد کر کے اپنے نکاح میں لیا۔ یہ خبر سن کے عبدالملک بن مروان نے آپ کے پاس ایک خط بھیجا جس میں ان دونوں باتوں پر آپ کو شہرہ ملائی تھی۔ امام زین العابدین نے اس کے جواب میں جو تحریر بھیجی اس میں پہلے تو یہ آیت لکھی تھی ”لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ“ جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا چاہیے۔ اور اس کے بعد لکھا تھا ”رسول اللہ نے صفیہ بنت حبیب بن اخطب کو آزاد کر کے اپنے نکاح میں لیا تھا۔ اور زید بن حارثہ کو آزاد کر کے اپنی بیوی کی بیٹی زینب بنت جحش کو اس کے عقد میں دے دیا تھا۔ اس سے زیادہ اس بات کا کیا ثبوت ہو گا کہ اسلام نسبی شرافت کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اور اگر جناب شہر بانو سے کوئی شرافت ہی حاصل کی گئی تھی تو پھر ان کے ذریعہ سے ایک آزاد شدہ غلام کیونکر خاندان نبوت کا رقیب بنایا گیا۔

مسٹر گہن کا یہ خیال ہم نے حضرات شیعہ میں سے بعض جہلمیوں میں بھی پایا ہے۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ شیعوں کو بمقابلہ مسیون کے ایمان کے ساتھ خاص ہمدردی ہے۔ بے شک ہم مذہبی ایسے تعلقات پیدا کرتے ہیں۔ اور ایسے تعلقات کو ہم نہایت ہی قابل قدر سمجھتے ہیں۔ لیکن اسی حد تک کہ دین کی توہین نہ ہونے پائے۔ ہمارے اعتقاد میں تو عربی شریعت پر ایمان لانے والوں میں سے تو ہر شخص کو ایسے خیال سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ایسے کہ اس میں صاف صاف خاندان نبوت کی توہین ہے۔

یہ سمجھنا کہ عرب لوگ اپنے فتوحات کے وقت لونڈیوں میں باعتبار عالی نسب یا امارت یا شانہ وادگی کے کوئی تفریق کرتے تھے بہت بڑی غلطی ہے۔ عرب لوگوں میں اول تو ان دونوں صرف دین کا نام شرافت تھا۔ اور اگر قدیم شرافت کا کچھ خیال تھا بھی تو وہ قبائل میں۔ اور دیگر ممالک کی عورتوں میں سے تو وہ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے۔ عام اس سے کہ وہ فزیر زادی ہوں یا شاہزادی۔ امیر زادی ہوں یا فقیر زادی۔

اب اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ ہر قل کی بیٹی فتح و شوق کے بعد جب مسلمانوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئی تو ایک شامی نو مسلم کے سپرد کر دی گئی جس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کی مشوقہ اس کو دی جائے گی۔ اور جب معلوم ہوا کہ اس کی مشوقہ نے خودکشی کر لی تو ہر قل کی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا گیا۔ مگر اس شامی سے اس کی جرات نہ ہوئی۔ اور ہر قل ہر قل کے حسب الطلب وہ لڑکی عزت کے ساتھ اٹھا کر بیچ دی گئی جہاں خود ہر قل موجود تھا۔

اگرچہ پوچھیے تو اس فتح مندی کے زمانہ میں وہ شاہزادیاں عرب میں آگئیں جہاں ان میں سے بعض دیگر قریشیوں کے گھر میں تھیں۔ بعض عرب کے غلاموں کے پاس تھیں۔ وہاں ایک جناب امام حسین کے گھر میں بھی تھی۔ لیکن وہ جو غلاموں کے پاس تھیں ان کا تو خیال ہی نہیں کیا جاتا مگر ان ایک جو پیغمبر کے نواسہ کے پاس تھی اس کی مہولت خاندان نبوت مغزز بنایا جاتا ہے۔ خود شہر باؤ کی دو بہنیں دو قریشی نوجوانوں کے پاس تھیں جن کا ذکر ہو چکا۔ ہر اس واقعہ فریقہ کے گریو رسی کی بیٹی فلسانا عبدالمعین بن زبیر کے گھر میں تھی۔ جو ایسی حسین ایسی تعلیم یافتہ ایسی بہادر اور مفیدان جنگ میں سپہگرمی کے جوہر دکھانے والی تھی کہ خود مسٹر گبن کو اس کے حال پر بڑی رقت ہوئی ہے۔

ہم ایک اور سیمہ اور یورپین شاہزادی کا حال اس موقع پر بیان کرتے ہیں جس نے خود اپنے شوق سے ایک عربی غلام کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ یہ خاص اسپین کی شاہزادی تھی۔ اور مسلمانوں میں قولیہ کہلاتی تھی۔ وجہ یہ کہ وہاں نسل گاتھ حکمران تھی۔ گاتھ کو مسلمان قولیہ کہتے تھے۔ اور امی خاندان کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اسے قولیہ کہا کرتے تھے۔ یہ شاہزادی رزرقی سے پہلے فرمانروائے اسپین ڈنزا (غیشہ) کی پوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق نے جب اسپین کو فتح کر لیا تو بعض اضلاع پر شاہ ڈنزا کے بیٹے حکمران کیے گئے۔ جنہوں نے اپنی اس بیٹی پر ظلم کیا۔ بلند ہمت شاہزادی نے اس کی غرض سے دمشق کا سفر کیا۔ اور ہشام بن عبدالملک کے دربار میں حاضر ہوئی۔ یہاں آئے اس نے عمر بن عبدالعزیز اموی کے غلام عیسیٰ بن فرامہ سے عقد کر لیا۔ ہشام نے اس شاہزادی کو ایک پروانہ لکھ دیا جو خطاب شعیب کی دالی انداس کے نام تھا۔

اور جس میں اوسکی رعایت و خاطر داری کی بہت کچھ تاکید کی تھی۔ شانہزادی اپنے شوہر اور اوس پر دانے کو لے کے اسپین میں پہنچی اور خاص قرطبہ میں مقیم ہوئی۔ عیسیٰ بن مزاحم کی اس شانہزادی کے بطن سے وہاں اولاد ہوئی۔ اور ایک نسل شروع ہوئی جو اندلس کے آخری اسلامی دور تک باقی تھی۔ اور اون سب کے نام کے ساتھ اسی شانہزادی کی وجہ سے ہمیشہ قوطی کا لفظ لکھا جاتا رہا۔ ابو بکر بن محمد قرطبی مؤرخ بہ ابن قوطیہ جو اندلس میں ایک بڑے امام و قوت گذرے ہیں اور جن کا چوتھی صدی ہجری کے آخر میں انتقال ہوا ہے اسی شانہزادی کی نسل سے تھے۔ اور اسی وجہ سے ابن قوطیہ اون کا لقب تھا۔ ابن قوطیہ نے خاصۃً علم لغت میں جو کمال حاصل کیا وہ بہت کم کسی کو نصیب ہوا ہے۔ اون کی کتاب «المقصود والحمدود» کی نسبت علامہ ابن خلدون کہتے ہیں کہ اوسکو تصنیف کر کے وہ تمام گذشتہ اہل لغت سے بڑھ گئے۔ اور بعد اُس نے دوسری کتاب لکھنے سے عاجز ہیں۔ اوسکے تبحر کا سب سے بڑا اثر ٹیکٹ یہ ہے کہ ناصر الدین کا بیٹا خلیفہ مکرم جو علم و فضل میں سلاطین عالم پر فوقیت لے گیا ہے جس کا کتب خانہ مشہور ہے اور جس کی نظر سے تین لاکھ تصنیفیں گذر گئی تھیں۔ اور جس نے اون سب کا مطالعہ اس وجہ سے کیا تھا کہ اون میں سے بہت کم تھیں جن پر اوس نے اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ بخشی نہ کی ہو۔ اوس نے ابو علی قالی سے جب پوچھا کہ باعتبار لغت سب سے زیادہ متبحر ہمارے شہر میں تم نے کس کو پایا۔ ابو علی نے فوراً ابن قوطیہ کا نام لیا۔

اگرچہ یہ خاندان ابو بکر کے وقت سے بہت زیادہ مغرور ہو گیا۔ لیکن فیضیت تو علم سے حاصل ہوئی ہم کو یہ نہیں بتایا گیا کہ ہمارے اس غلام کو یورپ نے ایک سیمین اور نسل گاتھ کی شانہزادی سے کون سی شرافت دے دی۔ ہمارے سیمی دوست اوسی شرافت سے نہ بحث کریں جو وہ پارسیوں سے لے کے یہیں دیتے ہیں۔ وہ یہ بتائیں کہ خود اپنی فیاضی سے اونہوں نے ہمارے کون سی شرافت بخشی۔

## دارالخلافہ قرطبہ

### تنبیہ

اس سال چونکہ ہم اپنے ناول کے ذریعہ سے ناظرین کو ملک ہسپانیہ اور غارت و بان کے معروف و مشہور شہر قرطبہ کی میرکرائیں گے لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مستقل طور پر قرطبہ کے تمام تاریخی اور سیکے حالات بتا دیں تاکہ لوگوں کو اس با عظمت و جلال شہر کا بخوبی علم ہو جائے۔ اور ہوطنوں کی نظر سے اس کی ایک تصویر گزر جائے جس کے بعد وہ ناول کے ہر مضمون سے پورا لطف اٹھا سکیں اور خلافت اسپین کے سلسلے اور اس کی ویا وسیع ہو جائے۔

مسلمانوں کے فتح کرنے سے پہلے حکومت اسپین کا دارالسلطنت شہر طلیطلہ تاجے انگریزی میں ٹالڈو کہتے ہیں۔ طارق نے دریائے غاولیت یعنی رادسی لکھ کے کنارے شاہ راتوی کو شکست فاش دے کے اپنی فوج کے تین حصہ کیے اور تین طرف روانہ کیا۔ کہ نہایت عجلت کے ساتھ تمام شہروں پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس لیے کہ اب کسی ایسے مقابلہ کی امید نہیں رہی تھی جس کے لیے تمام فوج کے یکجا کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

ان فوجوں میں ایک حصہ شہر قرطبہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ یہ ایک چھوٹی فوج تھی جس میں سات سو سواروں سے زیادہ نہ تھے اور ایک رومی پرجوش سپاہی جو غنیمت رومی کے نام سے مشہور تھا اس مختصر لشکر کا سپہ سالار تھا۔ غنیمت بلا کا آدمی تھا۔ صرف بہادری نہ تھا بلکہ بڑا تجربہ کار اور چالاک افسر تھا۔ جس روز اس نے جا کے قرطبہ کا محاصرہ کیا ہے۔ اوسی رات کو پوری فتح حاصل کر لی۔ یہ فتح کیونکہ چھوٹی اس کی نسبت مختلف بیانات ہیں مگر زیادہ تر قرن قیاس یہ ہے کہ غنیمت نے جس کے اور شہر کے درمیان میں دریائے وادی البکیر بہرہا تھا اور نہون پار نہیں اوترا تھا اوس پار ہی سے قرطبہ کی شہر نیاہ کو دیکھ کے اندازہ کر لیا کہ فلاں مقام پر فیصلہ کر دے۔ یہ اندازہ اس نے اپنے دل میں کیا اور دل ہی میں لکھا۔ جب آفتاب غروب ہوا اور رات کی تاریکی نے مٹی کارروائیوں کے راستہ کو دل دے اوس وقت اپنے تمام ہمراہیوں کے ساتھ

واوی الکبیر سے اوتار کے فصیل کے نیچے عین اوس مقام پر پہونچا جسکو اپنی کارروائی کے لیے اوس نے پہلے سے تجویز کر لیا تھا خوش نصیبی سے اس وقت ابر گھر آیا۔ اور ترشح ہونے لگا جس نے تاریکی کو اور زیادہ غالب کر دیا۔ اور شہر کے جو لوگ دیوار کے قریب موجود تھے وہ بھی مینہ سے بچنے کے لیے کوفون مین جا چھپے۔ روم کے تجربہ کار سپاہی نے اس موقع کو بہت فہمیت سمجھا۔ اور فصیل شہر کو دہان پر ہمسار کرنا شروع کیا۔ جفاکش سپاہیوں نے علاقہ انفرکی ولہ ہی سے ایسی سرگرمی دکھائی کہ تھوڑی ہی دیر میں دیوار توڑ کے اتنا۔ استہ کر لیا گیا کہ کئی سپاہی گذر سکین۔ مسلمان جب اس استہ سے اندر داخل ہوئے تو آہٹ پا کے چند سیحی اندلسی سپاہی مزاحم ہوئے۔ مگر قتل اسکے کہ وہ شہر والوں کو غبر کر سکین عربی تلواروں نے انکا کام تمام کر دیا۔

انفرض مغیث اس استہ سے رات ہی کو قریبہ مین داخل ہو گیا۔ اور اپنے سپاہی چارون طرف پھیلا دیے۔ صبح تڑکے نماز کے وقت ایک ٹکڑی آواز بلند ہوئی جس سے سارے شہر کی عمارتیں ہل گئیں۔ رعایا کے دل دہل گئے۔ مسیحی والی قریبہ اور اسکے فوج کے لوگ حیرت زدہ تھے کہ کیا ہے۔ کیونکہ اوس آواز نے قیامت بپا کر دی تھی۔ اوسکے نشتے ہی مسلمان سوار چارون طرف سے شہر پر حملہ آور ہوئے۔ شہر والے بدحواسی کے ساتھ ادھر ادھر ہر بہا گئے گئے۔ سپاہیوں نے شہر سے نکل کے دیگر بلاد کی راہ لی۔ سارا مسیحی لشکر درہم و بسم ہو کے فدا جانے کیا ہو گیا۔ گنبر اہٹ مین والی شہر سے اور کچھ نہ بنی صرف چار سو سپاہیوں کے ساتھ جو اس وقت موجود تھے وہ عالی شان گرجے مین پناہ گزین ہو اگر گرجہ ہی اس سے پناہ نہ دے سکا۔ مسلمان اس سے پناہ دیدیتے مگر اس نے سپاہیانہ موت کو فاتحوں کی اطاعت پر ترجیح دی۔ گرجہ سے نکل کے لڑا اور اپنے تمام جان نثاروں کے ساتھ مارا گیا۔

اس طور پر سلسلہ ہجری مین قریبہ جو اس علاقہ کا مستقر حکومت تھا مسلمانوں کے قبضہ مین آیا۔ اس وقت تک تمام ممالک اسلامی خلافت دمشق کے تابع تھے۔ لہذا اندلس بھی ادون مد ہا ممالک کی فہرست مین شامل ہو گیا جن پر علم اسلامی لہرا رہا تھا۔ اب ضرورت ہوئی کہ کوئی خاص شہر ادون والیوں کا مستقر مقرر کیا جائے جو خلافت بنی امیہ و دمشق کی طرف سے مقرر ہو کے آتے تھے اور غریبہ نماے اندلس پر حکومت کرتے تھے۔ گو کہ قریبہ

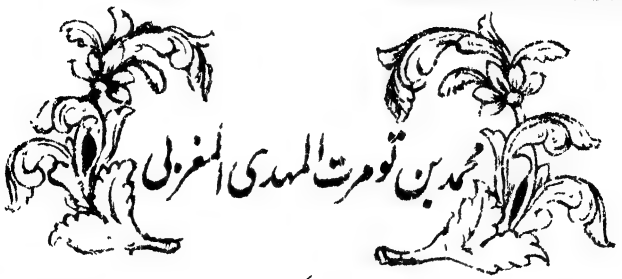
کے بعد ہی طلیطلہ ہی قح ہو گیا مگر مسلمانوں کو اپنے مذاق میں قرطبہ زیادہ اچھا معلوم ہو ا جو آبنائے جبل الطارق سے قریب ہی تھا جس پر سے گزر کے مسلمان سیان آ یا کہتے تھے۔ اگرچہ والیون کا زمانہ کوئی ایسا زمانہ نہ تھا جس کے اعتبار سے کہا جاسکے کہ قرطبہ کو کوئی معتد بہ سرسبزی حاصل ہوئی۔ تاہم سارے ملک کا مستقر قرار پانے کی وجہ سے ممکن نہ تھا کہ اوسکی آبادی و زنیق میں کچھ نہ کچھ زیادتی اور ترستی نہ نمایاں ہوئی جس کا ثبوت اس سے ہوتا ہے کہ سلسلہ میں تو قرطبہ فتح ہو کر دس برس بعد سلسلہ میں جبکہ دمشق میں سیدر خلافت پر عمر بن عبد العزیز کا ایسا عادل اور پاک نفس خلیفہ جلوہ افروز تھا والی اسپین سمع بن مالک نولانی نے اوس خدا ترس خلیفہ کے حکم سے دریائے وادی الکبیر پر ایک بیل تعمیر کرایا۔ یہ عالیسان بیل آج تک قائم ہے۔ اور اوس دور کی برکتوں کو یاد دلارہا ہے۔ اس کی خوبصورتی اور شانہ ری اس درجہ مسلم اثبوت تھی کہ اسلامی شہر اسے اسپین کو دعویٰ تھا کہ دنیا میں کوئی بیل اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور کیا عجب کہ اوس عہد میں ادسکو ایسی وقعت حاصل ہو کر عجائبات عالم میں شمار کیے جانے کے قابل ہو۔ چونکہ یہ بیل اب ایک سنائے میں پڑا ہوا ہے لہذا انگریزی مؤرخ کا یہ جملہ بالکل اسکے حسب حال ہے کہ "ایک سکوت کے عالم میں آج تک کٹر خلافت بنی امیہ کی اگلی عظمت و جبروت کو یاد کر رہا ہے۔ اس میں شہر و رہین۔ آٹھ سو گز لمبا بیس گز چوڑا اور سطح آب سے ۶۰ گزا اونچا ہے۔ اسکے اوپر اونیس خوشنما بیج بنے ہوئے ہیں جو بطن غالب ویرانہ پسند طیلو کے مسکن ہیں۔"

اس عہد سے برابر اون گورنروں کا سلسلہ جاری رہا جو خلافت کی طرف سے یہاں کے وادی مقرر ہو کے آتے تھے۔ قرطبہ اون سب کا مستقر رہا۔ یہاں تک کہ مشرق میں بنی امیہ کا زمانہ تمام ہوا۔ اور بنی ہاشم کی مدد سے بنی عباس کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا۔ عموماً حکم دیدیا گیا کہ نسل امیہ کا کوئی مرد یا عورت بوڑھا یا بچہ دنیا میں زندہ نہ باقی رہے اس حکم کی تعمیل میں جو حشیا نہ مظالم دکھائے گئے اونکے بیان کرنے کی اس وقت ہمیں فرصت نہیں۔ بہر حال انتقام لینے والوں نے اپنے نزدیک دنیا گذشتہ با عظمت خاندان خلافت کی زندہ یادگاروں سے خالی کر دی تھی۔ مگر ہمیں خدا کو منظور تھا کہ وہ نسل باقی رہے۔ اس لیے کہ اوسے اوس سے بہت سے کام لینا تھے۔ الغرض بنی عباس

نے ظلم تو بہت کیے مگر جو چاہتے تھے وہ نہ ہوا۔ ایک مروانی شاہزادہ اون کے ہاتھ سے بچ کے نکل ہی گیا۔

مورخین کو غالباً اس میں کوئی شک نہ ہوگا کہ حکومت کرنے کی مصیبتیں صلاحت بنی امیہ کے لوگوں میں تھی بنی عباس میں نہ تھی۔ خلفائے عباسیہ نے علم کو ترقی دی دولت و عشرت کے سامان بہت زیادہ بڑھائے۔ مگر دور دور از ملکوں پر جس طرح بنی امیہ اپنا رعب بٹھا سکتے تھے بنی عباس کی قوت سے باہر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت بنی امیہ کے ہاتھ سے نکلنے ہی ضعیف ہونے لگی۔ ہندو جسکو بنی امیہ نے فتح کر کے آخر ہمد تک اپنے قبضہ میں رکھا تھا بنی عباس کے زمانہ میں خود سر ہو گیا۔ اور مسلمانوں کو ناکامی کے ساتھ اس کے مواحل پر سے واپس آنا پڑا۔ یہی حال اسپین کا ہوا کہ بنی امیہ اسکی برابر نگرانی رکھتے تھے۔ والیوں کو عہدہ جلد بدل دیتے تھے۔ اور ہروالی سے اونے غفلت پر ایسی باز پرس کرتے تھے کہ اون میں خود سری کی قوت کبھی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ بنی عباس سے ایسی بیدار مغزی نہ ہو سکی۔ اور ایسے غافل ہوئے کہ گویا اونہیں یاد ہی نہ تھا کہ اسپین بھی اونکے قبضہ میں ہے۔ اور ہر تو یہ غفلت تھی ادھر اسپین میں طاعون شروع ہو گئی۔ ہر شہر پر جو شخص حکمران تھا اپنے بالادست کی مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ اون میں سے جو زیادہ قوت رکھتے تھے اونکی باہمی لڑائیوں نے رہے سے انتظامات میں اور خلل ڈال دیا۔ اور چند روز کے لیے یہ حالت ہو گئی کہ کوئی کسیکی نہ سنتا تھا۔ رعایا کے جان و مال خطرون میں پڑے ہوئے تھے۔ زن و مرد پر ایک عام مصیبت نازل تھی جسکی داد و فریاد کہیں نہ سنی جاسکتی تھی۔

ادھر اسپین کی تو یہ حالت تھی ادھر نسل امیہ کا ایک ہونہار نوجوان عبدالرحمن بن معاویہ جو گذشتہ عہد کے باجروت خلیفہ عبدالملک بن مروان کا پوتا تھا دمشق سے ہناگ کے مصر ہوتا ہوا افریقہ کے صحراؤں میں گھسٹا جہاں اپنی زندگی کو تجربات سے مضبوط کرتا پرتا تھا عبدالرحمن نے جن مصائب کو برداشت کیا اور جیسے جیسے خوف و دہشت میں مبتلا ہو ہو کے اپنی جان بچائی ہے اونکے بیان کے لیے ایک ذکر ملے۔ بہر حال وہ بہر تا پھر تا مارا کو میں پہونچا۔ اور ایک شریف قبیلہ میں اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا۔ لیکن اسکا نام بعض ذریعوں سے اسپین والوں کو معلوم ہو گیا تھا۔ - باقی آئندہ



دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس میں یہ نہ بتایا گیا ہو کہ ایک دینی مقصد اقتدا آخر مہدیین پہ  
 ہوگا جس کی بابرکت کوششوں سے ساری دنیا اسی دین کی پابند ہو جائے گی۔ یہ کچھ  
 مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں کہ وہ امام آخر الزمان کے منتظر ہیں۔ یہندو  
 آتش پرست۔ یہودی۔ عیسائی۔ سب کسی شخص کے منتظر ہیں۔ اس میں یہ فلسفیانہ  
 فائدہ تو ضرور ہے کہ انسان کسی مایوس نہیں ہونے پاتا۔ مگر اس کے ساتھ ہم دیکھتے  
 ہیں کہ بعض اوقات جو نقصان پہنچ جاتا ہے وہ کسی طرح مٹائے نہیں مٹتا۔ اگر انصاف  
 کیجیے تو اس قسم کی پیشین گوئی اسلام میں بہت ہی ضعیف الفاظ میں کی گئی۔ اور اس میں  
 کوئی شک نہیں کہ ایسی روایات کے چمکانے میں نبی امیہ۔ بنی عباس۔ اور بنی ہاشم  
 کی پولیٹیکل مخالفتوں نے بہت مدد دی۔ مگر اب تو اہل اسلام عموماً اپنے اعتقاد میں  
 امام مہدی کے منتظر ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن ذریعوں سے دیگر  
 مذاہب دالے کسی آنے والے ریفارمر کا انتظار کر رہے ہیں وہ ذریعہ بجائے خود  
 مسلمان کی روایات سے قوی ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں خدا جانے کس بے خبری سے  
 انتظار کیا گیا کہ جتنے مدعیان مہدویت ان کی تاریخ میں نظر آتے ہیں اور کہیں نہیں  
 نظر آتے۔

ہندوستان کی تاریخ میں ملا محمود جو پوری موجود ہیں جن کے دعوے کی  
 یادگار میں آج تک فرقہ مہدویہ دکن میں پورے استقلال کے ساتھ قائم ہے۔  
 ملا محمود جو پوری کو باوجود ہزار کوششوں کے پولیٹیکل قوت نہ حاصل ہو سکی۔ لیکن ان  
 شک نہیں کہ وہ مالک مشرق کے زبردست اور کسی نہ ہونے والے مدعی مہدویت  
 تھے۔ اب ان کے مقابل میں ہم اون بزرگ کو دیکھتے ہیں جنہوں نے ارض مغرب میں  
 مہدویت کا دعوے کر کے سارے افریقہ اور اندلس میں ہل چل ڈال دی تھی۔



یہ بزرگ محمد بن عبدالعزیز بن قمر تھے۔ اگر پولیٹیکل حیثیت سے دیکھا جائے تو محمد بن قمر عجیب و غریب قوت و حسن تدبیر کا شخص تھا۔ ہم اس شخص کے حالات و تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ چالاکیاں زہد و اتقا کے دامن میں چپ کے کس قدر سرسبز ہوتی ہیں۔ محمد بن قمر اگرچہ مسلمانوں میں بحیثیت دین و قوت کی نظر سے نہ دیکھا جاسکا مگر اس کی سوانح عمری سے اکثر تجربات حاصل ہونگے جنکی اہل اسلام کو ہمیشہ ضرورت ہونا چاہیے اور خاصۃً آج کل ہے۔

اکثر مورخین مغرب کا بیان ہے کہ جن دنوں امام غزالی نظامیہ بغداد میں درس دیتے تھے اور اُن کے حلقہ درس میں اطراف عالم کا ایک عجیب مجموعہ مرتب رہتا تھا۔ اتفاقاً ایک روز وہ بیٹھے درس دے رہے تھے کہ ایک نو عمر بے ریش و بہت طالب علم بن واد کی معمولی وضع کے خلات ایک سوتی ٹوپی پہنے ہوئے مدرسہ میں آیا۔ امام غزالی نے غور سے اس کی صورت دیکھی اور تعجب ہوئے کہ پوچھا کہ تم کس ملک کے رہنے والے ہو؟“ نوجوان نے کہا ”میں ارض مغرب کے شہر سوس اقصیٰ کا رہنے والا ہوں“ امام غزالی نے حیرت سے کہا ”افوہ! تو غالباً تم قرطبہ کے مدرسہ میں ہی رہے ہو گے جو دنیا کے تمام مدارس سے عمدہ خیال کیا جاتا ہے؟“ طالب علم نے غرض کیا۔ ”جی ہاں“ اس کے بعد امام غزالی قرطبہ کے مشہور علما کے حالات دریافت کرتے گئے اور وہ نوجوان بتانا لگا۔ اس کے جوابات سے امام نے اندازہ کر لیا کہ بے شک اپنے بیانات میں شخص سچا ہے۔ اور جس بنمیدگی سے اس نے ہر خیال کو ظاہر کیا اس سے انہوں نے جانا کہ طالب علم ذہین و دانا ہی ہے۔ دریافت کیا کہ تم نے میری کتاب احیاء العلوم ہی لکھی ہے؟“ نوجوان نے کہا ”جی ہاں میں اس کی زیارت کر چکا ہوں“ امام نے پوچھا ”اچھا بتاؤ اس کی نسبت علمائے قرطبہ کے کیا خیالات ہیں؟“ طالب علم نے اس سوال پر سر جھکا لیا اور کچھ جواب نہیں دیا۔ امام نے اس کے سکوت کو نہایت حیرت سے دیکھا اور کہا ”جو بات ہو تم بے خوف آزادی سے بیان کرو“ امام کے مضطربانہ اصرار پر اس نوجوان طالب علم نے کہا ”اگرچہ اس امر کا عرض کرنا گستاخی ہے مگر اب اصرار فرماتے ہیں تو بحکم الامر فوق الادب عرض کرتا ہوں۔ آپ کی کتاب پر دہان کفر و کجی کا الزام لگایا گیا۔ علمائے قرطبہ نے اس پر خوب غور کرنے کے بعد باہم مشورہ

کر کے حکم دیا کہ احیاء العلوم غلامیہ جلاوی جاے۔ اس کارروائی کے بعد سبھو ان  
 بادشاہ علی بن یوسف کو اطلاع دی کہ احیاء العلوم بیان کثرت سے پہنچتی جاتی ہے اور  
 اس سے مسلمانوں کے عقاید بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ بادشاہ  
 کے حکم سے قرطبہ کے بعد مرکش۔ مدینہ فاس۔ قیروان اور مغرب کے اون تمام شہروں  
 میں جن میں علم ہے احیاء العلوم غلامیہ جلاوی گئی، نوجوان کا یہ بیان سنتے ہی امام  
 غزالی کا پیرہ متغیر ہو گیا۔ فوراً انہوں نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے۔  
 اور کہنے ہوئے ہونٹھوں سے خدا کی درگاہ میں اس توہین کی صلح دینے والے  
 نکما اور نیر اوس بادشاہ کے حق میں جسکے حکم سے اون کی کتاب کی ایسی توہین ہوئی  
 تھی بد دعا کی۔ جو لوگ اس موقع پر موجود تھے اون کا بیان ہے کہ بادشاہ علی بن یوسف  
 کے حق میں امام کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے۔ «بار اللہ! صبر طرح اوس نے  
 میری کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے برباد کیا ہے اوسی طرح اوس کی سلطنت کو ٹکڑے  
 ٹکڑے کر کے تباہ کر۔ اسکی تمام حکومت اور جو کچھ اوسے ورثہ میں ملا ہے سب اس  
 ہاتھ سے چھین لے» امام کی اس دعا پر طلبہ کے حلقہ سے «آمین» کی آواز بلند ہوئی  
 امام غزالی نے ہنوز ہاتھ نیچے نہیں کیے تھے کہ یہ مغربی نوعر طالب علم آگے بڑھا اور کہا  
 «یا امام اپنی دعائیں اتنا اور اضافہ فرما دیجیے کہ ان باتوں کی تعمیل خاص میرے ہاتھ  
 سے ہو» امام نے اپنے ہاتھ دعائیں روک کے کہا «اور خدا ونا! اس دعا کی تعمیل  
 خاص اسی شخص کے ہاتھوں سے ہو» اور طلبہ نے پہرا میں کہی۔ یہ طالب علم محمد بن قمر  
 تھا جس نے بیان سے مغرب میں واپس جا کے دعویٰ مہدویت کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد بن قمر کے بچہ پرین دینی اور دنیاوی دونوں قسم  
 کی حکومت حاصل کرنے کا ایک مضطربانہ شوق تھا۔ وہ اپنے غنغوان شباب ہی  
 سے اسی اودھیر بڑن میں رہا کرتا تھا۔ جس طرح امام غزالی کا یہ واقعہ اوس کے اس  
 شوق کی خبر دیتا ہے اسی طرح ایک اور واقعہ ہے جس نے اوسکے ارادوں میں  
 زیادہ قوت دیدی تھی۔ علامہ ابن خلدکان اوسکے حالات میں لکھتے ہیں کہ ایام  
 طالب علمی میں اوسے علم جفر کی ایک کتاب مل گئی۔ اس کتاب کا اوس نے خوب  
 غور سے مطالعہ کیا اور اوسکے احکام سے اوسے معلوم ہوا کہ سوس میں نسل نبی کا

سے ایک شخص پیدا ہو گا جو لوگوں کو خدا کی طرف بلائے گا۔ اس کا مستقر ایک مقام قرار پائے گا جس کے نام میں حروف ت س ی ن مل ہوئے۔ اسے ایک اور شخص ملے گا جس کی مدد سے وہ اپنے اغراض میں کامیابی حاصل کرے گا۔ اس شخص کے نام میں حروف ع ب و م و ن ہونگے۔ طالب علمی کے بعد اپنی زندگی اس نے اس شہر اور اس نام کے شخص کے ڈھونڈنے میں صرف کرنا شروع کی تاکہ خود اپنے آپ کو وہ شخص ثابت کرے جو سوس میں پیدا ہونے والا ہے۔ ایسے کہ اطراف سوس میں پیدا بھی ہوا تھا اور نسل بنی فاطمہ سے بھی تھا۔

محمد بن تو مرت نسباً امام حسن علیہ السلام کی نسل سے تھا اور کوہستان سوس میں عشرہ کے دن ششہ میں پیدا ہوا تھا۔ پہاڑوں میں نشوونما پانے کے کم عمری ہی میں بغرض طالب علمی وطن سے نکلا۔ پہرے پہرے اسپین و مصر ہوتا ہوا بغداد پہنچا۔ تین برس امام غزالی کی صحبت میں رہا۔ اسی زمانہ میں امام ممدوح کے علاوہ کیا ہر اسی اور طوطوشی وغیرہ دیکھا ساتھ بغداد سے فیض دس سے بھی فیضیاب ہوا۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بغرض حج مکہ معظمہ گیا۔ مدت تک وہاں مقیم رہا اور علوم دینی میں علما سے حدیث سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ ابن تو مرت نہایت ہی متقی و پرہیزگار شخص تھا۔ اس کی دینداری اس مدت تک پہنچی ہوئی تھی کہ خود مخالفت شرع نہ ہونا دیکھتا کسی اور کو بھی کوئی خلاف شرع بات کرتے نہ دیکھ سکتا تھا۔ اپنے ان جذبات کے ظاہر کرنے میں اس قدر جری اور آندہ تھا کہ کسی بادشاہ کا خوف اس کے دل پر بیٹھتا تھا۔ نہ عوام کی برہمی سے ڈرتا تھا۔ نہ ایسے موقعوں پر علما و فضلاء کا کچھ پاس و لحاظ کرتا تھا۔ یہ آزادی ابتداؤ ہی فطرتی طور پر اس کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اب علم و فضل نے اس میں اور زیادہ جرأت اور ضد پیدا کر دی۔ وہ اسی بات پر بلاتامل علما سے لڑ بیٹھتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اکثر شہروں میں اس سے سخت ذلتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر اس نے کبھی اس امر کی پروا نہ کی۔ مکہ معظمہ سے آخر اسی قسم کی آزادانہ خود سیر کی بدولت اس سے نکلنا پڑا۔ مکہ سے نکل کے مصر میں پہنچا۔ وہاں بھی اسی طرح کی صورتیں پیش آئیں اور وہاں سے بھی نکلنا گیا۔ سلطنت نے جبراً و قہراً اسے شہر بدر کیا۔

یہ آزادویان اس سے نبہہ ہی خوب جاتی تھیں۔ اس لیے کہ زبان اتنی شیریں بانی تھی اور عربی میں ایسی فصیح و بلیغ بلکہ سحرنا تقریر کرتا تھا کہ جہاں اس کی مخالفت کا شور ہوتا تھا

وہاں بہت سے اسکے طرف راہ بھی ہو جاتے تھے۔ دولت دنیاوی کی اوسے کچھ پروا نہ تھی اور اس سادگی سے سفر کرتا تھا کہ سوا ایک چڑی اور چوٹے مشکینے کے کبھی کوئی چیز اپنے ہمراہ نہ رکھی۔ مخالفت کے طوفان میں پڑ کے اوس نے نجات کی یہ آخری تدبیر نکالی تھی کہ سٹی سو، ائی بنجا، اور ہکی ہکی بائیں کرنے لگتا۔ قاہرہ سے جب نکلوا گیا تو اس نے کھینچ کر مین جا کے جہاز پر سوار ہوا اور مغرب کے رخ چلا۔

جہاز والوں میں کم ایسے تھے جو پابند شرع ہوں۔ محمد بن تومرت نے اس بات پر اور زیادہ شروع کیا۔ مگر بیان اس کا رعب ایسا بٹھکا کہ کسی کو علانیہ مخالفت کی جرات نہ ہوئی۔ غصہ ناراضیاں دل ہی میں دب گئیں۔ اور جب یہ مدیہ کے ساحل پر اترے جہاز میں کوئی نہ تھا جو پابند صلوٰۃ نہ ہو یا کسی دن تلاوت قرآن میں مانع نہ ہو۔ محمد بن تومرت غصہ میں داخل مدیہ ہوا۔

مدیہ میں ان دنوں امیر تھیکے بن تھیم بن مغز کی حکومت تھی۔ یہ جا کے ایک مسجد میں اترتا جو شہر کی ایک سڑک۔ کیہ کن رے پر واقع تھی۔ مسجد کے اوس جہرہ کے میں جو سڑک کی طرف تھا بیٹھا۔ گدزنے والوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اور جہاں کسی کی خلاف شرع حالت میں دیکھتا فوراً اتر کے دست و گریبان ہو جاتا۔ دو ہی تین دن میں بہتوں کی ڈھولکین پیار ڈالیں۔ بہتوں کے طبل پاش پاش کیے۔ بہتوں کی بوق و قرنا توڑے۔ بہتوں کے تنبورے چمپن کے زمین پر دسے مارے۔ سیکڑوں شراب کے خم اور دیگر ظرف شراب چلنا چوڑ کیے۔ غرض سارے شہر میں ایک آفت مجاوی۔ ان کا ردو ایوں سے اوس کی شہرت ہو گئی۔ عام لوگ معتقد ہونے لگے۔ اور دھوم ہو گئی کہ ایک بڑے تاجر عالم دار مدیہ ہوئے ہیں۔ طلبہ نے آکے گھیرا اور سلسلہ درس شروع ہوا۔ ہوتے ہوئے اس کی شہرت امیر کے کان تک پہنچی اوس نے دربار میں بلوایا۔ بڑی قدر و منزلت کی۔ اور بہت کچھ عقیقت ظاہر کر کے نصرت کیا۔

ابن تومرت کو ایک جگہ قرار کیونکر آسکتا تھا اس لیے کہ وہ اپنے دل میں ایک خاص مشن کے اغراض پورے کرنا چاہتا تھا۔ وہ علم رمل کے بتائے ہوئے رفیق ابر شہر کو ڈھونڈتا رہتا تھا۔ غرض چند روز کے بعد مدیہ چھوڑ کے بجایہ میں پہنچا وہاں بھی سب معمول اپنی آزادانہ خود سریوں کی مشق کرتا رہا۔ اتفاقاً اپنے قیام بجایہ کے

زمانہ میں ایک مرتبہ ایک گاؤں میں گیا۔ جس کا نام ملالہ تھا۔ اس گاؤں میں راہ چلتے چلتے اسنے ایک نوعمر اور خوب دلڑکے کو دیکھا جس کے چہرے پر اوستہ ذہانت و ذکاوت کے علاوہ دولت و اقبال کے ستارے بھی چمکتے نظر آئے۔ اس لڑکے کی صورت میں کہیں ایسی دلفریبی تھی کہ محمد بن تومرت اپنے جذبات کو بالکل چپا نہ سکا۔ بے اختیار اوس کے قریب گیا اور کہا ”میاں عبا جزا دے تمہارا نام کیا ہے؟“ لڑکے نے اپنی فتنہ انگیز آنکھیں اوس کی طرف اٹھائیں اور کہا ”عبداللہ المومن“ اس نام کے سنتے ہی وہ بے اختیار چونکا اور ول میں گہرا دھنسا۔ ”میں تمہاری ہی تلاش میں تو مدتوں سے سرگردان ہوں! اب عبداللہ المومن کا نام سنتے ہی محمد بن تومرت کی وہ کیفیت ہوئی جو افسر لقیہ کے جادوگر کی حد میں عبداللہ الدین کی صورت دیکھ کے ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اوسے از غیبی دولت و سلطنت کے ملنے کا یقین ہو گیا۔ پھر محمد بن تومرت نے عبداللہ المومن سے پوچھا ”اور تمہارا مکان کہاں ہے؟“ جواب ملا ”کو میہ میں“ دریافت کیا ”ارادہ کیا ہے؟“ کہا ”ارض مشرق میں جاتا ہوں“ پوچھا ”کہیوں؟“ بتایا ”علم کے شوق میں“ ابن تومرت نے کہا ”علم و فضل و دولت و ثروت سب چیزیں تم کو خدا نے دیں۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔ میں وہ باطنی رموز تم پر ظاہر کرونگا کہ تم کو میرے کہنے کا یقین آجائیگا“ اس کے بعد ابن تومرت نے سارے راز اوس پر ظاہر کر دیے۔ اور یقین دلادیا کہ وہ ایک بہت بڑا شاہنشاہ ہونے والا ہے۔ الغرض اسوقت سے عبداللہ المومن اوس کے ہمراہ ہوا۔ جب یہ دونوں شخص ایک دوسرے کے رموز سے واقف ہو لیے تو ایک تیسرا شخص ہمراہ ہوا اور ایک مضبوط اسلحہ و ثلثہ قائم ہو گیا۔ یہ تیسرا شخص جس کا نام عبداللہ شمشانی تھا بڑا زبردست فقیہ اور متبحر عالم تھا۔ قرآن مجید اور موطاے امام مالک کا حافظ تھا اور فصاحت و بلاغت میں ابن تومرت کا ہم پلہ تھا۔ اب ملالہ ہی میں تینوں نے مل کے اپنی کارروائی شروع کرنے کی تجویز کی۔ اور پہلی حکمت عملی یہ قرار پائی کہ شمشانی بالکل گونگا بنجائے۔ اور اپنے تمام علم و فضل اور فصاحت و بلاغت کو اوس موقع پر یکایک ایک معجزے کی طرح ظاہر کرے جب اوس کی ضرورت پیش آئے گی۔ یہ تجویز بہت مناسب خیال کی گئی اور شمشانی ایک گونگے فرید کی طرح ابن تومرت کے ساتھ ہولیا۔ اب اس بات کی کوشش کی گئی کہ مریدوں کی ایک چھوٹی اور مضبوط

جماعت اپنے ساتھ لے۔ ابن قمرت کی ایک حکمت عملی یہ بھی تھی کہ ایسے لوگوں کو ہتھیار  
بنا کے اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرتا تھا جو علم کے اعتبار سے تو معمولی لیاقت  
کے لوگ ہوں مگر خوب صورت ہوں اور ہاتھ پاؤں کے بہت اچھے ہوں۔ اس لیے کہ  
ایسے لوگ پورے ارادت کش بھی ہو سکتے تھے اور لوگوں پر ان کا اثر بھی بخوبی پڑ سکتا  
تھا۔ الفاضل سی قسم کے چہ سات آدمی اس نے چُن چُن کے فراہم کیے جو ہمیشہ اس کے  
بارہ و نقی جو اس کا کام دے سکتے تھے۔

اس مختصر و لغزب اور رعب دار جماعت کے ساتھ بجایہ سے نکل کے وہ شہر میں  
تین پہونچا۔ اور یہی سلطنت تھی جس کو اس نے اپنا شکار بنانے کی کوشش کی۔ کیونکہ سارے  
ارض مغرب میں ان دنوں اس سے بڑھ کر کوئی باہمت قوت نہ تھی۔ حتیٰ کہ اس عہد  
کے فرمان روا یا ان اسپین بھی اس سلطنت کے آگے سر جھکائے ہوئے تھے۔  
محمد بن قمرت مع اپنے رفقا کے شہر کے باہر ایک ویران مسجد میں اترے۔ اپنی عادت  
کے موافق عوام شہر عہدہ داروں۔ علما و فضلا۔ رستے کے خوب سلطنت پر شرعی نکتہ چینیان  
شروع کر دیں۔ اور اس کے ساتھ ہی وعظ میں بادشاہ پر جو دراصل نہایت ہی نیک دل  
تاجدار تھا سختی سے امن طعن کا دروازہ کھولا۔ یہ خبر منور شہرت کے انتہائی درجہ  
تک نہ پہونچی تھی کہ ایک دن محمد بن قمرت نے ایسی جرات کر دی کہ سارے شہر میں  
ہلچل ہو گیا۔

وہاں رسم تھی کہ شاہزادیاں بہت کم پردے کی پابندی کرتی تھیں۔ غالباً نصارا  
اسپین کے اختلاط سے وہاں پر وہ چند ان ضروری نہ خیال کیا جاتا ہو۔ اسی رسم کے  
مطابق ایک روز بادشاہ وقت ابو الحسن علی بن تاشقین کی بہن اپنی لونڈیوں کے ساتھ  
گھوڑے پر سوار بے نقاب شہر کی سڑکوں پر سے گزری۔ محمد بن قمرت کی بے روک  
طبیعت مہلا اس بات کو کیونکر گوارا کر سکتی تھی۔ اپنے آٹھ زمریہ وں کے گردہ سے  
عورتوں کے غول پر بے تکلف جھپٹ پڑا۔ اور اکثر لونڈیوں کو مار پیٹ کے زخمی کر دیا  
ماتا جاتا تھا اور کتا جاتا تھا کہ مسلمان عورتیں اور یوں بے پردہ سیر کرتی پھرین۔  
خود شاہزادی کے گھوڑے پر اتنے ڈنڈے مارے کہ وہ انتہا سے زیادہ ہڑکا اور  
شاہزادی اس کی پیٹھ پر سے گر کے زخمی ہو گئی۔ عبداللہ بن قمرت تو مار پیٹ کے چلایا

اور لوگ شہزادی کو اوٹھا کے محل - سرے شاہی میں لے گئے۔ یہ خبر سارے شہر میں پھیلی اور لوگ ان لوگوں کی اتنی بڑی جرات و دلیری پر تعجب کرنے لگے۔

اس واقعہ کے بعد جمعہ کا دن آیا اور محمد بن تومرت مع اپنے مریدوں کے مسجد جامع میں پہنچا۔ اور سب ہمہ ایسی تو اوہرا و دہر مہیہ گئے مگر خود خاص اوس جگہ پر جا کے کھڑا ہوا جہاں بادشاہ نماز پڑھا کرتا تھا۔ وہ عمدہ دار جس کے ہاتھ میں سب کا انتظام تھا۔ اس نے قریب آ کے کہا کہ کیا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ یہ جگہ صرف بادشاہ اسلام کے ایسے نفوس ہے؟ اور اوس کے سوا یہاں اور کوئی نہیں کھڑا ہو سکتا ہے؟ اس پر محمد بن تومرت نے نہایت ہی برہمی کے ساتھ اوسکی طرف گھورے دیکھا اور سنبھیدگی کے لہجہ میں کہا: "ان المسجد لہ" (مسجد میں صرف اللہ کی ہیں) لوگ اس دلیری پر حیرت کرنے لگے اور اوس نے اون کی طرف متوجہ ہو کے خلاف شعاع امور کی تردید میں ایک پُر جوش تقریر شروع کر دی۔ یہ تقریر ہو ہی رہی تھی کہ بادشاہ آگیا اور لوگ حسب عادت چاروں طرف سے آداب شاہی بجالانے لگے۔ محمد بن تومرت بادشاہ کی جگہ پر جہاں کھڑا تھا بیٹھ گیا۔ اور سلام کرنا کیسا اور بادشاہ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ بادشاہ اب اس واقعہ نہایت ہی نیک نفس متفہم تھا اوس نے اس بات کی پرواہ ہی نہ کی اور دوسری جگہ کھڑے ہو کے نماز پڑھ لی۔ بعد نماز جیسے ہی امام نے سلام پھیرا محمد بن تومرت کھڑا ہو گیا۔ اور بادشاہ کی طرف متوجہ ہو کے پہلے تو سلام علیک کہا اور پھر کہنے لگا: "اے بادشاہ رعایا پر جو مظالم ہو رہے ہیں اونہی خبر سے ماننا کہ اون کی آواز تیرے کان تک نہیں پہنچی۔ مگر خدا کے ہاں جب جواب دہی رہتا ہوگی تب تو یہ کہہ کے نہ چھوٹ سکے گا کہ مجھے خبر نہ تھی غریبوں کی جان و مال کی حفاظت کا تو ذمہ دار ہے؟" بادشاہ نے اسکا کچھ جواب نہ دیا اس لیے کہ اوس نے محمد بن تومرت کا کچھ حال ابھی تک نہیں سنا تھا۔ اس کی اس وقت کی تقریر سے اوس نے خیال کیا کہ شاید یہ کوئی عالم ہے اور کچھ غرض رکھتا ہے۔ اسی خیال سے جا تے وقت بعض لوگوں سے کہتا گیا کہ اس شخص سے دریافت کرو اگر اسکی کوئی غرض الٹی ہو تو پوری کر دیجئے۔ محمد بن تومرت کو جب بادشاہ کا یہ پیام پہنچا گیا تو بولا: "اوس سے کہ دو میری غرض دنیا نہیں ہے۔ میں صرف مسلمانوں کی بہلائی چاہتا ہوں۔"

اب اس واقعہ کے بعد بادشاہ کو محمد بن تومرت کے تمام حالات معلوم ہوئے کہ

سلطنت کی مخالفت کرتا ہے۔ اور شاہزادی کو بھی اسی نے زخمی کیا۔ تو اوس نے تمام  
 عہدہ دار بار سے کہا اس سے میرے سامنے بڑا کے مناظرہ کر۔ آخر معلوم تو ہو کہ اس کی  
 غرض کیا ہے۔ اس حکم کی ذمہ آئیں ہوئی۔ اور محمد بن قمرت دربار شاہی میں حاضر ہوا۔  
 بادشاہ کی طرف سے مرید کے قاضی محمد بن اسود نے تقریر کی اور کہا درگیا یہ صبح ہے جو  
 شہر ہو رہا ہے کہ تم بادشاہ کو برا بھلا کہتے پڑتے ہو؟ اور بادشاہ بھی کون جو نیک نفس۔  
 پھر ہینر گار۔ خواہشات انسانی کا دشمن۔ اور احکام ربانی کا پابند ہے ۹۔ اس کے جواب  
 میں محمد بن قمرت نے بادشاہ کے سامنے حیرات اور فصاحت کے ساتھ کہا۔ یہ جواب  
 پانچ بیٹے ہیں کہ بادشاہ کے خلاف کلمات میں نے کہے یا نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ پانچ  
 بیٹے نے کہے اور بے شک کہے۔ باقی رہا یہ کہ بادشاہ متقی پھر ہینر گار۔ خدا ترس ہے اس  
 نفی میں اس اسی قدر کافی ہے کہ اوس نے تمہاری باتوں پر اعتبار کر لیا۔ اور جو تم ب  
 لہدیہ سے اوس کو بیچ جاتا ہے۔ حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ سلطنت کی تمام خرابیوں  
 کا جواب دہ ہے۔ خدا کے سامنے یہ کہہ کے چوٹ نہ جائے گا کہ مجھے اس کی اطلاع نہیں  
 ہوئی۔ قاضی صاحب۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ مسلمانوں کی آبادی میں سو سو مارے  
 مارے پھرتے ہیں؟ شراب علانیہ بک رہی ہے؟ اور یتیموں کے مال پر دست کسم  
 دراز ہے؟ یہ تقریر اس قدر ٹوٹر اور دل میں چبھتی ہوئی تھی کہ بادشاہ نے آبدیدہ  
 ہو کے نہایت مذمت سے سر جھکا لیا۔ اور دل میں کہا بے شک یہ سچ کہتا ہے۔ تمام  
 منہمک نے عرض کیا ”حضور اس شخص کی باتوں سے بوسے بغاوت آتی ہے۔ اس سے  
 مطمئن ہونے نہ ہونا چاہیے“ اور سب سے زیادہ اس بات پر علامہ مالک بن وہیب نے  
 زور دیا جو بادشاہ کے فرائض میں بہت دخل رکھتے تھے اور کہا ”اگر اس کا قتل خلاف  
 مصلحت ہے تو کم سے کم یہ ہونا چاہیے کہ یہ حراست میں رکھا جائے اور اسکے مصارف  
 کے لیے روزانہ ایک دینار مقرر کر دیا جائے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس ایک دینار کے عوض  
 میں اس کا ہاتھ سارے شاہی خزانہ تک نہ پہنچ جائے“ مگر بادشاہ کے ایک وزیر  
 نے کہا ”یہ لوگ روٹیوں کو تو محتاج ہو رہے ہیں سلطنت کو کیا ضرر پہنچا سکیں گے  
 بس انکی نرا کے لیے کافی ہے کہ خارج البلد کر دیے جائیں“ بادشاہ نے آخری را  
 سے اتفاق کیا۔ اور جوش رحم سے کہا ”میں تو ایسے صاحب علم ناصحوں پر ایسا ظلم نہیں



گوارا کر سکتا۔ غرض شاہی حکم کے مطابق محمد بن تومرت مع اپنے ہمراہیوں کے شہر مرگش سے نکال دیا گیا۔

یہاں سے نکل کے یہ لوگ مراکو کے ایک چوڑے شہر اغمات میں پہنچے۔ وہاں عبد الحق بن ابراہیم جو ادس شہر کا ایک با اثر عام تھا ان کے حق میں بہت ہی بکار آمد مشیر اور دوست ثابت ہوا۔ ادس نے محمد بن تومرت سے کہا: اگر بادشاہ کو ملک میں رہ کے تم آزادی سے اسکی مخالفت کرنا چاہو تو تم کو شہر اغمات میں نہ رہنا چاہیے اسلئے کہ یہ شہر تمہاری حفاظت نہ کر سکے گا۔ ایسی کارروائیوں کے لیے سب سے زیادہ مناسب اور موزون مقام ایک کوہستانی قصبہ ہے جو پہاڑوں کے شور و گدگد و دروں میں واقع ہے۔ اور یہاں سے ایک دن کی راہ ہے۔ اس گاؤں کا نام تینیل ہے۔ تینیل کا نام سننے ہی محمد بن تومرت مارے خوشی کے اوجھل پڑا۔ اس لیے کہ یہی وہ نام تھا جو اسے جفر کے فرشتہ نے بتایا تھا۔ اب اسے اپنی کامیابیوں کا بالکل یقین ہو گیا۔ فوراً عبد الحق سے رخصت ہوا اور تینیل کی راہ لی۔

اہل تینیل نے انہیں ملہا اور طلبہ کے لباس میں دیکھ کے بڑی تعظیم و تکریم کی۔ بڑی عزت سے اوتارا۔ اور ان کے بنے کو اپنے اچھے اچھے مکان خالی کر دیے۔ ابن تومرت نے یہاں چند ہی روز کے بعد سے بادشاہ کے خلاف وعظ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کوہستان کے تمام لوگ جوق کے جوق آتے اور اس کی نیارت کو موجب برکت خیال کرتے۔ ہر آنے والے سے یہ بادشاہ کی مخالفت کا کلمہ پڑھواتا۔ اور جو لوگ ادس کی راہ سے اتفاق کر دیتے ان کو اپنے مخصوص مین شامل کرتا۔ ایک یہ بھی اصول تھا کہ توانا و متدرست نو عمر دن اور مالداروں کو زیادہ عزت دیتا۔ کوہستان کے ذی عقل اور صاحب اثر لوگ اگرچہ ادس کے بالکل مخالف تھے۔ مگر عوام میں سے اکثر کو اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے موافق کر لیا۔

اسی اثنا میں محمد بن تومرت کو اپنے اغراض پورے کرنے کا ایک نہایت عمدہ موقع مل گیا وہ یہ کہ وہ اہل کوہ کو اکثر دیکھتا تھا کہ وہ تو سانوں سے مگر اکثر لڑکے زرد اور بہرے رنگ کے تھے۔ ایک دن ادس نے لوگوں سے اس کا سبب پوچھا جس کے جواب میں انہوں نے سکوت کیا اور ندامت سے سر جھکا لیے۔ ابن تومرت کے زیادہ اصرار پر انہوں نے

بیان کیا۔ ”ہم لوگوں سے خراج سلطنت وصول کرنے کے لیے ہر سال شاہی غلام آیا کرتے ہیں جو عموماً رومی یونانی اور انگریزی ہیں۔ اگرچہ بادشاہ کو اس کی خبر غالباً نہ ہوگی مگر وہ لوگ ہماری ٹرے رسوائی کرتے ہیں آتے ہی ہمیں ہمارے گھروں سے نکال دیتے ہیں اور ہماری عورتوں کو بے عزت کر دیتے ہیں۔ جب تک وہ لوگ یہاں رہتے ہیں ہمارے ہی غلام رہتا ہے۔ اور اسی وجہ سے ہماری عورتوں کی شادی لادین اور ان کے رنگ پر ہوتی ہیں“ محمد بن تومرت نے نہایت طیش لاسنے والے لہجہ میں کہا، ”حد کی قسم اس زنا کی سے موت چھو بہے!، سبھوں نے کہا۔ ”بے شک“ یوحنا ”بھلا اگر زلی اس بارے میں تمہاری داد سنی کرنا چاہے تو اس کا ساتھ دو گے؟“ سب نے اتفاق کیا، ساتھ دینا کیسا ہم دسے حکم پر اپنی جانیں نثار کرنے کو موہو دھون بن گئے۔ یہ وعدہ دے کے ابن تومرت نے کہا، ”تو اچھا۔ اس کی مرتبہ جب وہ غلام میں تو سب معمول اونکو اپنی بی بیوں سے ملانا اور ان کو خوب شراب پلانا۔ ابن غنیل نے کہا، ”بہتر، چند روز کے بعد وہ زمانہ آگیا شاہی غلام آئے اور ابتداً بڑی خاطر داری کے ساتھ گھروں میں اور رہے گئے۔ اور شراب میں پلا پلا کے بدست کر دیے گئے۔ یہ کام پورا کر کے لوگوں نے ابن تومرت کو خبر کی۔ اوس نے فوراً قتل عام کا حکم دیدیا۔ اور سب غلام مار ڈالے گئے۔ صرف ایک غلام جو اتفاقاً کسی کام کے لیے اپنی فرو دگاہ سے باہر گیا ہوا تھا باہر ہی خبردار ہو گیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ دوسرے دن گھائیوں سے نکل کے بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔ اور غلاموں کے قتل ہونے کا حال بیان کیا۔ اوس نے یہ جی کہہ دیا کہ وہاں محمد بن تومرت سب کا سردار بنا ہوا ہے۔ اور اوس کے حکم سے یہ کارروائی ہوئی۔

بادشاہ کو یہ سن کے بڑی فکر پیدا ہوئی، اور پچھتا نے لگا کہ ابن تومرت کے بارے میں بے شک مالک بن وہیب ہی کئی رائے ٹھیک تھی۔ اس خونریزی کے انتقام کے لیے دس ہزار سوار روانہ کیے گئے۔ جو فوراً مرشش سے جل کے تینیل کی گھائیوں میں گئے۔ محمد بن تومرت اس نتیجہ کو پہلے ہی سے سمجھ چکا تھا۔ اور جانتا تھا کہ بادشاہ کی فوج ضرور آئے گی۔ اوس نے تمام پہاڑ والوں کو دروں میں دونوں طرف پہاڑوں پر بٹھایا تھا اور حکم دیدیا تھا کہ جیسے ہی بادشاہ کی فوج آئے تم اوپر سے پھرتا بھگانا اور مارنا شروع

کردو۔ یہ حکمت نہایت بکار آمد ثابت ہوئی۔ دس ہزار سواروں بہر کی گومتانی منزل میں تہہ پہن کے نیچے کچل کچل کے اور چوٹ کھا کھا کے تباہ ہو گئے۔ اسی حالت میں رات ہو گئی۔ جسکے اندر میرے نین باتیادہ سوار بالکل درہم و برہم ہو سکے بہا گئے۔ جب یہ آفت رسیدہ فکر مراکش میں پہونچا اور بادشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو نسبت پر ایشیاں ہوا اور مجبوراً فیصلہ کر لیا کہ فنیل والون سے اب کوئی فراغت نہ کی جائے۔ آخر کلب تک بغاوت کرتے رہینگے۔ اب محمد بن تومرت کو اس بات کی ضرورت معلوم ہوئی کہ اپنی جماعت کو زیادہ قوی کرے کیونکہ اپنی حفاظت تو وہ بہت اچھی طرح کامیابی کے ساتھ کر چکا اور اب وقت آگیا کہ پہاڑوں سے نکل کے بادشاہ کے شہر وں پر حملہ آور ہو۔ یہ ضرورت یوں پوری ہوئی کہ ایک روز صبح کو نماز کے وقت و نشریشی نے کہا ”میں کچھ کہنا چاہتا ہوں“۔ ابن تومرت یہاں والون کے سامنے چوتھک پڑا۔ اور کہنے لگا کہ ایک گونگے شخص کا بات کرنا بالکل عجیب بات ہے فوراً اوس نے تمام لوگوں کو بلوایا۔ جب سب آگئے تو ابن تومرت کی اجازت سے عبد اللہ و نشریشی میرے جا کے کھڑا ہوا اور سب کی طرف خطاب کر کے کہنے لگا ”یہاں معاشرہ آج تک میں گونگا تھا لیکن الحمد للہ کہ آج خدا نے مجھے تمام جسمانی و روحانی نقصانات سے پاک کر دیا۔ رات کو ایک فرشتہ آسمان سے اتر کے میرے پاس آیا اوس نے میرا سینہ شق کر کے ساری ہڈیاں اور سارے نقصانات نکال ڈالے۔ اور مجھے بالکل فرشتوں کی طرح معصوم بنا کے میرے دل میں ایمان و علم کو بہر دیا۔ یہی سبب ہے کہ میں جو کل ایک جاہل اور گونگا تھا آج ایک زبردست عالم حافظ قرآن و موطا مبارک ہوں اور اس فصاحت سے کھڑا تقریر کر رہا ہوں“ اس معجزے نے سب کے دل میں بڑا جوش پیدا کر دیا۔ اور ہر شخص صدق و دل سے اوس پر ایمان لایا۔ محمد بن تومرت نے ادب کے کہا ”الحمد للہ کہ خدا نے آپ کو ہمارے لیے ایک معیار بنا دیا۔ اور آپ کے ذریعہ سے ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم میں کون کیسا ہے۔ فرمائیے ہم لوگوں کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے“ و نشریشی نے کہا ”تم ہمدی قائم بامر اللہ ہو۔ جو کوئی تمہاری پیروی کرے وہ ناجی ہے اور جو مخالفت کرے وہ ناسی ہے“ و نشریشی کے اس جملہ سے یہ فائدہ اٹھایا گیا کہ پہاڑ پر جتنے لوگوں کی نسبت مخالفت کا گمان تھا عام اس سے کہ وہ عالم و فاضل ہی کیونکہ ہوں سب قتل کر ڈالے گئے۔ اور فنیل و فافون سے بالکل خالی ہو گیا۔

اسی وقت سے ابن تو مرت نے لڑائی شروع کر دی۔ اور دس ہزار کوہستانیوں کی ایک فوج عبدالمومن اور وٹشریشی کے ہمراہ کر کے مراکش روانہ کی۔ اس لڑائی کا نتیجہ ایسا اودٹا ہوا کہ یقیناً سارا ہنا بنایا کیل بکرا گیا ہوتا مگر حدی کی ہوشیار سی اپنا پورا کام کر گئی۔ لڑائی میں فوج کو بڑی فاش شکست ہوئی۔ وٹشریشی مراکش کی واپس واپس کے نیچے مار گیا۔ اور عبدالمومن چند رفا کے ساتھ ناکام و شکستہ دل واپس آیا۔ عبدالمومن تین سال تک ہونچا ہی نہ تھا کہ قضا نے ابن تو مرت کا کام تمام کر دیا۔ ابن تو مرت کو مرتے وقت اس شکست کی خبر معلوم ہو گئی تھی اوس نے تمام موجودہ لوگوں کو بلا کے کہا۔

وہ میں تو تم سے رخصت ہوتا ہوں مگر میرا یہ پیام عبدالمومن کو پہونچا دینا۔ میرے بعد دین کی تقویت کے لیے خدا نے اوسی کو میرا جانشین بنایا ہے۔ میری طاعت اب اوس کی اطاعت سب پر فرض ہے۔ لڑائی میں شکست ہوئی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ معرکہ ہات جنگ میں ہمیشہ یہی رہا ہے کہ آج ہم غالب رہے اور کل کوئی اور۔ مگر ان انجمن میں عبدالمومن ہی کو کامیابی ہوگی۔ اس لیے کہ خدا کی مرضی یہی ہے۔ جو کام شروع ہوا ہے عبدالمومن سے تاکید کر دینا کہ اوس کے لیے برابر پاکبازی سے کوشش کرتا رہے۔ یہ کہہ کے اوس نے دنیا سے مفارقت کی۔ اگرچہ عبدالمومن نے ابن تو مرت کے مرنے کی خبر سن کے بڑا حدسہ اودٹھایا مگر اوس کی وصیت پوری کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ چند ہی روز بعد عبدالمومن سے بڑا کوئی بادشاہ سرزمین مزب میں نہ تھا۔ اگر انصاف سے پوچھیے تو عبدالمومن کے لیے وہ سب سامان تیار کر گیا تھا۔ لیکن یہ حسرت دل میں لے گیا کہ جس سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی اوس سے خود بالکل نفع نہ اودٹھا سکا۔ ابن تو مرت ۷۷ھ میں مرا۔

## دار الخلافت قرطبہ

### نمبر ۱۱

اوس وقت تمام شیوخ قرطبہ نے باہم مل کے مشورہ کیا کہ دار الخلافت بغداد تک تو ہماری آواز پہونچ نہیں سکتی۔ اور وہاں کے خلیفہ کی توجہ کے انتظار میں ہم تباہ ہوئے تھے۔

یہاں ملک کی جو حالت ہو رہی ہے ظاہر ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اموی شاہزادے کو بلا کے ہم اپنا فرمانروا بنائیں جو ہماری خوش قسمتی سے دروہن کے پناہ گزین ہو اسے۔ اور بے شک وہ خاندان خلافت سے ہے جسکے ہم مکھوار اور احسانمند ہیں۔ سبھون نے اس راے کو پسند کیا۔ اور قریطہ و ابون نے اس صلح کے مطابق چند مغزین کو اپنا وکیل بنا کے مراکو میں عبدالرحمن بن معاویہ کے پاس بھیجا۔ عبدالرحمن نے اون کی وفاداری پر بہرہ و سا کر کے اپنے منبر بان قتیباہ میں سے چند لوگ ساتھ لیے۔ اور ابو جعفر منصور دوسرے خلیفہ عباسی کے عہد میں مسئلہ میں آئے۔ جبل الطارق سے اتر کے اسپین میں قدم رکھا۔ اور سید باقریہ کی طرف روانہ ہوا۔ قریطہ میں اسکی بڑی قدر و منزلت کی گئی۔ تمام لوگوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مخالفین یہ خبر سن کے متعلقہ کو آمادہ ہو گئے مگر ہر موقع پر عبدالرحمن نے ایسی شجاعت کے جوہر دکھائے کہ اس کے ہمدردوں نے جس قدر دلدی اوسی قدر دشمنوں نے اوس کا نوبھان لیا۔ آخر تمام اسپین جو حکومت اسلامی میں تھا اوسکے قبضہ میں آ گیا۔ طوائف الملوکی ختم ہوئی۔ اور تاریخ میں ایک نئی با عظمت سلطنت قائم ہوئی۔ اوسکے بعد حکومت اسپین بہت پشتون تک اوسکی کے قبضہ میں رہی۔

یہ کہنا چاہیے کہ قریطہ کی رونق و ترقی کا دور اب شروع ہوا۔ جبکہ وہ کسی صوبہ کا ہیڈ کوارٹر نہیں رہا۔ بلکہ ایک سلطنت کا مرکز اور ایک عظیم الشان قوت کا دار السلطنت قرار پایا۔ عبدالرحمن بن معاویہ کی زندگی بہت سادی گذرتی تھی۔ وہ اپنے مذاق کے ایک بادشاہ نہیں ایک جرار سپہ سالار بلکہ ایک جانباز سپاہی تھا۔ اپنی حکومت کا ابتدائی زمانہ اوس نے صرف جنگ جوئی۔ فتوحات اور سلطنت کے مضبوط کرنے میں صرف کیا۔ اس طرف سے جب ذرا اطمینان ہو لیا تو مسئلہ (مطابق مسئلہ ۴) میں اوس نے جامع قریطہ کی بنیاد ڈالی۔ اس ارادہ کا محرک یہ امر ہوا کہ سرحدی ممالک پر عیسائیوں کے مقابلہ میں اوس کو بہت سی عظیم الشان فتحیں حاصل ہوئیں اور ان فتوحات میں بے انتہا نقد رقم ہاتھ آئی۔ عبدالرحمن نے یہ پسند کیا کہ اس روپیہ کو کسی اور کام میں لگائے۔ اس لیے کہ چاہتا تھا جو رقم خدا کی مدد سے حاصل ہوئی ہے وہ خدا ہی کے کام میں صرف ہو۔ اور تعمیر مسجد سے زیادہ خدا کا کون کام

ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دمشق کے بڑے گرجے کا نصف حصہ خالد بن ولید اور ابو عبیدہ بن الجراح نے سیحیون کے قبضہ میں رہنے دیا تھا اور نصف کو اپنے قبضہ میں لے گئے اوس پر مسجد بنائی تھی اوسی طرح ابتدائی فائنٹان اسپین نے قرطبہ کے بڑے گرجے میں بھی اپنا حصہ لگا لیا تھا۔ اور گرجے کی آدھی زمین پر اپنی مسجد بنالی تھی۔ مگر یہاں یہ سختی تھی کہ حکم دیدیا گیا تھا کہ اوس گرجہ کے سوا جس میں سے نصف مسجد کے لیے لیا گیا باقی تمام گرجہ جو قرطبہ میں ہوں منہدم کر دیے جائیں۔ مسجد اور کلیسیا یونین عبد الرحمن بن معاویہ کے عہد تک رہے۔ عبد الرحمن نے اب اس مسجد کے بنانے کا انتظام کیا۔ اور عیسائیوں سے درخواست کی کہ وہ نصف حصہ جس پر گرجا بنا ہے سلطنت کے ہاتھ فروخت کر ڈالیں اور اپنے لیے دوسرا گرجہ بنالیں۔ عیسائیوں نے اکتہ اڈنا منظور کیا اور آفریقین یہ درخواست کی کہ اگرچہ میں اپنے کل منہدم شدہ گرجوں کے پھر قائم کرنے کی اجازت دیجائے تو البتہ ایک لاکھ دینار پر مطلوبہ گرجا دیدین گئے۔ یہ درخواست عبد الرحمن نے نہایت فیاضی سے منظور کی۔ عیسائیوں نے اپنے تمام گرجوں پر قبضہ کیا۔ اور بادشاہ نے جامع قرطبہ کی تعمیر شروع کی۔ وہ کلیسہ منہدم کیا گیا اور اوس کی زمین پر مسجد جامع کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔ عبد الرحمن نے اپنی زندگی میں اسی ہزار اشترنیاں تعمیر کئے بابت صرف کہیں۔ آخر اوسکی زندگی پوری ہو گئی اور مسجد پوری ہونے کو نہ آئی۔ اوسے اس جامع کی تکمیل کا بڑا شوق تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اوسکی آخر عمر کی ساری امیدیں اسی جامع کے ساتھ وابستہ تھیں۔ اور اس کے واسطے اوس کے بڑے بڑے ارادے تھے۔ ہر روز بلا ناغہ ایک گھنٹہ بھر آ کے مسجد کے کام کو دیکھتا تھا۔ اور تجویز تھی کہ اس جامع کے متعلق دارالعلوم۔ مدارس اور شفاخانے بھی کھولے جائیں۔ یہ مسجد اوس نے بالکل دمشق کی جامع بنی امیہ کے نقشہ کے مطابق بنانا شروع کی تھی۔ لیکن چاہتا تھا کہ اسکی رونق و عزت اوس سے بھی زیادہ ہو اور اسی لیے تاکید کردی تھی کہ بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ سے ہرگز کم نہ ہو۔ انہیں اہتمام میں تھا کہ اوسے عالم جاودانی کا سفر کرنا پڑا۔

اب ہوندا اور باپ کی مرادین برلانے والا بیٹا ہشام سلطنت کے تمام کاروبار کے ساتھ اس مسجد کا بھی متولی ہوا۔ لیکن باپ ہی کے ایسے حوصلہ چونکہ اوس کے

دل میں بھی موجود تھے۔ لہذا اوس نے یہ نہ پسند کیا کہ باپ نے جس خالص روپیہ سے اس دینی عمارت کو شروع کیا ہے اوس میں سلطنت کے روپیہ کو ملا دے۔ تخت پہ بیٹھتے ہی اوس نے حدود مشرق کی طرف کوچ کیا۔ اور پیر منیر سے نکلتے ہی فرانس کے شہر سربون پر حملہ کیا۔ اس سفر میں اوس نے عیسائیوں پر متعدد فتوحات حاصل کیں اور بہت سارا مال غنیمت لے کے قرطبہ میں واپس آیا۔ اور یہ روپیہ تعمیر جامع میں صرف کرنا شروع کیا۔ اور یوں ۹ برس کی مسلسل تعمیر کے بعد ۱۰۹۷ء (مطابق ۴۹۳ھ) میں یہ مسجد تکمیل کو پہونچی۔ اور چونکہ بڑی توجہ سے بنوائی گئی تھی لہذا اس کا شمار بھی دنیا کی اول درجہ کی عمارتوں میں ہے۔

گوکہ شہنشاہ نے اس جامع کو اپنے خیال کے مطابق تکمیل کو پہونچا دیا تھا مگر نہیں دراصل اسکی مرمت اوس وقت تک جاری رہی جب تک کہ یہ خاندان اسپین پر حکمران رہا۔ ہر بعد آئے وہ اسے خلیفہ نے اس کو ایک خاندانی یا وگاہ سمجھنے کے اپنی نیکنامی کا ذریعہ خیال کیا۔ اور کوئی کم ایسا خلیفہ ہو ا ہوگا جس نے اس میں کوئی نئی بات اپنی یادگار قائم رکھنے کے لیے نہ پیدا کی ہو۔ کسی نے ستونوں پر سونا بٹھایا کسی نے کوئی بنا مینار قائم کر دیا۔ کسی نے کوئی محراب بنوا دی۔ غرض یونہی یہ جامع مسجد ہر روز ایک تازہ شان و شوکت حاصل کرتی رہی۔ جس ترتیب سے آئندہ خلفائے اس مسجد کو بار دہنق بنایا اور کا خلاصہ یہ ہے کہ عبد الرحمن بن معاویہ نے تعمیر شروع کی۔ اوسکے بیٹے مشام نے تکمیل کو پہونچایا کیونکہ عبد الرحمن ناتمام چھوڑ کے مر گیا تھا۔ مشام کے بیٹے عبد الرحمن اوسط نے کوشش کی کہ یہ جامع بمقابلہ دنیا کے اور بڑی ہو جائے۔ اس امر کی کوشش اوس نے شروع کی تھی کہ ناتمام چھوڑے مر گیا۔ عبد الرحمن اوسط کے مرنے کے بعد محمد بن عبد الرحمان الاوسط نے اپنے باپ کی ناتمام کوششوں کو پورا کیا۔ المندر نے اس کی ترمیم کی۔ الناصر الدین اللہ نے بعض حصوں کو از سر نو بنوایا۔ اور پھر انابرج مہندم کرا کے نیابرج تعمیر کیا۔ جو نہایت خوشنما اور شاندار تھا۔ اور جو آج تک موجود ہے۔ مگر الحکم نے مسجد میں بہت زیادہ اضافہ کیا اس لیے کہ اس وقت قرطبہ کی آبادی بہت زیادہ ہو گئی تھی جس کے لیے مسجد اپنی گزشتہ وسعت سے کافی نہ ہو سکتی تھی۔

- باقی آئندہ -

## تماشا گاہ عالم

دنیا میں صرف اہل تصوف اہل ذوق مانے گئے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ خیالی اور الہامی کیفیات ذہنی پر غور کرتے کرتے انھوں نے اپنا ذوق کچھ دیرت جی کر لیا ہے۔ زائد جو بکے عقیدت کیش اور احکام شرعی کے بے عذر فرمان بردار تھے اُن کو خشک مٹی اور دشت مزاجی کا الزام دیا گیا ہے۔ لہذا نہ مشرب اسے جو کچھ محسوس لذتوں کی غیر مستقل مسرتوں میں پڑ گئے لہذا وہ جی چوڑے طرف داسے خیال کیسے گئے بس ہی الزام تھے جن کی بنا پر دونوں کی بے اعتباری ہو گئی۔ اگر اس شخص میں اعتبار کیا گیا تو صوفیوں کا جنہوں نے بس طرف توجہ کی صرف ایک بالطف ذوق حاصل کرنے اور طبیعت میں ایک زندہ دلی کا مذاق یہ اکرنے کے لیے۔ وہ محسوس لذتوں اور چند ہی روز میں ڈھل جانے والے جنہوں کی طرف نہیں متوجہ ہوتے۔

بیشک صوفی اہل ذوق ہیں۔ عالم کی دلچسپیوں پر غائر نظر صرف انہیں کی پڑی ہو کر وہ ہوئے ہیں جنہوں نے دنیا کی ہر حالت کا اندازہ کرنا چاہا۔ اور ہر طرف کالی توجہ کی۔ اول تو یہی اہل تصوف جن کے اہل ذوق ہونے کو ابھی ہم اعتراض کر چکے ہیں۔ دوسرے اہل فلسفہ جنہوں نے سچ پوچھے تو عالم کی ہر حالت اور باع دنیا کے ہر منظر پر بہت زیادہ غور کیا لیکن فرقی اتنا ہے کہ اہل تصوف نے صرف ایک خیالی دلچسپی حاصل کرنے کے لیے انکی طرف توجہ کی۔ اور فلسفیانہ نثر ان باتوں کو ان کی ماہیت اور اصلیت دریافت کرنے کے لیے دیکھا دونوں کا کام گواہ تھا مگر غرض بدلی ہوئی تھی۔ صوفی اپنے نفس کے واسطے صرف سامان مسرت حاصل کرنا



چاہتے تھے۔ اور فلسفی خدا کے رموز اور قدرت کے اسرار کا طلسم اپنی ذہانت کے زور سے توڑنا چاہتے تھے۔ لیکن اگر انصاف سے دیکھتے تو رمزہ کچھ صوفیوں کی باتوں ہی میں خوب آتا ہے۔

فلسفی اپنے کنج تنہائی میں بیٹھا ہے اور اُس کا خیال اسباب و حقیقت ایسا کے تجسس میں گردش کر رہا ہے۔ اُس کا نفس اسباب و علل ڈھونڈنے میں اس قدر منہمک ہو گیا ہے کہ اُس کے دل پر دنیا کی لذتوں اور سر توں کا بالکل اثر نہیں ہوتا۔ یہ دل کی بے حس اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ قدرت کے جادو جو اکثر اثر پذیر دونوں پہ چل جایا کرتے ہیں اُس پر بالکل نہیں کامیاب ہو سکتے۔ اس کا خیال صحرا کی طرف جاتا ہے۔ وہ ان غزالان صحرا کو ادھر ادھر پر چڑھ کر دیکھتا ہے جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ مگر وہ اُنھیں بنی فلسفیانہ تحقیق میں ایک حیوان غیر ناطق اور بہ مقابلہ انسان ایک ادنیٰ درجہ کا حیوان تصور کرتا ہے۔ خیال اُسے باغ کی طرف لے جاتا ہے۔ گل و بلبل کے افسانہ اُس کے کان تک پہنچتے ہیں۔ بلبل کی داستان عشق سناتا ہے۔ گل کی معشوقانہ بے پروائیوں اور غم و راندہ تبسم و ہنر دیکھتا ہے مگر مصداق العلم حجاب الابرار تامہ نما میں جو زبان حال سے ادا کیے گئے اُس کی عجم بین نہیں آتے۔ اور وجہ یہی کہ اُس کا خیال ان باتوں کے آخر اور لطیف کی طرف نہیں توجہ۔ وہ تو فقط یہ دیکھتا ہے کہ اُن کی اصلی حقیقت کیا ہے جس کا جواب اُسے اپنے کائنات سے اسی قدر ملتا ہے کہ بلبل کے نغمہ اگرچہ ایک نہایت زیر و بم اور مختلف سروں کی وجہ سے کسی قدر موزوں سے معلوم ہوئے مگر بالکل مہل اور بے معنی ہیں۔ پھولوں کی نازک نیکھربان۔ اُن کے تر و تازہ اور شاداب مسکراہٹے وائے ہونٹھے۔ اُن کا نظر فریب رنگ۔ اُن کی روح افزا خوشبو ان سب چیزوں کو بھی وہ ایک موسمی ہیہ قدرت خیال کرتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ اول سے آخر تک اُن کے مزاج اور اسباب وجود پر غور کرتا رہا۔ لہذا اُس کے دل پر کسی قسم کا اثر نہیں ہوا۔ بلکہ صاف یہ سمجھ کہ وہ سمجھا ہی نہیں کہ یہ کیا چیزیں ہیں۔ شعر کو کیا ہو گیا ہے جو ہمیشہ انہیں چیزوں کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ اور ب باتوں کو جاننے دیکھے۔ اس سے زیادہ بے حس کیا ہوگی کہ نازیبان دربار اور ناز و فرودشان حورا کی ظالم آنکھیں جنکی

تیر نظر کے بس ہوتے ہیں۔ رنم اور صوفی دونوں ایک دوسرے کے رقیب و حریف  
 ہیں ان کے وہ تہ و تحریرتہ کو بے خطا ادا کرتے ہیں وہ بعض اوقات اس  
 شکر فلسفی کے دل پہی آئے مگر اس کا دل خدا جانے کس تو ہے کا بنا تھا۔ کہ بغیر اسکے  
 کہ اُسے دُور ہو دل سے مگر کھا کے الگ جا رہے۔ فلسفی اپنی تحقیق کی دُہن میں  
 اس قدر سنگدل بن گیا ہے کہ تماشکا گاہ عالم کی دلفریبوں سے لطف اٹھاتا اُسے  
 کچھ نہیں نصیب ہوا۔ ہمارے خیال میں یہ ایک بنے بچہ مگر عقلاً نہ سیر مٹی۔ مگر صوفی  
 جو اہل ذوق و اہل دل مانگیا ہے اُسکی سیرا کے لطافت اور دقتِ وقت بڑے  
 مزے کی سیر ہے۔

صوفی کو بھی خدا نے دیسا ہی دل اور ویسی ہی آنکھیں دی ہیں جیسی اس  
 مذکورہ بالا فلسفی کو ہیں۔ مگر وہ تماشکا گاہ عالم کو ایک مزید ارتعاش کا استیج بنا  
 کر کے دیکھتا ہے۔ اُسکا جرمہ یا اُسکی خانقاہ دراصل تخیل کا ایک عمدہ خاکس ہے جہاں  
 سے بیٹھ کے وہ تماشکا گاہ عالم کی سیر عجیب با مزہ محویت کے ساتھ کرتا ہے۔ دنیاوی  
 تفسیرات جو بالکل تھیں کر کے پڑھنے کی طرح سامت بسامت بدلتے رہتے ہیں اُسکے  
 ہر سین کو وہ مزہ لے لے کے دیکھتا ہے۔ یہ حالات دیکھ کے وہ فلسفی کی طرح  
 بے فحول اور بے مزہ بنت میں نہیں پڑ جاتا کہ ایسا کیوں ہوا۔ یہ کیفیت کی موجود  
 لطف سے لذت اٹھاتا ہے۔ اور ہر قدرتی اثر سے متاثر ہو جاتا ہے۔ بزمِ قدرت  
 کے دلفریب مہربا تماشکا گاہ عالم کے سچے یا اصلی بہرہ میں نظر آنے والے اکائیوں  
 کی زبان حال سے جو کچھ سنتا ہے اُسکو سمجھتا ہی ہے۔ جن ہر نون کی طرف دیکھ کر تیر  
 عشق عامری (اصطلاح المذنبہ نے جن ہر نون کی طرف دیکھ کے کہتا ہے۔

بلسدیا اعداء القلع قلن لنا ایلاے سنگن ام لیسا من البشر

(جنگل کی ہر نیو! تمہیں نہ انکی قسم بناؤ میری لیلایم میں ہے یا آدمیوں میں سے؟)  
 ان ہر نیوں کو وہ بہت غور کر کے دیکھتا ہے۔ ان کے خط و خال۔ ان کی سکھری  
 انکی مستانہ آنکھوں کو دیکھ کے وہ بھی بے اختیار چلا اٹھتا ہے کہ ہاں۔ ہاں بیشک  
 ان میں معشوقیت یا محبت کی زبان میں ایک قسم کا لیلایم ہے۔ اور اس تصور  
 کو استقلال کے ساتھ دل میں جاسکے وہ ان ہر نون کی ہر ادا کو نہایت

بتیاب ہو ہو کے رہ جاتا ہے۔ فلسفی کی تحقیق کو وہ ذات کی نظر سے مال کے  
قیس عامری کو اُنکی اُسس عمدہ ذوق پر ڈگری دیتا ہے۔ جسکی بنا پر اُنھوں نے اُمین عشق  
میں اجتہاد کر کے اس ہر لون کو بار بار دیا شبہ لیلہ، اُنکے پیار سے لفظ سے یاد کیا تھا  
وہ گل و بلبل کے افسانہ کو عبرت و حسرت کے کانون سے سنتا ہے۔ بلبل کی نالہ و  
زار سی اور عاشقانہ نکات و ن کو وہ سمجھتا ہے۔ وہ بلبل کے اُس مذاق کو نہایت  
پسند کرتا ہے جس نے اُسے کسی عاشق کا ہر دوہم مذاق بنا دیا۔ اور بھول سی ہیں  
مصلحت پر نہایت محفوظ ہو جاتا ہے۔ جو ہمیشہ اُسے کسی لعل پیرہن کا زیور بنا دیا کرتی  
ہے۔ اُس کا خیال تدبیر کا ہر طرف جاتا ہے اور نہ اُنکا گاہ عالم کی ہر کیفیت کو بخوبی دیکھ  
بھال لیتا ہے۔ آخر اس کا خیال اُس ناز و نوش کے جلو سے پر پہونچتا ہے۔ جو دنیا  
کے اسٹیج پر ایک دیوی یا ایک ہیروئن بن گئی ہے۔ وہ اُسکو قدر کی نگاہوں  
سے دیکھتا ہے۔ اُنکے ہر تیر فقر کو شوق کے ساتھ خود ہی اپنے دل پر لیتا ہے۔ اُسکا  
دل فولاد کا نہیں۔ بلکہ جو تیر آتا ہے وہ اُنکے دل میں پیوست ہو کے اُسے درخند  
بنادیتا ہے۔ دلی لطف اُٹھانے والے بیانات کی دُھن میں کبھی اُسکی زبان  
سے آہ نکل جاتی ہے۔ اور کبھی واہن آواز سننی جاتی ہے۔ تا شا گاہ عالم کی  
سیر دیکھنے والا اصل میں پوچھے تو وہی ہے۔ دنیا غفلت میں تھی۔ خدا رست  
عبادت میں تھے۔ قدرت کے سامان جو دنیا والوں کی دلچسپی کے لیے بھیجے گئے  
تھے اُن سے لطف اُٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ سب سامان عام بے توہی کے  
پر دے میں چپے پڑے تھے۔ اہل دل اور بچے ذوق والے صوفی نے وہ بے  
توجہی و غفلت کا پردہ چاک کیا وہ عالم اور وہ تماشا دیکھا جو اور کسی کو نہیں نظر آیا  
تھا۔ انھیں تماشوں نے اُسے ایک ایسے خیالی غوت کدے میں بٹھا دیا جس کی  
دلچسپیوں نے اُسے مرتے دم تک وہاں سے باہر قدم نہ نکالنے دیا۔

ہاں زند مشرب البتہ اُس پاکباز صوفی کے کم ظرف ہم مشرب تھے۔ جن سے  
آشنا ضبط نہ ہو سکا کہ ان کیفیتوں کو ایک خیالی عزت کدہ میں بیٹھ کے دیکھتے۔ اُنکے  
دل میں یہ تماشا دیکھ کے معنونا نہ جوش پیدا ہوا۔ وہ اُسٹھ کھڑے ہوتے۔  
اور اُس جوش کے ساتھ کہ جس دلچسپی کے محسوس سامان تک رسائی ہوئی

بس اُسی کے ہو رہے۔ آہ! ہمیں اپنے اُس رند مشرب دوست کے حال پر بڑا ترس آتا ہے۔ اپنے ذاتی طبیعت کے دلولہ میں وہ بھی دراصل ایک پاز صوفی تھا۔ کاش اگر وہ اپنی اُسی حد پر قائم رہتا اور صرف خیالات سے حن ہوشان کی قدر کرتا رہتا تو ہم اُسکے مرید ہوتے اور اُسے صوفی صافی کہتے۔ یا اگر خیالات کا جوش دل میں مٹتی نہ ہو سکتا تھا۔ تو اُس نے اُنھیں صرف الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہوتا۔ ایسی حالت میں ہم اُسے ایک نازک خیال شاعر کہتے اور سمجھتے کہ اُس پر مبدیہ فائنس کی طرف سے الہام نازل ہوتا ہے۔ وہ جس ماہ و نیک دیوانہ ہوا تھا اور جسکی دلربا صورت اُسے تماشگاہ عالم کے اسٹیج پر اظہار فی تہی کی چشم نرگسین۔ اُسکے رنار آتشین۔ اُسکے لب لعین۔ اُسکے درزندہ بلکہ اُسکے اُٹنے جو نبون کی غیر مذہب تعریف میں جاتا جس قدر مبالغہ کرنا مگر ہم اُسے اپنے نزدیک ایک نثار ہی خیال کرتے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اُسے ذرا صبر نہ ہو سکا۔ اُس نے ایک جاوید نگاہ کی صورت دیکھی اور اُسکا دیوانہ ہو گیا دیوانہ ہی نہیں ہوا بلکہ افسوس ظالم نے اتنی بڑی جرأت کی کہ خود فنگی کے ساتھ دوڑ کے اُسکے گلے سے لپٹ گیا۔ اُس نے تماشگاہ عالم کی باقی کیفیتوں سے آنکھ بند کر لی اور صرف ایک خفا شعار و فافرا موش کا ہو رہا۔ اُس نے شائستگی کو ہلا دیا۔ اُس نے صوفیوں کا ہم مذاق بنی کے اُنکے نام پر ویسا ہی دھبہ لگایا جیسا دھبہ ماروت و ماروت نے فرشتوں کے نام پر کبھی لگایا ہو گا۔ آہ! وہ بد معاش ہو گیا۔ اور دنیا اُسے ہر طرف سے لعنت ملا مت کر رہی ہے۔ مگر حقیقت میں دنیا کتنی بڑی مکار چیز ہے۔ واقعی اسکا ظاہر و باطن یکساں نہیں۔ دیکھو دنیا کی آبادی اس کھل کھلتے والے رند مشرب پر لعنت کر رہی ہے۔ مگر دل ہی دل سے ہر حسد ہی کرتی ہے۔ کہ ہاں وہ کیسے فرسے کی زندگی گزارا رہا ہے جس مہ جبین کے گلے سے وہ بے تکلفی کے ساتھ لپٹ گیا ہے اُس کے چاہنے والے سب تھے۔ فرق اتنا تھا کہ صوفی کہتے تھے کہ جس طرح برہنہ کی پیتلش کرتا ہے اُسی طرح تم ہی دور ہی سے اُسکی قدر کرو اور اُسے عشق کی آنکھوں سے دیکھو مگر پاس جانے کا نام نہ لو۔

الغرض تماشا گاہ عالم عجیب امتحان کا مقام ہے۔ جہاں ان تینوں مذکورہ فریقوں کا امتحان ہو گیا۔ لیکن کتنا بڑا اور کتنے برصے افسوس کی بات ہے کہ دنیا ہدایت کرتی ہے کہ ہر دھپسی کو دور سے دیکھو۔ لیکن جو قریب جاتا ہے اسکی حاسد بن جاتی ہے۔

## عراق عرب

ایک ہندوستانی رئیس نے عراق عرب کا سفر کیا۔ اور اُس صرح نہیں جس طرح اکثر لوگ انہیں بند کر کے ایسے مقدس مقامات کی زیارت سے شرف یاب ہوا کرتے ہیں بلکہ انہوں نے اُس سرزمین کی تمام باتوں کو نہایت غور سے دیکھا۔ ہم اس سفر نامہ کو وقتاً فوقتاً شائع کریں گے اور آخر میں اُن کے سفر کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کریں گے۔

### بصرہ سے نجف تک

راؤمہ فتح محمد بن فضل بن جرجہ میں بغداد کی خزان کی بہار میں لوٹ رہا تھا۔ اُس نامور دارالافتاء کو بنظر عبرت دیکھا اور بصرہ سے کربلا سے حاجی تک تمام سرزمین کو چشم بصیرت سے مشاہدہ کیا۔ ان آبائے دینیوں کو پھر ذکر کر ڈنگا۔ اسوقت ایک ویرانہ کی طرف ایک داستان اپنے سامعین کو سناتا چاہتا ہوں۔ شہر مدائن کے کھنڈ دیکھ کر سرت عسرت اور غصت کے خیال کچھ ایسے دماغ میں نقش ہو گئے کہ سب سے پہلے اُسی کے شگشگہ عالی بیاں کرنے کو ہی چاہتا ہے۔ سکندر اعظم کے ماتحت تاراج کے بعد خاندان ساسانی کی سلطنت تمام ایران میں قائم ہوئی اور دیشر بابک اسکا فاضل بانی تھا شیلاور ذوالکثافت بہرام گورنر شیروان عادل اور خسرو پرویز اسی نسل کے نامور فرما رواؤوں کے نام ہیں۔ اسی سلطنت کی حکومت سرزمین عرب عراق میں ایران خراسان۔ ماوراء النہر۔ افغانستان اور ہندوستان کے بعض اضلاع شامل تھے۔ خسرو پرویز کے اقبال بلندہ نے شام و مصر کو بھی اسی سلطنت کا جزو بنا لیا تھا۔ ان سلاطین نامدار کا تخت گاہ اور اس عظیم الشان سلطنت کا صدر شہر مدائن تھا۔ یہی موجب سلطنت تھی جو سلطنت روم کی ہمیشہ خوفاک حریف رہی۔ یہی وہ دارالسلطنت تھا جس میں مذکورہ بالا زرخیز مالک کا خراج آتا تھا۔ یہی وہ دربار تھا جس میں

بارہ قیام نہ دے۔ مگر انہی پیش دے۔ یہی وہ شہر ہے جسے شیردان عادل کے  
 نادر و داد کا ابرحمت سایہ گستر رہا۔ اور یہی وہ دارالسرور ہے جس کے بستان  
 عیش میں شیریں کے حسن کے جلوے خسرو کے عشق اور فرہاد کی ناسرا دیون کے  
 جیسے مدون رہے۔ چند بنیات سے اس شہر کی شان و عظمت امن و راحت  
 اور عمل و ریت کی حیرت انگیز تصویر ہماری تصور کی آنکھوں میں اب بھی بھر سکتی  
 ہے۔ یہ شہر بغداد سے حقوق ہی فاصلہ پر آباد تھا۔ اب اُس کے گھڑی بغداد  
 سے بارہ کوس قرب میں واقع ہیں۔ دجلہ کو ایک مل کے ذریعہ عبور کرنا پڑا ہے  
 اور ان میں جلیل القدر صحابیوں کے مزار واقع ہیں۔ اسٹیک فاقہ نوانی کے واسطے اکثر  
 مسافر بغداد سے مران جاتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ زیادہ مشہور حضرت سلمان فارسی  
 کا مزار ہے اس لیے وہ مقام فی الحال سلمان پاک کے نام سے مشہور ہے۔ ہم بغداد  
 میں حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر انوار کے جوار میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں  
 شمسہ کو مدائن کو دیکھنے چلے۔ کچھ اور بھی سیاح تھے اور ہمارے چھوٹے سے  
 قافلہ میں سب قریب چالیس آدمی تھے۔ متولی درگاہ کی عنایت سے دو گھوڑے  
 آٹھ گدھے اور دو خچر سواری کے واسطے آئے۔ گرایہ فی کس دور و بیہ قرار پایا  
 یہ بات قابل بیان ہے کہ خرمین اس دیار کی رسم کے موافق ساز و براق تو خوش  
 درست تھے۔ سر پر کٹنی اس میں تیشے درخشان۔ گلے میں ریشی گندے۔ گھوڑے  
 جو عربی بنیاد تھے ان پر لوہے کی تختہ ریشہ سامان چار جامہ سے بے ہوش تھے  
 مگر کچھ سعدی کا شعر یاد آیا اپنے باران سفر کو سنایا آنکھوں نے بھی لطف اٹھایا  
 مگر کچھ ہی عشت ہوئی یہ اسے اپنی تازی شدہ مجروح بریر پالان + طوق زرین ہمدرد  
 گران حرمی جیمہ + جب گھوڑوں اور گدھوں کی تقسیم ہوئی تو وہ اُسکو دبا جسکے  
 بالائق نظر آیا اور دن کو فریہ اندام گدھے۔ مجھے شکستہ حال دیکھا ایک گھوڑا  
 ویدیا۔ اگرچہ گدھوں کا ساز و سامان اور انکی تیز رفتاری دیکھ کر شک آیا۔ لیکن اپنے  
 وطن کے ایک قدیم رفیق نے دلہی کر دی۔ یعنی یہ خیال کر کے دل خوش کیا کہ  
 غوب ہو گا گدھے پر توار ہوئے۔ عرب کے گدھے بہت تیز گام ہوتے ہیں۔ بغداد  
 میں ایک گدھا ہے جسکا نام ابو جناح ہے (یعنی اڑنے والا) میں نے وہاں سنا

تاکہ ایک آگسٹ نہر ار روپہ میں اُسکو خرید کر ولایت بھیجا جاتا تھا۔ لیکن مالک نے منظور نہیں کیا۔ القصہ صبح کی غار چڑھ کر ہم نے اپنا سفر شروع کیا اگرچہ ترش ہو رہا تھا لیکن پہل پہل چھوڑ کر چھوٹا سفر بہت ہی خوشگوار تھا۔ راستہ دجلہ کے کنارے لنگ جاتا ہے۔ آب پاشی کی واسطے لب دجلہ جا بجائے کنوئیں موج دہن۔ جنگلی گہرائی ہمارے مالک کے کنوئیں سے زائد نہ تھی۔ ان کنوئیں میں نالیوں کے ذریعہ سے دجلہ سے پانی لاتے ہیں۔ اور کنوئیں کو سیراب کرتے ہیں۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک کنوئیں پر تین گھوڑے جدا جدا تین پرکھینچ رہے ہیں۔ چار اتنا ہی جڑا تھا جیسے ہندوستان کے ان مالک میں رائج ہیں اور سب کہ معمولہ دو بیل کھینچتے ہیں۔ گھوڑے ان سرنگ زنگ کی نہایت تیار اور نومند تھیں۔ دوسرے کنوئیں پر سیفہ جوڑی دیگی جسکو بیان کی فٹن اور ٹیم کے شوقین بہت رغبت سے پسند کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جو مصیبت چارہ کی غفلت کی غرض سے عملی العموم کا شکار ہوں گے حال اور پھر رہتی ہے وہ دہان نہیں ہے اس سے اُنکے مالکوں کی بھی خوشحالی کا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ حیدر اہل حرفہ آسودہ ہوتے ہیں اُسی قدر اپنے رُفے کے آلات کو درست و مست رکھتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بیل اُنچھین کا شکار ہون کے سونے نظر آتے ہیں جیسے مالک آسودگی سے بسر کرتے ہیں۔ کا شکار ہون کے کاروبار میں اُس ملک میں کہیں کہیں بیل ہی نظر آتے ہیں مگر بہت کم۔ راستہ میں ہکو کوئی گائون نہیں ملا۔ دور دور پر کچھ جھوٹے یا جیسے البتہ نظر آتے تھے۔ لیکن زراعت کی خوبی و عمدگی سے مفہوم ہوا تھا کہ ملک خوب آباد ہے۔ یہ موسم ٹھیک برسات کا تھا۔ اور فصل ربیع کی غمیری ہو رہی تھی۔ دہان کی زمین اس قسم کی ہے جسکو ہم دیہاتی بھارت کہتے ہیں۔ شاید یہ لفظ دلی اور لکھنؤ کے مرزا منشون کے کانوں پر گراں ہو۔ لیکن ایسے سخت خمر کے واسطے نازک اور لطیف لفظ کا ماننا شاید ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ مٹی عموماً چکنی ہے اور اس میں چسک زیادہ ہے۔ یہی وہ عراق کی مٹی ہے جسکی زرخیزی اور پیداوار کا ایک عالم میں شہرہ ہے۔ عصر اور طہر کے مابین ہم وادی مداین میں چھوٹے چار اکو سس کے فاصلہ سے طاق کسری کا سرنگ ایک ایوان نظر آنے لگا جو اس کس مپرسی کے عالم میں اپنے زمانہ اقبال کا خاتمہ کر رہا ہے۔ یہ عمارت دور سے

ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی کچی عمارت ہو اور غالباً بیرون نقی سکروں و ن بار بار  
کے پانی سے دھونے سے پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارا دلی عقیدہ تھوڑی دیر کے واسطے  
اس عبرت خیز منظر کی جانب سے بے توجہی کرتا ہے۔ اور ہم صحابہ کرام کے مزاروں  
پر فاتحہ پڑھنے کے واسطے بڑھتے ہیں۔

شہر مدائن میں تین جلیں القدر صحابیوں کے مزار ہیں۔ ایک حضرت سلمان  
فارسی کا۔ دوسرا حضرت خدیقہ بن الہمالی کا ہے۔ تیسرا حضرت عبداللہ انصاری۔ یہ  
تینوں مزار اُس زمانہ کی یادگار ہیں جب شجاعان عرب نے تیرہ صدی اُدبہ عجمین  
سلطنت ساسانیہ کا خاتمہ کر دیا تھا۔ جو سادگی اُس زمانہ کو اہل عرب کی اعلیٰ سلیقت  
تھی۔ وہ اُنکے مزاروں پر برس رہی ہے۔ حضرت سلمان فارسی کا مزار ایک  
نشاہ میدان میں واقع ہے۔ سلطان المعظم خلد اللہ ملکہ نے مسافروں کی سہولت  
کے واسطے بختہ کاروان سراے بنوادی ہے۔ چاروں طرف عثماتین بنی ہونی  
ہیں اور مسافر بے کرایہ وہاں رہتے ہیں۔ صدر دروازہ کے اوپر دونو پلوؤں  
پر بالا خانے بنے ہوئے ہیں۔ دروازہ کی چھت اُنکا صحن ہے۔ یہ بالا خانے عجب و نفیس  
موتقوین واقع ہیں۔ سائے دریا سے درجہ مو جین سے رہا ہے۔ اُس چشمہ شیرین کا  
سر سبز و شاداب وادی کو سون پہلا ہوا ہے۔ جس کے نظارہ سے روح کو فرحت  
اور نگاہ کو خنکی حاصل ہوتی ہے۔ اگر چہ اب دریا اس ویرانے سے میل بھر دوسم  
لیکن مدین کی اقبالیہ کی زمانہ میں بالفرد در وسط شہر میں ہو گا۔ شہر کے پرفضا  
باغوں کی سیرابی اور روح افزا مکانوں کی رونق اسکے انبار جاریہ کی بدولت  
ہو گی۔ مگر انوس اب نہ وہ باغ ہیں نہ وہ مکان۔ نہ وہ فضا ہے۔ نہ وہ رونق  
ایک شامے اور ہو کا عالم ہے۔ جو دل میں حسرت اور نگاہ میں عبرت پیدا کرتا ہے  
بدعہدی عمر میں کہ گل در دہ روز سر بر زد و غنچہ کرد و تشگفت و برخت  
کاروان سراے کے صدر دروازہ کے نیچے کی صحنچوں میں دود و کانین بنی  
ہیں۔ ضروری خوراک کا سامان میاں رہتا ہے۔ تھوڑوں کے واسطے اہل جدا  
نہا ہوا ہے۔ اسی احاطہ میں ایک قدیم مسجد ہے۔ اسکی پشت پر ایک حجرہ ہے  
جسکا دروازہ مسجد کی قبلہ رخ دیوار میں ہے۔ اس حجرہ میں حضرت سلمان



فارسی کی قبر ہے۔ یہ حجرہ مقفل بنا ہے۔ اور کسی کبھی کھولا جاتا ہے۔ ہم نے اول  
 طعام بعدہ کلام پر عمل کیا اور کھانا کھا کر حضرت حذیفہ بن ایمان اور حضرت  
 عبداللہ انصاری کے مزار کی زیارت کو چلے۔ اس سرائے میں آدھ میل کے  
 فاصلہ پر یہ مزار ہیں۔ ایک اعلاطہ میں دو حجرے ہیں اور ایک حجرے  
 میں یہ دو نوصحابہ بزرگ آسودہ ہیں۔ رضی اللہ عنہما وہاں سے فراغت پا کر ہم  
 مدائن کے کلفندرون کی طرف پھوٹے۔ ہر طرف خاک کے انباراوشی کے ڈھیر نظر آئے  
 ہیں۔ اب یہ سوائے عالم الغیب کے کون جانتا ہے کہ وہ کس کس عمارت کی تحت  
 خیز یا دگاریں ہیں۔ وہ طاق کسری جسکا عالم میں شہرہ ہے اور جس میں کسی روز  
 ساسان اول کا پر عظمت دربار ہوگا۔ آج ایک سنسان میدان میں کھڑا ہوا  
 اس کمرہ کے اور تو تمام حصے گر گئے صرف ایک کمرہ باقی ہے۔ یہ کمرہ مدور ہے  
 جسکا قطر پچاسی فیت اور ارتفاع ۱۶۰ فیت ہے۔ ہر طرف محراب دار بلند دروازے  
 ہیں۔ یہ عمارت اینٹ کی ہے اور اینٹ چار انگشت موٹی اور دو بالشت لانی ہے  
 ایک مہدم دیوار کے آثار کو ناپنا تو آٹھ قدم چوڑا تھا۔ اس کمرہ کی دیوار پر گچ یا  
 اور کوئی مصالحہ اب باقی نہیں ہے۔ بابا دیوار میں لکڑی کے کچھے مضبوطی کے  
 واسطے لگے ہیں جسکی صلیت بخوبی سمجھ میں نہیں آئی ہمارے ہندوستان میں جیسے طاق  
 وغیرہ خوبصورتی کے واسطے بنادیتے ہیں اس کمرہ میں کوئی چیز نہیں البتہ  
 بہت بلند سی پر ایک طرف الماری کے مثل کی ایک چیز ہے۔ چونکہ دار پانچین  
 اس لیے بنائے والے کی عرض روشنی یا ہوا کی اس سے متعلق نہوگی۔ کیا عجیب  
 ہے جو کوئی مذہبی معبود برکت کے واسطے اس میں رکھا جاتا ہو۔ ایک حصہ اسکی  
 دیوار کا بخط مستقیم مسلسل چکنا ہے۔ ہم جس واقف کار کو بعد اسے لائے تھے  
 اس نے بیان کیا کہ یہ تیل کا خزانہ ہے اس میں خوشبو دار تیل سمجھا جاتا تھا اور  
 وہ تیل لونٹے ذریعہ سے تقسیم ہو کر روشنی کی جیون تک خود بخود پہنچاتا۔ یہی وہ  
 عمارت ہے جو آنحضرت کی ولادت باسعادت کے وقت شق ہو گئی تھی جو جو صیبتش  
 درافواہ دنیا فساد الخ۔ ایک جگہ سر تا پا شق ہے ایک جگہ تقوڑی تقوڑی  
 شق ہے۔ چونکہ اس عمارت سے یہ مذہبی معجزہ متعلق ہے۔ لہذا حضرت سلطان

خلیفہ رسول اللہ کی جانب سے اس عمارت کی اینٹ نکالنے یا اور کوئی تعریف کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ مغرب کے وقت ہم وہاں سے لوٹے۔ بعد نماز مغرب حضرت سلمان فارسی کے فرار پیر انوار کا دروازہ کھلا۔ ہم فاسخ پڑنے لگے۔ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظم مدینہ انکار چاہتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے۔ اسکے بعد ہم چکر سو رہے۔ شب کو حفاظت کا سامان سلطان کی جانب سے تھا۔ کیونکہ اکثر جو کیدار کی آواز آتی تھی۔ نصف شب کو میری آنکھ کھلی و جد کے کنارے تازہ اور مرغابی وغیرہ نکلا۔ جاوڑوں کی آواز پیچ آ رہی تھی مجھ کو اس بار بعد میں اپنا وطن اور دوستوں کے ساتھ نکلا کیلنا یاد آیا۔ دل میں عجب اضطراب پیدا ہوا۔ سو رات ہم سنان ہامونہ دیکھ کر ہکو مجنون یاد آیا۔ ایسے مجنون دیکھ کر خیر یا رباتی صحبت باقی کھک دل کو تسلی دے لی۔ افوس کہ میں ہندوستان آئے ہی نہ پایا تا کہ بعض اُن جلسوں کے دوست خست میں آرام سے جاوڑے۔ رات کو مینہ خوب برسا صبح کو بچہ اور دانہ بولی سڑا۔ میں وہی عالم تھا۔ اور وہی سیر تھی۔ فرسکین اور اسکے سواروں کی مصیبت رات کے مینہ نے کچھ زیادہ کر دی تھی۔ ایک یہ تازی بات تھی کہ کثرت نری دود و ڈوہائی من کی وزن کی مچلیاں گدھوں پر لدی ہوئی جا بجا قطار در قطار چلی جا رہی تھیں۔ یہ مچلی چونکہ سمندر کی تھی اس لیے شیریں دیا کی مچلی زیادہ لذیذ ہوتی ہے۔

راقم۔ ایک زائر

## ناکامی

ہم سے اب بت ہی دل خراش پیر ہے۔ دیرت تو دوست خدا دشمن کو بھی نصیب کرے۔ اچھے ارادوں میں ناکام رہنے والوں کا نقشہ کھینچتے وقت ہم خود غوطہ میں آ جاتے ہیں کہ کیا لکھیں۔ اسے اسی ظالم ناکامی کی بدولت بہت ادا العزم بادشاہ نہراون حوصلہ مند جواہر داور بہادر بڑی حسرت اور ناامیدی کے ساتھ دنیا کے دلچسپ اور

پر فرما سیں گو خیر باد کمر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

بچ تو یہ ہے کہ جس آرزو نے بچپن کے زمانہ سے جوانی یا بڑاپے کی عمر تک دماغ کے ایسے خوف مقام میں نشوونما پائی ہو اور پھر تقدیر کے مقرر کیے ہوئے وقت پر اس میں ناکامی نصیب ہو کیسا ہی بے باور دل جلا آدمی کیوں نہ ہو ایک دفعہ تو آہ کی دل شکاف کرنے والی نفل کو کراہتی ہوئی زبان سے نکال کر بیٹھ ہی جا دیگا۔

ایک ہونہار طالب علم جسکو باپ کی فارع اہالی کی بدولت اور مان کے دین شفقت کے سایے میں زمانے کی تغیر پسند طبیعت سے آج تک ساقیہ ہی شین پڑا ہے اور جسکا سادا اور بھولا دل گردش ریل و سار سے بالکل واقف ہی نہیں ہے شب و روز اپنی درسی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف ہے۔ امتحان کا دن قریب ہونے سے آدھی آدھی رات نہ روزانہ معمولی پڑبائی کے علاوہ گھر پر مطالعہ میں گذر جاتی ہے۔ شوقین شاگرد کے سبب سے استاد بھی محنت اور دلا سے کے ساتھ اسکی محنت بڑا بڑا کر پڑھاتا ہے۔ مان۔ اپنے اکلوتے اور نو جوان بچے کی اس محنت اور جانفشانی کو اگرچہ بہت ہی قدر کے ساتھ دیکھتی ہے۔ مگر ساتھ ہی اسکی تکلیف کا خیال کر کے مادہ نہ مہر سے منع بھی کرنے لگتی اور کہتی ہے کہ بیٹا اتنی محنت نہیں کرنی چاہیے۔ دماغ پر بہت زور پڑتا ہے بیمار ہو جانے کا بھی خدا نخواستہ اندیشہ ہے۔ اسے ہے اپنی صورت تو دیکھ محنت سے کیا ذرا سا سنہ نکل آیا ہے۔ مگر اپنے شوق میں ڈوبا ہوا طالب علم اپنی مان کی ان باتوں کو صرف اور نہ مہر و الفت پر محمول کر کے خیال نہیں کرتا۔ آدھرباب اپنے ہونہار بیٹے کے شوق کا اندازہ کر کے آئندہ امید و ن کی فہرست کو دیکھتے دیکھتے نہال ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب عالم خیال میں وہ اپنے بیٹے کو ایک معزز عہدے پر دیکھتا ہے مگر غشی کے جامہ سے باہر ہونے لگتا ہے۔ اوہ سمجھ چکا ہے کہ انٹرنس میں امسال کامیاب ہونے پر تدریجاً میرا بیٹا ایم اے تک پہنچے گا۔ میری بڑی خوش قسمتی ہے اگر میرا بیٹا قوم کے لیے ایسا مفید کامی ثابت ہو اور بیشک اچھی تعلیم سے آدمی کے دل میں ایسے ہی خیالات پیدا ہو جاتی ہیں۔ علم سے بہتر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں اُن نازب دار والدین میں سرگزشت کیا جاوے

جو کثرت سے اپنی اولاد کو علم سے بے نصیب چھوڑ جاتے ہیں اور اپنی ہجو کے لیے مرنے کے بعد بھی ایک بہت بڑے اور مہذب گروہ کا مونہ کھلا جاتے ہیں۔ اگرچہ میں کام کا نام شادی رکھا گیا ہے وہ ایسی ہی خوشی کی چیز ہے کہ شادی کا ہی فائدہ اُسکے لیے مناسب تھا مگر مجھے اپنے ہونا بیٹے کی شادی میں ابھی عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے گو اُسکی مالکی زیادہ خوشی ہے۔ اسوقت شادی کرنا اسکی تعمیر کے لیے ضرور مضر ثابت ہوگا تاہم داری کے مختلف دھند سے اسکی تعلیم میں بہت مزاج ڈالینگ۔ خدا کی درگاہ میں بھی پنجگاہ نمانح کے بعد اپنے بیٹے کے کامیاب ہونے کی دعا مانگتا ہے۔

ادھر خود ہونا۔ طالب علم اپنے ہم عمر اجاب سے اکثر اوقات یہی ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دعا سے میرے فراموش نہ کرنا۔ دعو تو ن کے وعدے ہیں جو ہر روز نئے اقرار سے مستحکم کر دیے جاتے ہیں۔ جلسوں کا اقرار ہے یہ عمدہ دیمان ہو رہے ہیں کہ امتحان کا وقت بھی آگیا اور امتحان ہو بھی چکا تھے پر معلوم ہوا کہ ہمارے نو عمر طالب علم کو امتحان میں ناکامی ہوئی۔ آہ کچھ نہ بوجھو کہ بوطہ پیمان باب کے دلونپر کیا صدر لڈر گیا۔ بیجاری مان تو کچھ شام کے رہ گئی اور خاموشی کو خستہ تاک سکوت نے ہمیشہ کے لیے اُسکو خاموش کر دیا۔ بڑا باب بھی مایوسان صورت بنا کر چپ ہو گیا۔ اُسکا تو پوچھنا ہی کیا ہے جس نے پورے ایک سال کی محنت ایسی امید کے نذر کر دی تھی۔

جن لوگوں میں قومی ہمدردی اور قومی جوش بہت زیادہ ہوتا ہے پوری کوشش کے بعد جب اُنہیں اپنے ارادوں میں ناکامی ہوتی ہے تو ڈارین مار مار کر رونے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ بس ناکامی ہی جان کو پیٹھ کر دیتے ہیں اور چپ ہو جاتے ہیں۔ آہ! ایک بلاکش حرام نصیب فرقت دلدارین بستر غم پر چڑا ہوا رات دن کرتا ہے۔ چینی ایک دم چین نہیں دیتی۔ آنکھیں نم ہیں اور آنسوؤں کی مسلسل لڑیلان زاہدون کو بلور کے والون کی قبیح کا دھوکا دے رہی ہیں مایوس اور جھرت صورت سے حزن و ملال کے سب آثار ظاہر ہیں یار و غمخوار دلہی کر رہے ہیں مشتاقوں کی بے پروائی کا ذکر ہو رہا ہے۔ صبر اور استقلال کی خوبیاں بیان کی جا رہی ہیں۔

یہ کیوں؟ اس لیے کہ اُس نیم بسبل کا دل کسی طرح کچھ تو سنبھل جائے۔ مگر آہ ہمارے  
 دلدادہ دوست کے اُن عاشقوں میں نہیں جھکا قابو نہ لے گیا ہوا دل ایسی باتوں سے  
 سنبھل جاتا ہے بلکہ یہ باتیں اُسکے لیے چین دکھ اور بے تاب کر دیتی ہیں اور وہ دھیر  
 غم سے ڈھارین مار مار کر روئے لگتا ہے۔ کچھ مجھ میں نہرا روں نہ خم نہ لگے ہیں جو روز  
 آنسوؤں کے قطرے کیے ہوئے پانی سے دھو دیے جاتے ہیں۔ مگر جو حراش آہ اسوقت  
 پھر ہر اکردتی ہے۔ پیارہ فرقت دلدار میں چین ہوئے کے علاوہ ایک جگہ پھر بھی نہیں  
 سکتا۔ بیقرار کسی پہلو قرار ہی نہیں لینے دیتی۔ رات کی بے انتہا سیاہی اسکے لیے گور  
 کی تاریکی سے کم نہیں ہوتی۔ اور اسپر نہا کی شب ہجران کی تنہائی بیشک ام المراض  
 ہے۔ اس تنہائی کے عالم میں یہ ہر جذبہ جانتا ہے کہ اور کوئی نہیں تو اپنے بخت ہی کو  
 جگا کر کچھ دل بھلائے۔ مگر آہ! اس مبتلائے آلام کا بخت کچھ عجیب میٹھی نیند سوراہا ہے  
 کہ اٹھنا کسی طرح جانتا ہی۔ اس بلا کش کی قسمت میں نیند اور آرام تو کمان مار و نوشت  
 کو آنکھ چھیک جاتی ہے تو عالم خواب میں وہی پیاری اور دلربا صورت آنکھوں کے  
 آگے آ جاتی ہے جسکے فراق میں اسکی جان تک یرہن لگتی ہے۔ ہاے ناکامی اسکو یہاں  
 ہی اسکی آرزو پوری ہونے سے محروم رکھتی ہے۔ بس کیسی مہین اور شیریں آواز سے  
 یہ فقرہ اسکے کان میں بوختا ہے کہ دو تم ہمیں دل سے بھلا ہی بیٹھے، اور یہ چونک  
 اٹھتا ہے۔ اسوقت اسکے دل کا کچھ عجیب حال ہوتا ہے آہ خرابہ کے تیرون سے کچھ  
 چپلنی ہوا جاتا ہے۔ درد رہ رہ کر اٹھتا ہے جس سے اسکا دل بیٹھ بیٹھ جاتا ہے۔ اُردوؤں  
 اور متناؤں نے دلوں کو لا لگا ہوا لیا ہے۔ حسرت اور قنات کے ہجوم سے اور یہ آنکھیں بھٹا  
 بھٹا کے دیکھتا ہے مگر سواے رات کی تاریکی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اسوقت وہ اپنے  
 دل سے باتیں کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے ”بیشک مجھے بڑی غفلت ہوئی مجھے درد دلدار  
 پر ضرور حاضر ہونا چاہیے تھا۔ میرا عشق مجھے زیادہ وفا شعار ہے بیداری میں ممکن  
 نہوا تو خواب ہی میں دلکی بات کہہ گیا۔ اچھا تو اب میں کس بات کا منتظر ہوں؟ مجھے  
 ٹرکے ہی بیان سے جلد نیا چاہیے۔ ضرور جلد نیا چاہیے۔ کوئی کچھ کے مگر میں اب درد  
 دلدار ہی پر جا کر ٹھیر ڈنگا، یہ خیالات اسکے دلیں کچھ ایسے پک جاتے ہیں کہ صبح ہی  
 پوری بدنہا سنبھال چل کھڑا ہوتا ہے۔

دیکھنا چاہیے کہ صحبت ہمارا دلدادہ عاشق مزاج دوست اپنے معشوق کے ارشاد کے بجا لانے پر تیار ہو کر مل کھڑا ہوا ہے اس وقت دنیا کا دلربا متفرکس ہو گیا ہے۔ گرمی کا آئینہ موسم ہے! دن کے گیارہ بج چاہتے ہیں۔ آفتاب کی حدت اور تمازت تدریجاً ترقی پر ہوتی جاتی ہے۔ گرم ہوا کے میاں ملاپچے جو ہمارے سادہ دل عاشق مزاج مسافر کو جلانے میں رقیب کے طعنوں سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ کامیاب ثابت ہو رہے ہیں۔ اُن میں گرمی رہ رہ کر بڑھتی جاتی ہے۔ خاک اُڑ رہی ہے۔ اود بادِ موسم کے تحریک سے اگرچہ انکے چمکنے ہوئے چہرے کے ساتھ بہت برا سلوک کر رہے ہیں مگر اسکو ذرا ابھی پرواہ نہیں یہ اپنی دُہن کا متوالا شوق دیدارِ جانان میں برابر قدم بڑھاتا جا رہا ہے۔

آہ! اُسکا سفر فی الحال سفید رنگ ماند پڑنے لگا۔ اُسکا چمکتا ہوا چہرہ جو پھول کی طرح کھلا ہوا تھا اب بالکل مریخا چلا۔ اسپر ہی جو کوئی جھوٹا زیادہ گرم آجاتا ہے تو یہ ہنسنے لگتا ہے۔ ”الدری تیری گرم جوئی“۔

سارے دن کی دہوپ اور گرم ہوا اسکے مہر داشت کرنے والے دل نے بڑے شوق سے برداشت کی۔ اور قریب شام کے اس حرمان نصیب کی درد لدا رنگ رسانی ہو ہی گئی۔ اب یہ کوئے دلدار میں ہمہ تن شوق کھڑا ہوا۔ چارون طرفت آئینن بھلا بھلا کر دیکھ رہا ہے گویا نظارہ رنج جانان کے اشتیاق میں بالکل مست ہے۔

ماتنگ لہ اسی طرح ایک سات اور دن گذرتے جاتے ہیں۔ لہر افسوس اعلیٰ آرزو پوری نہ ہوئی تھی نہ ہوئی۔ آخر ناچار ہو کر اس نے پلٹنے کا اودہ کیا مگر نہ تو دلیں جرات تھی اور نہ ہمت اور نہ باتوں میں قوت۔ رفتار ہی باقی تھی جب کچھ بن پڑا تو آہ کر کے بیٹھ گیا۔ مگر بیتاب دل پلٹنے کب دیتا تھا۔ اُسٹھا اور جون قون کر کے دوچار قدم پلا ہو گا کہ کسی اس سے دریافت کیا دیکھیے حضرت آپ کس طرح آئے تھے اور کیوں واپس چلے؟

اسے سوال کرنے والے ظالم اور تا خدا ترس بڑا ظلم کیا۔ افسوس تو نے اسکی موجود حالت پر بھی غور کیا۔ اُسکا حسرت مند اور اُترا ہوا چہرہ اُسکی شدت گریہ سے سرخ اور جھکی آئینن۔ اُسکی خمیدہ کمر جھکو وہ دونوں باتوں سے مضبوط پکڑے ہوئے ہے اُسکے پیرائے ہوئے ہونٹ۔ اُسکے پریشان بال۔ یہ ساری چیزیں اُسکے دل کی لہر

کو انہی طرح ظاہر کر رہی تھیں۔ اس نکتہ دل مسافر نے اس سوال کے جواب میں ایک آہ کی اور قاری کے جاوید نگار شاعر کا یہ مطلع پڑکھ کر ہمیشہ کے لیے غامض ہو گیا۔

اردو دوست گویم بچہ عنوان رفتم  
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم

راتسم ۱ - ۶ - انفرادی آباد

## ”امیر اللغات“

”امیر اللغات“ اردو زبان کے نئے لغت کا بھلا حصہ راجپور میں تیار ہوا ہے اس کے مصنف منشی امیر احمد صاحب امیر لکنؤمی استاد نواب خلدن اشپان ہیں۔ یہ لغت آٹھ جلدوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہو گا۔ اس کی پہلی جلد میں (جس کا یہ اشتہار ہے) تخمیناً تین ہزار لغات صرف اللہ مددہ کے ہیں۔

امیر اللغات میں لغات - اشتقاق - ترکیبات - حقیقی اور مجازی معنی - اصطلاحات - مرادفات - تذکرہ - تائید - محاورات - مثلین - علمی - قانونی - سندھ - اور رسمی اصطلاحات - دفتروں اور پیشہ ورانہ محاورے - مردوں اور عورتوں اور عوام و خواص کی بات چیت کا فرق - معانی - تشبیہات - مقولے - کہیل وغیرہ وغیرہ موجود ہیں۔ کاغذ عمدہ چھپائی نفیس تقطیع ۲۲ صفحات ۳۲ صفحے قیمت منہرہ دلائی کاغذ پر ۱۰ روپے سیرامپور کاغذ پر محض ۱۵ روپے خریدار رشایقین راجپور میں درخواستیں بھیجیں۔

المشہر محمد ممتاز علی آہ سکر ٹری دفتر امیر اللغات ریاست راجپور۔ روپے ۱۵

## سلطان محمد ثانی اور قسطنطنیہ کی فتح

ترکان آل عثمان کی سلطنت کو قائم ہوئے چھ سو برس ہو گئے۔ اور اسی پہلے بانی خاندان کی نسل شجاع تک ۲۵ تاجدار سریر سلطنت عثمانیہ پر جلوہ افروز ہوئے۔ فرانسز والی کرپکے۔ ایسی مولانا خانا کی سلطنت کی مثال یورپ کے کسی اور ملک کی تاریخ میں نہیں موجود ہے۔ اور شاید کسی خاندان کو ایسے اور اتنے ایک جلیل القدر اور بیع اشراف حکمران اور ان کے بڑے سید اگر تاجر گز نہ نصیب ہوئے ہوں گے۔ جیسے بآردر نامور اور بلند عرصہ فرامرد اس خاندان عثمان نے جو دھوین بندر دھوین اور سولہویں صدیوں میں پیدا کیے ہیں۔ اور خان فاتح کایا در جاش خاریون کی حبیب فوج کا بانی۔ مراد اول فاتح کسودا۔ بایزید اول فاتح نکولوس غمرا اول اس شکستہ سلطنت کا سنبھالنے والا جسے تیمور کے پسواشا کا نہیں ہاتھ زیر و بر کر چکا تھا اور اس کا سنبھل جانا بالکل ایک قرینی کوشش کہا جاسکتا ہے۔ مراد دوم ویشیا کے اس سفید بالے جان ہنڈس اور سکندر بیگ کا مقابلہ محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ تسلیم اول کروستان سیریا اور مصر کا زیر کرنے والا۔ اور سلیمان عالی شان موکیز کے میدان جنگ کا ہیرو اور ویانا کا محاصرہ کرنے والا ایسے آٹھ با عظمت و جبروت تاجدار کبھی کسی ملک و قوم میں یکے بعد دیگرے تخت نشین نہیں ہوئے۔ مگر ان سب میں جو نام سب سے زیادہ اس فخر کا مستحق ہے کہ زمانہ ہمیشہ اس کے کارناموں کو یاد رکھے اور ہم اس کے نام کی نہایت ہی عظمت و قدر کریں وہ اسی فتح مند سلطان غازی محمد ثانی کا نام ہے۔ جو ہمارے اس معنون کا ہیرو ہے۔ اور جسکو مورخین نے جوجان نزاری ترکی اور عربی مطلقاً حون من نیک چری کلامے میں۔ ترکی من نیک کے معنی لئے کہ میں اور چری سپاہی کو کہتے ہیں۔



فاتح کا پناہ قب و اسے۔ سلطان محمد ثانی بہت سی لڑائیاں لڑا۔ اس نے بہت سے شہر فتح کیے۔  
 بہتوں کا محاصرہ کیا۔ مگر جس محاصرہ اور فتح سے اس سلطان کے نام کے ساتھ فاتح کا مبارک لقب  
 لگایا جاتا ہے وہ قسطنطنیہ کی فتح ہے۔ ہوشیار مین حاصل ہوئی۔

قسطنطنیہ کی فتح کا خیال اور اس کی آرزو مسلمانوں کے دل میں مدت سے تھی اس آرزو کا اکثر  
 اوقات ظہور ہوا۔ مگر موماہر تاجدار اسلام کے دل ہی میں رہی۔ اس لئے اسکے بر لائن کے لیے  
 خدا نے سلطان محمد ثانی ہی کے پرزور و بازو اور اسکے آبدار اسلحہ کو مخصوص کیا تھا۔  
 پہلے پل حیرت نبوی کے چھالیسویں سال میں جو خلیفہ معاویہ بن ابی سفیان کی خدمت کا زمانہ تھی ہم مسلمانوں کو قسطنطنیہ  
 کی دیواروں کی خبر جس دار السلطنت کا محاصرہ کیے ہوئے تھے ہن سفیان دکنہ مور بادشاہ کا علم پڑ رہا ہے۔

خود وراثت خلافت اسلامی یزید بن معاویہ اس فوج کے ہمراہ تھے۔ بادشاہان رسالت حضرت  
 سید الشہداء امام حسین علیہ السلام اپنے جمال جہان آرا سے اس محاصرہ کرنے والی فوج کو رونق  
 بخش رہے ہیں۔ جناب رسالت پناہ صلعم کے اکثر صحبت یافتہ اور بہت سی ریا و کاران مدد و احد  
 اس جنگ میں شریک ہوئے کے لیے بغرض ثواب آئے ہیں اس لیے کہ رسول مقبول صلعم کی زبان  
 فیض ترجمان سے سن چکے ہیں اور اسی پر ایمان رکھتے ہیں کہ دوسری امت کی جو پہلی فوج قیصر کے  
 شر پر فوج کشی کرے گی اسکے لوگ مغفور ہیں، صدقت یا رسول اللہ۔ فوج کشی کرنے کا نطفہ  
 بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے دشمنان ہایان بارہ بادشاہان و دوسو شہر فتح کیے۔ والد اعلم بالعواہب۔  
 ۲۔ مطابق ۱۳۵۲ھ ۶۔

۳۔ گبن نے چھالیسویں سال لکھا ہے مسلمان مورخین ۱۳۵۲ھ ہجری بتاتے ہیں۔ مسر گلین نے ۱۳۵۲ھ  
 یا ۱۳۵۲ھ بتایا ہے۔

۴۔ یزید کے اس محاصرہ میں موجود ہونے میں شک نہیں بعض مسلمان مورخین لکھتے ہیں کہ یزید ہی پہلا رہا اور بعض عقیدت  
 حوں کو بتاتے ہیں ہم نے گبن کا تبع کیا ہے۔

۵۔ منجل جن کے عبد اللہ بن عباس۔ عبد اللہ بن عمر۔ عبد اللہ بن زبیر۔ ابویوب انصاری وغیرہ  
 رضی اللہ عنہم تھے۔

۶۔ بخاری۔ مسلم اور امام احمد بن حنبل تمام حرام نبی لمان۔ رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ رسول اللہ  
 صلعم نے فرمایا: اول جيش من امتي يعزرون مدية قیصر مغفور لهم، یعنی ان کے گناہ اللہ جل شانہ  
 نے معاف کر دیے۔

فرمایا اس لیے کہ معلوم تھا کہ یہی فوج فتح نہ کر سکے گی۔ یہ فتح تو کسی اور ہی کی قسمت میں  
تھی۔ اسی میں سے پیدا ہونے لگا ابھی بہت زمانہ باقی تھا۔ آخر خلیفہ معاویہ نے عاجز آکر مشیر  
سلج رلی۔

اس مسئلے بعد خلافت میں خلیفہ ولید کے بھائی سلیمان نے اپنے عند خلافت میں قسطنطینیہ کی  
فتح کے لیے ایک جہاز فوج روانہ کی۔ کامیابی میں دیر ہوئی تو خلیفہ نے بغیر کسی کوشش  
کا سامان کر دیا۔ مگر اس سفر کے شروع ہونے کے پہلے ہی پیغام اجل آ گیا اور یہ جہاز نہ صرف  
کی تباہی ہوئی بلکہ اسے ہذا آئے ملک آخرت کا سفر کرنا پڑا۔ اسکا جانشین عمر بن عبد العزیز  
جو ایذا نیکو کاری نہ ہوا تھا اور نیز بلند و مالکی کی وجہ سے عمر ثانی کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا  
مفسدہ۔ سلطان اکبر شاہ میں عند خلافت پر عبور فرما رہا تھا۔ چنانچہ موسم ناموافق تھا لہذا  
عدلیہ پر خلیفہ قسطنطینیہ میں فوراً کمک نہج سکا۔ لیکن بعد اسے موسم بیمار میں ایک  
بڑا بحری فوج بھیج گئی۔ لیکن ابھی فتح قسطنطینیہ کا وقت نہیں آیا تھا۔ اور مشیت ابرہی میں  
کے پاس۔ عرق یہ فوج ہی بے نیل مراد واپس آئی مسلمانوں کی اس ناکامی پر ذاکر فریقین پہلے نہیں مانتے  
وہ ابھی بے اندازہ مسرت کے خوش نہ تھے۔ یہاں تک کہ ہاتھ شتر قسطنطینیہ کا شکست کمانا دینا کی تاریخ میں ایک بہت  
بڑا واقعہ ہے۔ اس لیے کہ اگر لوہ پ کی مشرقی قوموں کی ترقی سے پہلے مسلمانوں نے قسطنطینیہ  
کو لے لیا ہوتا تو ظاہر ہے کہ دین عیسوی اور یورپین سولائزش دونوں دنیا سے اٹھ جاتے۔  
اور اکثر فری میں چاہیں خوش ہوں لیکن مسلمانوں کا یہی خیال ہے کہ ان ناکامیوں کی بدولت  
وہ دین الہی کی برکتوں سے محروم رہے۔ یہ یہ ثانی کے جانشین ہشام نے بھی قسطنطینیہ کی طرف  
قدم نہ بڑھایا تھا۔ لیکن نبی امیہ کے دور کی ان سب فوج کشیوں میں محض اسی وجہ سے بالآخر  
ناکامی ہوئی آئی کہ خدا نے یہ فخر کسی اور ہی کے لیے محفوظ رکھا تھا۔ خلفائے عباسیہ نے بھی  
قسطنطینیہ کے لینے کی کوشش کی تھی۔ مہدی نے، شہید ۶ میں ایک بہت بڑی فوج ہاتھی  
بارون ارشد جو ہنوز محض ایک شاہی خاندان کا مہر تھا قسطنطینیہ پر روانہ کی تھی۔ اس مرتبہ  
ہر ڈال میں کامیابی ہوئی اور پھلی ڈال جو خاص شہر قسطنطینیہ کے واسطے تھی اس میں  
بھی ڈال کا فیصلہ رشید ہی کی موافقت میں ہوا تھا۔ مگر اس کی جملی نے شہر پر قبضہ نہ کرنے  
دیا۔ اور یوں یہ ناموری رشید کے قوی ہاتھ سے ہی بچ کے نجات پائی۔ باقی رہی۔  
ارٹ لاٹیس آف ہنری جیٹر ۲۔

ایرین لیوچرام کی جوروں نے خوشامد درآمد کر کے باجگزاری کا وعدہ کیا۔ اور یوں عہدہ دار  
سے اُس فتح مند غلغلہ کی نہربانی و شفقت حاصل کر کے اپنے شہر کو بچا لیا۔

لکھنؤ میں جو ہارون الرشید کا زمانہ ہے اگر شہنشاہ نے فوراً صلح کی درخواست نہ کر دی  
ہوتی تو اس مرتبہ یقیناً قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو ہی گیا تھا۔

ترکوں کو اسی وقت سے فتح قسطنطنیہ کا خیال تاجب پہلے تاجدار عثمان خان بانی ملت ترک  
نے اپنے اس نوجوانی کے عجیب و غریب اور معجزہ ناخواب میں اسکے قیام ہوئے کی بشارت پائی

تھی۔ بایزید اولیٰ دم اس نے اپنے پر جوش ارادوں کے ساتھ اس کا محاصرہ کیا تھا۔ موسے  
نے اسکو سختی سے دیر اتھا۔ مراد ثانی نے نہایت ہی سہر و استقلال سے اسکی فتح کرنے کی

کوشش کی تھی۔ کل گرد و نواح کے اضلاع پر ترک قابض ہو چکے تھے صرف شہر فتح  
کرنے کو بچ گیا تھا مگر یہ شہر ایسا دولت مند۔ ایسا خوشنما و خوب صورت اور اسدر جہ طاقت و

ایسے عمدہ موقع پر واقع تھا کہ ترکوں نے اسکی فتح کو اپنی ترقیوں کا سب سے اعلیٰ درجہ  
اتیہتم کر لیا تھا۔ آخر وہ مسعودہ وقت آگیا اور خدا نے ترکوں کی لکھ ساری دنیا سے اسلام

کی یہ تمنا سلطان محمد ثانی کے ہاتھوں پوری کر دی۔ سلطان محمد ثانی مراد دوم کا بیٹا بایزید اول  
دولت دم کا پرتوتا تھا اور عثمان خان بانی سلطنت عثمانیہ سے ساتویں پشت میں پیدا ہوا تھا

سلطان مراد ثانی نے بادشاہی کے رنج و راحت کا مزہ بخوبی چکھ کر غلغلہ میں اُس سے  
کنارہ کشتی کرنا چاہی۔ اس کی یہ خواہش بڑے بیٹے کے قبل از وقت زجر جانے کے صدات نے

ادھر ہی بڑا دی۔ اُس نے افسردہ دلی کے ساتھ اپنے حریف ہینڈس سے دس برس  
کے لیے صلح کر لی اور دوسرے جوان تخت بیٹے محمد کے ہاتھ میں جس کا سن نہوڑ چودہ ہی

برس کا تھا زمام سلطنت سونپ کے خود گوشہ نشینی اور غفلت گزینی اختیار کر لی۔  
محمد ابی بہت ہی کم سن تھا۔ عیسائیوں کو یہ موقع نہایت قیمتی معلوم ہوا۔ فوراً غدر برپا ہوا

ہو گئے اور کارڈ نیل جولین کے درغلانے سے پورے ایک ہینہ تک بھی صلح نامہ کے  
پابند نہ رہے۔ اپنے تمام قول و قسم توڑ کر جھگڑے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک فوری جوش میں

بڑھ کر انہوں نے بت سے مضبوط مقامات پر قبضہ کر لیا۔ ترکی فوج کو جان پایا یہ ریلغ تیرغ کیا  
۴۰ شہر اور نہ یعنی اڈریانوپل کو اُس پر فخر کرنے کی عزت حاصل ہوئی جس کے سوا میں غلغلہ اعین اسکا

ایسا نامور اور جوان بہت شانہ راہ متولد ہوا۔

جیسا کہ درج ذیل ہے: پانچ سو سال کے بعد کہ سلطان مراد ایک سو تیس سو سال کی طرح اپنی  
 عمر گزیرا کی زندگی سے جو کہ قصہ کی انگریزوں نے لکھا اور چالیس سو سال فرج نے لکھے  
 لیکن کیا ہوا حریف یہ چھ سو سال۔ انگریزوں نے فرجوں میں مقابلہ ہوا۔ مسلمانوں  
 نے وہ عیسائیوں کا مقابلہ کیا۔ ایک نیرہ مین باندہ کر لیا گیا کہ اسے دیکھ کر شہر یمن اور پیر  
 ربیعان میں ہر ذوال کے واسطے کے ساتھ شکست کھائیں۔ اس ادا کی نسبت سرحد و  
 رومی لکھتے ہیں کہ وہ دونوں غصہ سے بوقت مقابلہ کرنے کو نہیں ایک ایسی دشمنی بن گئی کہ  
 عید باجوں کا نام پر ایشان خاطر ہو گیا۔ بادشاہ کا ایک جھوٹا اس نام سے چلا کہ سو سال  
 رہا مگر ہی اس کے اور سب جھوٹے ہیں پر اس سے، جس نے خوب خوب دوا و حمایت  
 دی و تربت تاکہ ترکہ کے قدم نہ کر کہ جب سے اکھڑ جائیں کہ کیا ایک ایک جان شادی  
 و شہادت جان بکریل کے شاہ انگریز کا سر کاٹ لیا۔ اہل شہر کی اس عہد نامہ و اسے نہرو  
 سے بادشاہ کا سر دیکھ کر ہلکا ہلکا ہوئے ہندوؤں سے لاکھ لاکھ کر شمش کی مگر  
 پھر اسے سب نبی اور آخر خود ہی ہلکا ہو گیا۔ یہ نیاں فوج حاصل کر کے سلطان مراد  
 اسے اسی ملک میں گوتہ یافت میں جا بیٹھا۔ لیکن جانشین بیاباب ہی کہ مرہا جان تیار  
 کی تفاوت نے مانع البالی کی بند سے اسے دوبارہ چونکا یا۔ اور اس مرتبہ اس نے کچھ  
 نہ قدر جھلا کے گوشہ نشینی چھوڑی تھی کہ بہر جتنے جی اس اہمیان کی عزت نشینی سے لطف  
 نہ تھا سکا۔ آخر فرشتہ اہل پیام موت لایا اور فرشتہ میں رہ اور عالم بالا ہوا۔ لیکن چلتے چلتے  
 اس کے یلہ میں ہندوؤں کو ایک اور سخت شکست دیتا گیا۔ سلطان مراد کے انتقال کے  
 وقت محمد ثانی کو اکیسواں سال تھا جب کے اعتبار سے کہنا چاہیے کہ ہوز بچپن کے گوار سے  
 ہی میں تھا۔

الفرض و فردوسی کے ہلکا کے مبارک دن وہ فاتح اعظم تخت نشین ہوا۔ یورپ اور ایشا کے  
 ۱۔ جان ہندوؤں کے ساتھ بادشاہ ہنگری کا والد عوام تھا۔ غلامہ خزل۔ فوس غیب۔ افسر ہباد  
 پر ابی ہندوؤں سے زیادہ ترکوں کے مقابلہ میں عسائیوں کو کبھی نصیب نہیں ہوا۔ اس نے  
 اطالیہ کی مڑائیوں میں ناموری حاصل کی تھی۔ اسکے بعد اپنے ملک میں واپس آ کر اپنی عمر  
 کے باقی بیس برس ترکوں کی مخالفت میں گزار دیے  
 ۲۔ گبن نے اکیسواں سال لکھا ہے کہ مسلمان مورخین اکیسواں بتاتے ہیں۔

میں مہاراج بادشاہ اور عقد مودت مفہوم کرنے کے لیے حاضر دربار ہوئے۔ سلطان محمد  
نسب سے بلطغت و مدار پیش آیا۔ اور سب کو صلح و آشتی کے بار و مین اطمینان دلایا۔  
شہنشاہ یونان کے بھی اب جان میں جان آئی اس لیے کہ سلطان نے اسکے عہد نامہ کو تسلیم  
کر لیا اور تین لاکھ پندرہ سو سالانہ اس عثمانی شہزادہ کی پیشین گوئی کے بابت مقرر کر دیے جو فوج سلطان  
کی خواہش سے قسطنطنیہ میں نظر بند کیا گیا تھا۔ با این ہمہ اظہار دوستی اس میں کوئی شک  
نہیں کہ سلطان محمد ثانی ڈرنے کی چیز تھا۔ اویسی سچی سلاطین کے دل میں اسکی طرف سے ہر  
کچھ کا تھا۔ نوجوان سلطان تخت پر قدم رکھتے ہی گویا بالکل بہا گیا۔ اپنی جوانی کے جذبات اور  
خواہشیں دیکھ کر اس نے اپنے باپ کے عہد کے تمام اوکل عیش و عشرت کے سامان کو بھی  
تخفیف میں ڈال دیا۔ اور جو کچھ روپیہ تو غیر میں بچا وہ فوج کی آسٹگی اور سامان جناب  
مہیا کرنے میں صرف کیا۔ شہزادہ کو دیا۔ تخت نشینی کے چلے ہی سال وہ فوج اپنے ہمراہ  
لے کر تھانیا شیشائی صوبجات کے دورے کو روانہ ہوا۔ اور جاتے ہی والی فریاد پھیل کر دیا۔  
شاہ قرمان نے سم کے صلح کر لی اور اس فہمندانہ صلح کو اپنی سلطنت کا پیلا زیور بنا کے  
سلطان محمد انبیست قمر خلافت میں ۱۰ اپس آیا۔ اب اس کا رروائی کے بعد اسکے دل میں  
فتح قسطنطنیہ کے سوا اور کوئی حوصلہ نہ تھا۔ اس مہم کے لیے وہ سامان جنگ فراہم کرنے  
لگا۔ اس نے امیر یانوفیل میں اسلحہ سازی کا ایک جدید کارخانہ قائم کیا اور اس میں نوین  
وغیرہ آلات جنگ ڈھننے لگے۔

یونان کی شہنشاہی جس کا مستقر قسطنطنیہ تھا وہ اپنے حکمرانوں ہی کی بے عنور نمون سے تباہ و  
برباد ہوئی اور وہ روز سیاح خود اپنے ہاتھوں سے دیکھنا نصیب ہو جس پر عیسائی مورخوں  
کے آنسو باتے ہیں اور ہمیشہ بانینگے۔ عیسائیوں نے خود غفلت کی بازید کو انگریزوں کی لڑائی  
میں جب تیمور کے سامنے شکست ہوئی تھی اس وقت ان کو کافی موقع ملتا تھا۔ اس وقت عثمانی  
ترکوں کی سلطنت بظاہر اسباب مرگئی تھی ایسا موقع انھوں نے جانے دیا اور ترکوں کو  
اس ضعف سے کوئی نفع نہ اٹھا سکے۔ اگر کہیں اس وقت عیسائی سلطنتیں باہم ملی کے کوشش  
کر تیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان پہر کہی یورپ میں قدم نہ رکھ سکتے۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی  
منظور تھا اس کی مشیت میں تھا کہ عثمانی نسل قسطنطنیہ کی مالک ہوگی۔ اور کسی زمانہ میں وہاں کا  
محمد کا بانی اور خان۔

محاصرہ کر لے گی۔ الفرض وہ نازک زمانہ بھر دو غلی گذر گیا۔ ترک پھر سنبھل گئے اور  
 ایسے سنبھلے کیا اور پہلے سے زیادہ عین تو پہلے کے برابر قوت انہوں نے بے شک۔ یہ  
 کرنا۔ مسیحی و دل کی یہ تعلیم ایک طرف طرفہ یہ کہ مراد دم کی تخت نشینی کے وقت  
 انہوں نے یہ طاقت کی کہ شاہراہ مطلق کو تخت عثمانی کا امیدوار بنا سکے پیش کیا۔ اور اس وقت  
 اسے تباہ نہیں ہو سکتی تھی تو عمل یہ سچ کہ مراد نے اسی زمانہ میں قسطنطنیہ کا حصہ  
 دیا ہوتا۔ مگر یہ نہ ہوتا۔ بلکہ وہ زمانہ کہ ابی بکر زمانہ آتی تھا قسطنطنیس میں اس کے سب سے  
 دم تو میرے ان سلطنت کی زندگی اور باقی تھی۔ ان میں اس میں ترک روز افزوں ترقی کرتے جاتے  
 تھے۔ ان کی فوجی قوت بہت بڑھ گئی تھی۔ مگر قسطنطنیہ پہلو لوگس کو جو اپنے تہمتا ہی  
 کا اخیر شہنشاہ تھا یہ خبر ہی دینی کہ اس کی تباہی کے لیے کیا سامان ہو رہا ہے۔ شہنشاہ  
 انہوں کے واسطے وہ باطل بول گیا۔ اور اسی پہلی طاقت میں سلطنت کو اس نے بھر ستلا  
 کر دیا۔ وہ اپنے نزدیک ایک سلطان محمد ثانی کو وہی لوگ سمجھے ہوئے تاجو ساٹھاں مراد کی  
 عزت نشینی کے زمانہ میں ترکوں کی وسیع سلطنت کا انتظام نہ سنبھال سکتا تھا۔ اور یہ معلوم  
 ہی نہ تھا کہ ان جیسے سات برس کی مدت سے اس میں کیا تغیرات پیدا کر دیے تھے۔ اس کے  
 نو وہی سانپ کے منہ میں آگ لگی دی اور یہ مجنونانہ حرکت بنے سوچے سمجھے کر مینا کہ سلطان محمد کو  
 عثمانی شاہراہ کی نشن بڑھانے پر مجبور کرنے لگا۔ اور ایک قوت در سلطان کے مقابلہ میں  
 آپ ان یورپ سے اس درخواست میں سختی دہانے لگے کہ گویا اپنی رکھوالی ہوئی امانت  
 طلب کرتے تھے سلطان محمد نے جلا کے قسطنطنیہ نشن منظور کی تھی وہ ہی موقوف کر دی۔ سلطان محمد  
 اس کا رد والی پر شہنشاہ قسطنطنیہ نے فیش کھاس کے دھکی دی کہ میں پھر مجبور ہو کے شاہراہ  
 سلطان کو اپنے بائیل میں تخت نشین کر دوں گا اس طاقت سے پناہ مانگنا چاہیے خدا ہی خیر  
 کرے۔ قسطنطنیہ نے خود اپنے ہاتھ سے سوتے ہوئے رتبہ کو جگا رہا ہے۔ دیکھیے کیا انجام

ہو رہا ہے

محمد ثانی تو کوئی ایسا موقع خود ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ آگ ہو گیا۔ اور فوج لیکر بیوقوف اور  
 شامت زدہ شہنشاہ کے سر پر باوجود وہاں سلطان نے اپنے عثمانی اصول جنگ کے مطابق  
 قسطنطنیہ کے باہر ایک قلعہ تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ اور گویا یہی امر فتح کا مقدمہ تھا۔ ایک ہزار  
 ہزار بائیل کا بیٹا تھا۔

سوار اور دو ہزار مزدور اس کام پر مقرر ہوئے۔ عیسائی کیمون۔ کہ پتھر اور سٹون اس قلعہ کی فیصل کے کام میں لائے گئے جس کا آثار ہر چار طرف دس دس گز رہا گیا تھا۔ یہ قلعہ نہایت پیر کی کے ساتھ مہربن تین مہینہ میں بنایا گیا ہو گیا۔ تو بین چڑھا دی گئیں۔ اور آتش فشاں کے آلات کافی طور پر مہیا کر دیے گئے۔ اصل برج پر ایک بہت بڑی توپ لگائی گئی جس کے ذریعہ سے آٹھ فومن وزن کے پتھر کے گولے لمبھوت پہنچے جاسکتے تھے۔ اس کے علاوہ سلطان نے چار سو سپاہی اس قلعہ میں اس غرض سے مہین کیے کہ جو ہزار دوسرے گز سے اس سے راہ داری کا محصول وصول کریں۔ یہ قلعہ آج بھی اسی شان و شوکت و عظمت و ہیبت سے باسفرس کے کنارہ پر کھڑا ہے۔ اور وہ دنیا ہمارے کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مقابل میں ایسی ہی ساحل پر جو قلعہ ہے اور جو اناطولیہ ہمارے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ محمد ثانی کے دادا محمد اول کا تعمیر کرایا ہوا ہے۔

الغرض اس تدبیر سے سلطان محمد نے مدینہ کو ایسا گہرا کیا کہ اس کے اختیار میں تھا جب چاہتا رہتا۔ وہ دیتا۔ پھر کسی کو گزرنے کی مجال نہ تھی۔ اور ہر سودے گزرنے قسطنطنیہ اور بحر روم میں کوئی نہ جاسکتا۔

نام یورپ میں شہر روم کے بعد قسطنطنیہ نہایت ہی دلچسپ شہر ہے۔ یہ شہر دنیا کے بہت بڑے بڑے تاریخی واقعات کا اور ایسے واقعات جو انسانی قسمتوں کو پلٹ دینے والے تھے دنگل اور مہر کہ گاہ رہا ہے بائزنتین کا زیادہ حصہ جب کو ایک میگارا کے ڈورک کا لونی نے قبل مسیح ۳۳۰ء میں قائم کیا تھا موجودہ آبادی شہر میں داخل ہے۔ ڈرائس اسٹیس کے زمانہ میں ایرانیوں نے اسکو فتح کر لیا تھا۔ لیکن پلاٹینا کی لڑائی کے بعد وہ پیرینیونیون کے قبضہ میں آگیا جنہوں نے اسکو ملے جلے اٹھینین اور لیسینڈرومین کا لونی سے آباد کیا۔ تغیرات زمانہ کی بہت کچھ مار کھانے کے بعد وہ شہر مقدونیہ کے فیلوس کا مرکز ہوا۔ جس نے اس پر اپنی فوج سے حملہ کیا۔ فیلوس کے مقدونیہ والے سپاہی ایک مرتبہ اندھیری رات کو اسی شہر کے قریب آ رہے تھے کہ ناگهان شمال کی جانب ایک روشنی نمودار ہوئی اور باشندگان شہر اس خطرہ سے مطلع ہو گئے۔ یہ سرازر سی ڈایانہ دیوی کا ایک بجزہ بھی گئی اور اہل شہر نے نہایت مسرت کے ساتھ اظہار شکر یہ سکے طور پر اس دیوی کے نام کا ایک مندر اس میں تعمیر کیا۔ اور اسی وقت سے

ہال کو اپنے شہر کا مرکز قرار دیا جس کی بنیاد رکھا جاسکتا ہے کہ ہال نیز اسلام سے پہلے اور  
نیز بعد غائب اسلام قسطنطنیہ کا مرکز ٹھہراتی تھا۔ بازنطینیسم کو اسکندر اعظم نے فروغ کیا تھا۔ پھر  
اس کے بعد زمانہ میں تشریف لائے۔ سینین اور دوسری وحشی قوموں نے ناست و راج اور تباہ  
ویرباد کیا تھا۔ بازنطینیان دراصل تاجر لوگ تھے اور کسی عہد میں بہت ہی بڑے دولت مند  
اور صاحب ثروت تھے۔ جو دوسری صدی عیسوی میں تین برس تک شہنشاہ سرویس سے  
لڑتے رہے۔ آخر قحط سے مجبور ہو کر انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔ بازنطینیسم کا قیام  
اسی مقام پر تھا جہاں اب فی زمانہ قصر سلطانی واقع ہے۔ اور باقی شہر سلطانی ناست کی  
پست پر تھا۔

قسطنطین اول نے جب اپنے حلیف سینین پر فتح پائی تو اسکو یہ شہر اس قدر پسند آیا کہ اس نے  
اس کے قریب ایک یا شہر بنانے کا قصد کیا اور اس جدید شہر کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔  
اس نے اس شہر کا نام پہلے تونیاروما رکھا تھا مگر بعد ایک زمانہ کے وہ اس کے نام سے قسطنطنیہ  
شہر ہو گیا۔ قسطنطین چونکہ نیا نبی عیسیٰ ہی ہوا تھا اور پہلے ہل دین مسیحی اختیار کرنے کی وجہ سے  
اس کے دل میں جوش مہر ہی بہت کچھ ہوا تھا لہذا اس نے اس نئے شہر کو جو تین  
برس سے تعمیر ہو رہا تھا منی ستیم میں چار برس دن کے جشن کے بعد درجن مہری رکھواری  
مریم کے مقدس نام کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ پھر اس کے بعد اس عہد میں جبکہ روم کی  
سلطنت مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم ہو گئی تو قسطنطنیہ مشرقی حصہ سلطنت روم کا پایہ  
تخت قرار پایا۔ یہ مشرقی سلطنت اریکڈیس کے عہد سے یعنی ۳۲۵ء سے شروع ہوئی اور  
اس زمانہ تک قائم رہی جو وقت کہ ہمارے پھر سلطان محمد اور اس کے سپاہیوں کی تلواریں  
اس کے گرد چمک رہی ہیں۔ اس سلطنت کا سب سے زیادہ سرسبز کا زمانہ جسٹینین اعظم کا  
عہد تھا جس نے ۵۲۷ء سے ۵۶۵ء تک سلطنت کی۔ اس نے شہر کا زیادہ حصہ از سر نو تعمیر  
کرایا تھا۔ شہر قسطنطنیہ کو دراصل بے انتہا مصیبتیں جیلنا پڑیں۔ انزونی بغاوت میں اور  
فہار۔ ایرانیوں۔ عربوں۔ روسیوں۔ ونیشین وغیرہ کے بیرونی متواتر ظلم برداشت کرنا  
پڑے۔ ہم ادھر بیان ہی کر چکے ہیں کہ ساتویں اور آٹھویں صدی کے حملوں میں اہل عسرب  
ہال اب ترکوں کا مرکز ہوا اور ایسا خیال کیا گیا ہے کہ انہوں نے بعد فتح قسطنطنیہ یہ مرکز اختیار کیا مگر  
یقین کرنے کی وجہ موجود ہے کہ ہال مدت مدید سے دین اسلام کی نشانی تھا، اؤنڈا لیر



نے اس شہر کوٹ ہی لیا ہوتا مگر کیسے قسمت اچھی تھی بچ گیا۔ یہی خوش نصیبی امتداد زمانہ کے ساتھ آخر تک چلی آئی مگر شاید اُس نے چند روز کے لیے چوڑ دیا جب کہ مسئلہ اور شکستہ میر فہریشین ہیر و داند الو اور بالڈون کوٹ آف فیلینڈرس نے اس شہر کا سخت محاصرہ کیا۔ اور جن کے لیے جوڑے محاصرے کے بعد آفرنج ہو گیا۔ خوب ہی ماتحت و مارج ہوئی۔ اور بلاطینی شہنشاہی کا دار السلطنت ہو گیا جو بالڈون کے زمانہ سے شروع ہوئی اور مسئلہ تک قائم رہی۔ یہاں تک کہ یونانیوں نے پیرنج کر لیا۔ اور اپنی قدیم مشرقی شہنشاہی کے مرکز کو پیر اسی قدیم مقام پر آئے لیکن اُس سلطنت کی وہ قدیم عظمت و ہیبت سب تشہیف لے جا چکی تھی جبکہ نتیجہ ہوا کہ دو صدیوں سے یہی کم زمانہ میں اُس شہر کے یہاں تک مسلمانوں کے واسطے کھل گئے۔

شہر قسطنطنیہ ایک مثلث قطع کی پہاڑی پر واقع ہے جو صلیح مارمرور کی جانب مائل ہوئی ہے۔ اُس پہاڑی کے دو پہلوؤں کو سمندر اپنی لہروں سے تھمرے دے دے کے دھو کر رہا ہے اور تیسرا پہلو تھریس سے ملا ہوا ہے اور اُسی پہلو کے مشرقی کونہ پر شہر قسطنطنیہ واقع ہے۔ پندرہویں صدی کے وسط میں اس شہر کے ہر چار طرف فیصل تھی۔ مرن گولڈن ہاگ کی طرف تو فیصل البتہ کسی قدر کمزور تھی باقی اور ب طرف نہایت ہی مضبوط تھی۔ فیصل کا منظر یہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا بڑی بڑی ترشی ہوئی چٹانیں باہم جوڑ دی گئی ہیں۔ اور اسی وجہ سے اُن لوگوں کو جو باہر سے دیکھیں عمودی قطع کی پہاڑیوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ یعنی نظر آتا تھا کہ ایسے پہاڑ ہیں جو بخوبی مستقیم بلند ہوئے چلے گئے ہیں اور جہر عمود پہاڑوں میں ڈھال ہوا کرتا ہے بالکل نہیں ہے۔ ابن بطوطہ نے ہی سلطان محمد سے تقریباً سو سو برس پہلے اس عالیشان شہر کو دیکھا تھا۔ وہ بھی اسکی مضبوطی کا بڑا محرت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہاں کے ہر بازار کے الگ الگ پہاڑ تھے۔ جو رات کو نید کر دیے جاتے تھے۔ شہر ایک پہاڑ پر واقع ہے جو نویں تک سمندر کے اندر چلا گیا ہے۔ اور مرض یہی تھا ہی کہ کسی قدر زیادہ ہے۔ اُس کی بلندی پر قلعہ اور شاہی محل ہے۔ فیصل تمام پہاڑ کو گیرے ہوئے ہے۔ اور سمندر کی طرف سے ایسی حفاظت کی گئی ہے کہ کوئی گزہ ہی نہیں سکتا۔ جن دنوں کا حال ہم بیان کر رہے ہیں اُن دنوں گولڈن ہارن کا راستہ دولہے کی زنجیروں اور کشتیوں سے بالکل بند کر دیا گیا تھا۔ اور غلام جو گولڈن ہارن کے دوسری جانب واقع

سچے اُس کی بھی بہت ہی مضبوطی کے ساتھ قلعہ بندی کر دی گئی تھی یہ مضبوطی سنہراوریا  
 ذریعہ میں ہنسنا پسند حملہ کرنے کی سلطان محمد ثانی تیار کیا کرتا تھا۔

میں نے اس کا سامنا کر لیا اور ترکوں دونوں نے بڑی یقینی اور مضبوطی سے لے لیا۔ ہوائی  
 کو مارے تو شہر کے اندر نہیں آتی تھی اور رڈوں پر بے خوفی سے چل پڑتے تھے۔ اور ترکوں  
 کی انتظامیہ کے تحت نہ ملتا تھا۔ ان کے لئے لکھی تھی۔ خصوصاً اس قومی جوش و اضطراب کا اثر  
 اور فوجی ناچاروں کے ہاتھوں سے زیادہ نمایاں تھا۔ سلطان محمد کے دل میں اس کی  
 شکل مزاحیہ اور مزاحیہ تھی۔ وہ لوگوں کے لئے شوق تھا۔ ایک آگ لگا رہی تھی۔ یہاں  
 کا زمانہ وہ ایڈریل میں ایک عالی شان قصر کے تعمیر کرانے میں صرف کرتا تھا۔ یہاں  
 رکھتا تھا لیکن یہ صرف حاکم کا مسئلہ تھا۔ اس کے اندر وہ خیالات کا کام کرتا تھا۔ خطیہ  
 کی طرح کہ شوق کی یہ تھی اس کے کسی پہلو پر قرار نہیں لینے دیں تھی۔ میں نے اس  
 کا واقعہ لکھا ہے جس سے اس کی بھرپوری کاپی اور ثبوت ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے ایک بار اس  
 رات کے وقت سلطان نے اپنے وزیر خلیفہ کو طلب کیا۔ خلاف وقت حاضری کا حکم سنکر  
 اس نے مدینہ طرح سرکے۔ شہر کے خیالات جوش مارنے لگے۔ مگر حکم حاکم مگر مقدمات پر چار و پانچ  
 دف کھانا اور سمنایا گیا۔ سلطان میں حاضر ہوا۔ جیسے ہی وہ شاہی مجالیاں سلطان ہوا، وہ خلیفہ میں

ترجمہ سے ایک بہت ہی قیمتی اور ضروری شے بطور نذر مانگتا ہوں جانتا ہے وہ کیا چیز  
 ہے؟ وہ شہر قسطنطنیہ ہے، یہ سن کے وزیر کے جان میں جان آئی اور دست لیتے وقت  
 کیا جو خدا سے لایزال حضور کو سلطنت روم کا آئینہ جڑا حصہ دیکھا ہے باقی حصہ روم  
 اور اس کا دار السلطنت دینے میں بھی دریغ نہ کریگا۔ اس کی قدرت کا مکمل عہدہ بانی اور  
 حضور کی محبت و قوت سے یقین ہے کہ انشاء اللہ ضرور فتح حاصل ہوگی۔ اور میں وہ  
 کرتا ہوں کہ موقع تمام وفادار غلاموں کے اپنا جان و مال تصدق کر دینے میں کوتاہی نہ کروں گا۔  
 سلطان نے فرمایا لا لا تو اس بلکہ کو دیکھتا ہے ساری رات عداوت میں اسے اس  
 پہلو سے اس پہلو پر اور اس پہلو سے اس پہلو پر بدلتا رہا ہوں میرا برابر ہر عالم برابر  
 ہے کہ بچوں سے آٹھا ہوں اور پرلیٹ رہا ہوں اور اس پر بھی ان بیدار ہی سے  
 تکی ہوئی آنکھوں میں نیند نہیں آتی ہے۔ رومیوں کے سونے و چاندی اور مال  
 و دولت کا خیال کرو۔ اسلحہ میں ہم ان سے بڑھے ہوئے ہیں انشاء اللہ خدا کی مدد

اور خیمہ بند کی دعا سے ہم بہت جلد قسطنطنیہ کے مالک ہوئے۔ سلطان کے پاس ہی  
شناختل تک کہ یا تو اپنے یسا یسون کے خیالات دریافت کرنے کی غرض سے ہمیں وہاں  
کے نئے نئے محل کھڑا ہوتا تھا اور گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اور ایسے عاصی و  
مین مینیتاؤں درلف کے شہر کے نقشہ کھینچتا۔ اور اپنے جبریلان اور اچیزران سے مشورہ کرتا  
تھا کہ کس مقام پر تو بچانہ اگلا جائے گا۔ یہ سب دربار میں پڑتا تھا۔ کہاں پر شہر اگلا  
جائے۔ اس ایک سیریاں کام آسکتی ہیں۔ بات کو یہ دور سے جو سہ۔ اور دن کو  
معاہدات کی بنیاد پر شب کو غور کیا گیا تھا۔ یہ تو۔ اچیزران سے۔ سلطان محمد  
روز کی بیتابی کا علاج کرتا۔ اور دوسری طرف شہر قسطنطنیہ پر ایک بقیہ رسی اور فخر  
کی کیفیت جاری تھی۔ وہ بھی تو رور و کے خراسے اور زادیدہ فرشتوں سے مدد  
مانگتا۔ کہیں عاجزی کے ساتھ ہاتھ پھل کے زمین والوں سے۔ کی درخواست کرتا  
مگر آسمان والوں نے اس کی دعا سے غم نشی سے کان بند کر دیے۔ یہ سب عیسائی تاجدار  
نے اس کی درخواست کو بے پروائی سے ٹالا۔ اور حقیقت اپنے سر پر کون آفت کو بٹاتا  
کس کو پڑتی تھی کہ اُس اہل ریدہ شہنشاہ کا سینہ سیر ہوتا۔ اور کتبہ صحتی کہ تباد  
ہونے والے شہر کی حیات میں اپنی فوجیں لٹواتا۔ اور سوبائوں کی ایک بات یہ۔  
محمدیانی کے۔ ایسے اعلان مجاہد کے ملوان کے ساتھ ٹھہرنے کی سببین طاقت تھی۔  
افرض عیسائیوں نے قسطنطنیہ کو فتح دیا۔ اُس کی تباہی کا ناشادیکہ مائیس۔ اور بہت  
نہ کی۔ خود شہنشاہ کی عیسائی رعایا اُٹھے اُس سے ناراض تھی۔ بعضوں نے سلطان  
سے خفیہ ہمد و جہان کر لیا۔ قیصرین نے حالت اضطراب میں ہاتھک تو کیا نہ اپنے  
فہمی۔ لیت پوپ روم سے نہایت عاجزی کے ساتھ مدد طلب کی اور وعدہ دیا کہ  
اُس ملک کے معاوضہ میں بیچ کینڈہ رومیہ شہر قیہ کو لیں گے۔ وہ غریبہ میں شامل  
کرد و گا۔ پوپ کو تو ان کی مددوں سے تھکتی۔ یہ اقرا اُس کے وہ بہت ہی جوش ہوا۔  
مدد کے لیے اُس نے فوج روانہ کی۔ مگر اس سے بھی چلہ فائدہ نہ ہوا۔ اسو بہ سے  
کہ رومیوں کو اس لڑائی میں چند ان کو شمس نہ تھی۔ بلکہ وہ دونوں کسمپوش کے  
مل جانے کو کردہ جانتے تھے۔ اس خیال نے اُن کے دل میں شہنشاہ کی مدد سے  
بغض پیدا کر دیا تھا۔ اور آخر انہوں نے حفاظت شہر میں اس کے ساتھ چھوڑ دیا۔ بلکہ چلہ

رہا۔ یہ بھی چرچہ ہو۔ تھا کہ میں امرا اور صاحب اثر لوگوں نے صاف صاف کہہ دیا  
 کہ یہ یہ کے مافیہ سے زیادہ تو سہولت و بہبود ہے کہ قسطنطنیہ میں سلطان متوجہ ہو۔  
 اگر بحر گہن کے کٹنے کا اعتبار کریں تو قسطنطنیہ اس لٹی ہوئی حالت میں ہی اباس لاکھ سے  
 زیادہ رہا ہے۔ فوراً کو اپنی گود میں یہ سے ہوئے تھا۔ لیکن ان میں سے صرف دینار  
 ماسوٹر و میون ہی نے خلافت پر وعدہ کیا۔ جان حبشیہ نے جو بھرا ہوا کھانا  
 پر تیار کیا وہ ان دونوں سے مدد کی۔ شہنشاہ فقط سات اٹھ سو سو چار سو سو سے ہزار  
 کی قوت کا مقابلہ کر رہا تھا۔ مگر وہ ہوا تھا۔ لیکن اگر میری مودعین کا یہ بیان سہولت سے  
 مانی نہیں۔ شہنشاہ کے پاس اسکے علاوہ اور یہی بہت سی قوت تھی۔ یہ بالکل غلط ہے  
 کہ کہا جائے کہ قسطنطنیہ کی حفاظت کرنے والی بن آتھی تو تھی۔ یوں ان اہل  
 انی بنی اور تیمارانی تختہ ان بیلیج میں مرجہ دین۔ اس سے بھی قطع نظر کی جائے تو اس  
 طریقہ سے قسطنطنیہ میں بہت قوت فراہم کر لی گئی تھی کہ جس عیسائی مملکت اور قوم کے  
 احاد ہر سے گذرتے اور کینڈا اور بحر اسود سے جاتے وہ سب لڑائی کے لئے رونا  
 رہتے جاتے تھے۔ دینی ہر۔ دی سے جو ش میں اس طریقہ سے شہنشاہ نے اپنا پایہ بہت  
 اچھے قوی کر لیا تھا۔ یہ بھی نہ ہی مگر یہ توڑی فوج ہی وہاں تک نہ تھی۔ قسطنطنیہ کا موقع اور  
 اہلی حالت ہم دیکھا چکے ہیں۔ وہ بڑا ہی مضبوط شہر ہے۔ سمندر اسکے گرد حلقہ کیے ہوئے  
 ہے۔ سوا مغربی جانب کے جدہر ہی توڑی ہی زمین کھلی ہوئی ہے جو یکے بعد دیگرے  
 شہر فیلون اور شہر پناہوں اور کئی مند قون سے بن میں سمندر کا پانی ہر وقت جاری  
 رہا ہے مضبوط کی گئی ہے۔ اس کے مضبوط کرنے میں اسی پر کفایت نہیں کی گئی ہے۔  
 بلکہ رات کے دکنے اور لپکا کرنے کے اور بھی مختلف سامان کیے گئے ہیں۔ ایسے مقام  
 پر جس جملہ آؤں پر ایک آدمی ہی بارہی ہے۔ لیکن ان حفاظت کرنے کے لیے بھی  
 دل چاہیے ضرور انہیں گے کہ یہ بات قیصر بن بے شک موجود تھی۔ گو اسکی اس وقت  
 کی بہت دینی ہی کیون ہو بھی بہت ڈونے والے شخص کو ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور  
 کرتی ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے اپنی قوت پر حفاظت شہر میں کوئی  
 دقیقہ نہیں فراموش کیا۔

جاؤں کا موسم گزر گیا۔ جو سلطان محمد کو بڑی زبردستیوں سے انڈیا نوپل میں روکے ہوئے تھا۔ موسم بہار کا ابتدائی زمانہ تاکہ بہادری کے دلوں کو ترکوں کے دل میں جوش مارنے لگے۔ فوراً ترکی سردار اپنی فوجیں لے کر بڑی بڑی حوصلہ مند یون کے ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ بہار کی نازک کھانا اچھی طرح مسکرائے ہی نہ پائی تھیں کہ ترکی فوج علیحدہ نے خاص قسطنطنیہ کے پہانگ تک تمام شہروں اور گاؤں کو صاف کر دیا جن شہروں نے اطاعت قبول کر لی وہ توڑ کر دیئے اور انکی حفاظت بھی کی گئی۔ باقی جس نے ڈاکھا لگتی اُس نے فوراً سربانی کا مزہ اٹھا۔ سواحل بحر اسود پر بے لگائی شہر بھر دیا۔ انوکھیم اور بیل کے نام سے مشہور تے سب تلے بلا غدر فوج تاجدار کے آئے سر اطاعت جھکا دیا۔ صرف سبیر یا محارہ کا متغیر رہا۔ اسکے باشندوں نے کسی قدر جرات ہی دکھائی تھی۔ لیکن خود سلطان محمد کے آتے دہان کے لوگ بھی خاموش اور سر نہرین تھے۔

سلطان محمد نے کے موسم بہار میں اپنی فوجیں لیکر انڈیا نوپل سے روانہ ہوا۔ اسکی فوجوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ کوئی تین لاکھ بتاتا ہے۔ کوئی چار لاکھ۔ مگر کہیں اور یہ احمد دعلان کے بیان میں توڑی ہی کی بنی ہے اور قرین قیاس ہی دو لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔ اس میں زیادہ تر خدمتی اور بعض جلوسی لوگ تھے۔ کام کی فوج جو فتح مندی کی تھیں میں آئی تھی اس میں ساٹھ ہزار سوار اور سب ہزار پیادے تھے۔ سلطان کی بحری فوج چندان قوی نہ تھی۔ اگرچہ تین سو سے زیادہ کشتیاں فوج غلظت کے ہمراہ آئی تھیں مگر ان میں سے فقط اٹھارہ جنگی تھیں باقی رسد اور سامان جنگ لانے کے لیے تھیں۔ سلطان نے قسطنطنیہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر پہلے خیمہ ڈالا۔ یہاں ٹھہر کے اس نے اپنی فوج کو معائنہ کیا۔ انیسے پہلے ہر ایہونکا جائزہ لیا تو بہادران اسلام کی مردانہ صورتیں انکے فوجی لباس کی آب و تاب انکے اسلحہ کی چمک اور ہمت دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اُس نے جوش مسرت میں خدا کی حمد و ثنا کے بعد اپنے پر جوش سپاہیوں کی طرف خطاب کر کے کہا کہ قرآن مجید میں خدا سے تعالیٰ جل شانہ فرماتا ہے کہ خدا کی راہ میں رٹنا ہر شخص پر فرض ہے اور اُسکی اتباع سب مسلمانوں پر فرض ہے، اس کو وہ مبارک آیتیں جن میں کفار پر فوج کشی کا حکم ہے جوش و خروش سے پڑھیں۔ جہاد اور جنگوں کی آگ بھڑک سپاہی کے دل میں بھڑکادی اور نہایت ہی رقت کے بلھے میں بیان کیا کہ

یہ خبر خدا معلوم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت کے ہر قیصر کا ملک فتح کرینگے۔ اس  
 اتحادی فوج کے چھ پچھلے علماء۔ مشائخ اور سادات کا ایک گروہ تاجو سلاطین کی فتح  
 و نصرت کی ضمانت ہے۔ ان شہرہ آفاق فوجوں میں سے جو اس فوج سے ہمراہ تھے  
 امام احمد رضا رحمہ اللہ اور شیخ آف تھمس الدین اور شیخ قادیانی زیادہ تر قابل توجہ ہیں۔ ان دونوں  
 نصرات کی مذمت میں خود سلطان کے اپنے وزیر احمد یا شاہین ولی الدین پانڈے تھے۔  
 ان کے کلمہ ایمان نامہ و آپ بھی تشریف لائے تو اب جہاد میں شریک ہو چکے۔ اور قسطنطنیہ کی فتح  
 و فتوحات سے ہمراہ تشریف لکھے۔ اس لیے کہ آپ کی موجودگی موجب برکت ہوگی۔  
 اس دونوں آنے اور شیخ تھمس الدین کے یہ درخواست و دونوں بزرگوں نے قبول  
 کی تھی اور خود بنفس نفیس شریک جہاد ہوئے تھے۔ لکن شیخ تھمس الدین نے برہم منہ سے  
 ان ائمہ میں ذیہ کو کوئی شے کی تو بخیر ہی دی تھی نہ انشاء اللہ قسطنطنیہ اسی سال مسلمانوں  
 کے ہاتھ سے فتح ہوگا۔ اہل اسلام فلان طرف سے فلان تائیں پھر وہاں جیسے ہے قسطنطنیہ  
 میں داخل ہوں گے۔ تو اس وقت خود پادشاہ کے پاس کڑا ہونگا وزیر نے خوشی غمی  
 ماسکے یہ مٹا دیا کہ ابی سنا دیا تھا۔ انفرض اس طرح سے فوجی دل و دعوئی باز  
 ہوئے اس نے قسطنطنیہ کے سامنے صفوں جنگ آراستہ کین۔ اور فوجی قاعدہ سے  
 بڑا۔

سلطان سلیمان عالی شان کے عہد کار کی مورخ سعد الدین افندی اپنی تاج التواریخ میں  
 سلطان محمد کی آمد ان باستان و شوکت الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ ایک جمع کو جو کسی ایسے  
 طالع کی طرح روشن اور باصفا تھی جیسے ہی شاہ غادر کا پیش خیمہ شعا عوں کی فوجوں کو  
 سامنے بردہ مشرق سے اور برج اُفق پر سے نمودار ہوا علی جاہ و بلند بانگ سلطان  
 کے لشکر غیر وزی اتر کا طلوعہ فیصل شہر کے نیچے پونج گیا۔ اور اسکے بعد سلطانی فوج  
 امام احمد نے اسناد میں سے اپنی مسند من اور عاک نے بستر غمی سے رویت کی ہو کہ فرما: یول اللہ  
 سلمو نے تفتح القسطنطنیہ و انعم الایسر امیرا و انعم الجیش منہا، قسطنطنیہ فتح کیا جائیگا اور کیا چاہا ہو  
 وہ امر خدا کی فتح کا ایسر ہو اور کیا اچھی ہے وہ فوج جو اس فتح کی حاصل کرنے والی ہو۔  
 وہ درتا ہوں کہ سرسید کہیں گے یہ اردو ہی نہیں ہے۔ لیکن وہ معاف فرمائیں مجھ سے اسکے سوا  
 کسی طرح ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔







روز رات کو اسے بالکل صاف کر ڈالتے تھے۔ اس حملہ آوری میں سلطان محمد ثانی کی دوسری تدبیر یہ تھی کہ فہیل شہر میں برابر سرنگین لگانی جائیں لیکن یہ امر بہت ہی دشوار تھا اس لیے کہ وہاں کی زمین سنگستانی تھی اور اُس وقت تک اس فن کو اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی جتنی اس دور میں ہے کہ پہاڑ کے پہاڑ آنا فانا بارود کی قوت سے اڑا دیے جاتے ہیں۔ وہاں تو صرف اتنی کارروائی تھی کہ توپوں کے پہلو پہ پہلو بڑی بڑی پتہ پھینکنے کی کھدیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ مشہور مقدمہ یونانی آگ بھی دشمنوں کے تباہ و برباد کر دینے میں ایک مقول حصہ لیتی تھی۔ سلطان محمد ثانی نے اپنی طبیعت داری سے ایک اور نئی چیز ایجاد کی تھی وہ یہ کہ ایک بہت ہی اونچا اور بلند لکڑی کا مینار بنوایا جتا جو روٹوں کے ذریعہ سے کسکایا جاسکتا تھا۔ اس پر تھری تھری میل کی کنا لین چڑھائی گئی تھیں جس کی آڑ پر ٹکے حملہ آور نہایت ہی حفاظت و اطمینان سے حریف پر نیر کر سکتے تھے۔ اس کے سامنے تین دروازہ تھے جن سے نکل کے سپاہی حملہ کر کے فوراً پناہ میں آسکتے تھے۔ اس کے اندر ہی اندر سیر سپاہی تھیں جن کے ذریعہ سے لوگ اوپر جاسکتے تھے۔ چوٹی پر ایک اور سیر ہی لگی ہوئی تھی جو گریزوں کے ذریعہ سے اوٹھ جاتی تھی اور اس سیر ہی کو اگر حریف کے قلعہ کی دیواروں پر قائم کر دین تو ایک پل تیار ہو سکتا تھا۔ ان تمام نئی تدبیروں کی بدولت آخر ایک دن سینٹ روالنس کا بوج خراب ہو ہی گیا۔ لیکن اس کے بعد ہی فوراً اندھیرے کے خوف سے ترکون کو واپس آنا پڑا لیکن امید پیدا ہو گئی تھی کہ

۱۰۔ روغن نفت وغیرہ کوششوں میں ہر کچھ بچا رہی کی طرح مارتے سے جو جلتا بلتا آگے گرتا اور لوگوں کو بھاسا دیتا تھا۔ اس کی ایجاد دیونانیوں کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ معاویہ کے زمانہ میں جو عجمیوں کا حملہ قسطنطنیہ پہنچا تھا اس وقت اسی آگ نے اس شہر کو مسلمانوں کے ہاتھ سے بچا دیا تھا۔ لیکن خستہ میں اس کا استعمال مسلمان حملہ آوروں اور خصوص ترکون میں ہی تھا اور کثرت سے تھا۔ اس روغن کا اب رواج نہیں رہا اس لیے کہ لڑائی کے اس سے عمدہ آلات ایجاد ہو گئے۔

جمع ہوئے ہی سخت حملہ آور پورس کر کے شہر میں داخل ہو جائیں گے۔ دوسرے دن سلطان کو بہت سی افسوس ہو احب اس نے دیکھا کہ دشمن نے اس کی جادہی مینا کو ہلا کے خاک کر دیا ہے اور رات بھر میں وہ منہدم رُوح ہی خوب مضبوطی۔ سے اڑھنہ تیار کر دیے گئے اور خندق جو ان عسکریوں سے بہرہ گیری تھی بہر صاف کر دی۔ حریف کے ٹورل سے فکری تھی اس کا وطن۔ اس کی حکومت۔ اس کا مذہب غرض کل چیزیں خطر میں تھیں شہنشاہ اور اسکے مددگار حبیبیانی نے ساری رات اسی مقام پر کمانیوں کے کنارہ ہی کافی اور شکست و ریخت کی مرمت کرتے رہے۔ سلطان محمد کو اپنی اس ناکامی اور کمانیوں کے بہر صاف ہو جانے کا نہایت ہی بعد مرہ ہوا اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ جنوا کے چارہ باز رسدے کے خلیج میں داخل ہو گئے اور محصور گور رسدہ ہی پہنچ گئی۔

اس رسدہ کے پہنچتے ہی یونانیوں کی امیدیں اڑھنہ نو زہد ہو گئیں۔ اون کا شہر ذائقہ کچھ ایسے مناسب موقع پر ہوا تھا کہ دو ستون کا وہاں تک ہو چکا جس قدر آسان تھا اسی قدر دشمن اور عظیم کی رسائی دشوار تھی۔ وہ تو کہیے کہ خدا ہی کو منظور نہ تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے درمیان میں ایک ایسا مضبوط قلعہ عیسائیوں کے ہاتھ میں باقی رہ جائے۔ اب شہر کی فتح اس وقت تک محال معلوم ہونے لگی تھی جب کہ خشکی اور سمندر دونوں طرف سے حملہ نہ کیا جائے۔ خلیج کار استہ ایک بہت ہی مضبوط انجیر سے رُکا ہوا تھا جس کی حفاظت کے لیے آٹھ بڑے اور بیس سے زیادہ چھوٹے جنگی جہاز اور کثرت سے جنگی کشتیاں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ اس طرف سے کوشش کرنے میں لامحالہ بھری لڑائی ہی لڑنا پڑتی۔

اس وقت سلطان محمد خان کے ذہن میں ایک اور تدبیر آئی۔ وہ تدبیر اس خباہتس بادشاہ کی کوئی کشف و کرامات تھی یا اس مشہور شہین گوئی پر عمل کر کے وقوع میں آئی تھی جو مالک عثمانیہ میں مشہور تھی کہ قسطنطنیہ اس وقت تک نہیں فتح ہو سکتا جب تک حملہ آور بادشاہ کھلے ہوئے بادبانوں سے خشکی میں کشتیاں نہ چلائے۔ بہر صورت جو کچھ ہو مگر محقق یہ ہے کہ سلطان محمد ثانی نے اس غیر ممکن امر کو ممکن کر دیا اور بیچ من خشکی پر کشتیاں چلا دیں۔ اس نے رات بھر میں انہی جنگی کشتیاں جنگوں

اور ناہموار زمین کی دس میل مسافت طے کر کے باسفورس کے کنارہ پر لاکے ڈال دیا۔  
یہ تدبیر یوں عمل میں لائی گئی کہ ہموار زمین پر تختہ برابر برابر بچھا دئے گئے پہر چربی ڈال  
کے وہ خوب جلنے کیے گئے۔ کشتیوں کے پال کوئلہ دیے گئے اور اس طرح  
وہ ان جلنے پڑون پر دوڑائی گئیں۔ ہر کشتی پر دو ناخدا معین تھے جن میں سے  
ایک آگے اور ایک پیچھے تھا۔ مشعلوں کی روشنی میں ہوا کے زور اور انسانوں کی طاقت  
سے جہازوں کا یہ بیڑا خشکی پر دوڑتا ہوا چلا۔ جہاں کہیں بلند سی پر چڑھنا ہوتا وہاں  
رولرون اور گریڈوں سے کام لیا جاتا تھا۔ اس وضع سے ۵۰ میل طے کر کے یہ  
بیڑہ غلاط کے عیسائیوں کے سر پر ہوتا ہوا ہموار زمین کو طے کر کے اور یہاں دن پر  
چڑھتا ہوا خلیج کے پایاب کناروں پر جا پہنچا۔ سپاہیوں کے خوشی کے نعرے  
مردانہ رجز خوانیوں کے نغموں کی آواز۔ اور مشعلوں کی روشنی میں خشکی پر اتنے بڑے  
بڑے جہازوں کو چلتے دیکھ کر دشمن پر خوف ناامیدی اور ہراس کی کیفیت طاری ہو گئی  
یہ بیڑا جب خلیج کی بلندی پر پہنچ گیا تو ادولالوفم سلطان نے ایک بہت ہی  
مضبوط بیڑا (بابائیم) پچاس ہاتھ چوڑا اور سو ہاتھ لمبا تیار کر لیا اور اس پر ایک بڑی  
توپ قائم کی۔ کشتیاں ہی فوج اور بیڑہیان لیے ہوئے شہر کی دیوار کے نیچے جا  
لگئیں۔ مسیحی حامیان شہر نے ہی اندھیرے آجائے ان سب مہمتوں کے برابر  
کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اور ٹھانہ نہیں رکھا مگر ترکی توپوں نے انہیں زک  
زک دی کشتیوں اور پہل میں آگ لگا گئے لی بھی کوشش کی گئی مگر سلمان ہوشیار  
تھے اس میں بھی ناکامی ہوئی بلکہ اُسے خود بھیجیوں کی کشتیاں چہن گئیں۔ اور ان  
بے احتیاطی کی حفاظتوں میں قسطنطنیہ کے بڑے بڑے بہادر نامور سپاہی ترکوں  
کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے۔ خلاصہ یہ کہ چالیس دن تک لڑائی رہی۔ جس کے  
بعد محمد رین کا حال ابتر ہونے لگا۔ آخر ثابت ہو گیا کہ ان کی فوج اور شہر کی دیوار  
خشکی اور سمندر دونوں طرف کے حملوں کی تاب نہیں لاسکتیں اور ان کے ہاتھ  
تھک تھک کے رہ گئے۔ اور ان کی توپوں کے ٹھنڈے ہو گئے۔ اور ترکوں کی  
توپوں نے اس حصہ جمعین کو جو مدت ہاے دراز سے دشمنوں کی قوت سے  
بے پروا کھڑا اپنی مضبوطی پر غور کر رہا تھا مارے گولوں کے چلنی کر دیا۔ دیواروں

میں جا بجا نہ پڑ گئے۔ اور سینٹ رمانس کے یہاں تک کے پاس واسے چار مہینے  
 کر کے سطح زمین کے برابر ہو گئے۔ اور شہنشاہ کے سر پر ایک اور مصیبت آپڑی  
 فوج نے اپنی تنخواہ کے واسطے وق کرنا شروع کیا اور یہاں تک مجبور کیا کہ  
 آخر اس سے گرجن سے مال و اسباب لینا پڑا۔ اگرچہ اس نے جتنا لیا اس کا  
 جو گنا دے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر وہ لوگ جو دو لاکھ سیون کا اتحاد ہوا جانتے تھے  
 اس کو غصہ سمجھے اور اونہیں اور یہی قصہ آریوں اور ریشکائیوں کا موقع مل  
 گیا۔ اگرچہ تباہی اپنے منہوس پرہیز کا سایہ ڈال رہی تھی مگر باہمی نا اتفاقی کسی  
 طرح کم نہیں ہوتی تھی۔ جو بنبر اور وینشیں دگا۔ اپنے اپنے خیالات کو ایک دوسرے  
 پر ترجیح دیتے تھے۔ اور انیس ایک دوسرے کو نامحرمی کا الزام دیتے تھے۔ سیون  
 کی یہ حالت ہو رہی تھی۔ اگرچہ اب اس ہر اس کے عالم میں الہی کو اپنی بد اعمالیوں  
 روت نہیں بن پڑتا تھا۔ آخر حضرت مریم کی مورت دینی جوش و خروش اور مذہبی  
 شان و شوکت کے ساتھ کو لی گئی۔ مگر آہ! اس مقدس مریم نے ان کی خوشامد  
 انکی دروہری آوازوں سے اپنے کان بند کر لیے۔ اس میں کوئی شک نہیں اگر  
 کسی کے دل میں اس آفت کا عدم تھا تو شہنشاہ کے دل میں۔ لیکن نصیبی کا  
 اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ عوام الناس او لٹے اس کو الزام دیتے  
 تھے کہ ناحق اور مختص بیکار لڑائی میں تصبیح اوقات کرتا ہے۔ آخر اطاعت کیون نہیں  
 بدل کر لیتا۔ الغرض اپنی قسموں کے آئندہ خوفناک سین اون کی آنکھوں کے  
 سامنے پہرہ ہے تھے۔ اور وہ سب ترکوں کی غلامی کی راحت پر جان دیے  
 دیتے تھے۔

۲۸۔ کی شام کو یونانی امرا و شرفا اور بہادر جن پر بہرہ و تہا قصر شام تھا ہی میں  
 طلب ہوئے۔ اون سب کو اطلاع دی گئی کہ علی اصباح سلطان کا قصد ہے کہ  
 عام جلسہ کر دیا جائے۔ اور اسی جانا ہی پرستدر بنے کی اون سے درخواست  
 کی گئی۔ گبن نے اپنے خون چکان قلم سے بہت صہیح لکھا ہے کہ در یہ آخری اسپیج  
 شرفی رومی شہنشاہی کا فیوزل آر لیشن تھا۔ شہنشاہ نے سب سے وعدہ  
 لیے۔ سب کو قسمیں دلایں۔ اور ان لوگوں کے دلوں میں ایک متنع الوقوع امیکا

فرچکانے کی بے فائدہ کوشش کی۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ دوسروں کے دل پر کیا اثر ہو سکتا تھا جب خود اسی کے دل کی ساری اُمیدیں مدہ ہو چکی تھیں۔ اس نازک حالت میں اس غریب کے لیے نہ اس دنیا میں کوئی اُمید باقی رہی تھی اور نہ اس آنے والی دوسری دنیا میں۔ لیکن جو کچھ ہوا اس میں شک نہیں کہ خود شاہنشاہ کی مثال اور مدت تک کے سخت محاصرے نے عیسائیوں کے دلوں میں مایوسی کی سخت بہت پیدا کر دی تھی۔ اور جس طور سے چتور کے راجپوت اپنی بہادر اور نازنین رانی کو خاک کر کے پھانک کھول کے نکلتے تھے اسی طرح اس وقت قسطنطنیہ کا ہر بچہ مرنے اور جان دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے سے مل جل کے روتے تھے۔ قیامت کی ملاقات کے وعدہ پر باہم رخصت ہوتے تھے۔ نہ اپنے بال بچوں کی پروا تھی نہ جان و مال کی۔ انفرض ہر شخص اپنے وطن پر جان دینے کو مستعد ہو گیا تھا۔ ان باہمی قول و قسم کے اقرار و ن سے فراغت کر کے ہر ہر افسر نے اپنے اپنے مقررہ مقام کی راہ لی۔ اور اس جوش و خروش سے مرنے پر آمادہ ہو گیا کہ سبھوں نے وہ منہوس رات آنکھوں میں کاٹی۔ بیکراہی اور اضطراب نے رات بھر سب کو شہ کی تفصیلات ہی پر کھڑا رکھا۔ خود شاہنشاہ مع اپنے چند رفقا کے پہلے سینٹ ہوئیہ کے گرجا میں گیا جو توڑی ہی دیر میں خدا سے وعدہ لائبریک کا مشورہ عبادت گاہ ہونے والا تھا۔ وہاں جا کے اپنے مذہب کے آخری فرائض جوش و دل اور قوت قلب سے ادا کیے۔ وہاں سے پلٹا تو مایوسانہ خیالات نے ایسا تھکا دیا تھا کہ جلد لمحہ آرام کرنے کی غرض سے وہ قصر شاہنشاہی میں گیا۔ مگر یہ سہمت سے گریہ و بکا کی ایسی بے چین کرنے والی آواز آ رہی تھیں کہ اس کا دل خود بخود بے قابو ہو گیا۔ وہ آرام کرنے کی غرض سے یہاں کھڑا رہا۔ مگر آہ! آرام کجا۔ آخر پریشان ہو کے اوٹھ بیٹھا۔ ہر شخص سے اپنا کھانا معاف کرایا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر محافظین شہر کی ہوشیاری اور مستعدی دیکھنے۔ اون کا دل بڑبڑانے اور غصہ کی کارروائیاں دریافت کرنے کو روانہ ہوا۔

۲۹۔ مئی ۱۵۳۳ء کی صبح کو سلطان نے عام حملہ کا حکم دیدیا۔ یہ ایسا مضبوط

اور نہ سب شہر تھا کہ ترکون کو جی رات بہر حملہ کی تیار ہی اور خدا سے مدد مانگتے ہی کٹی  
 سپاہ اور توپیں شب ہی کو خندق کے کنارہ پر جا لگی تھیں جن کو جا بجا سے پات  
 کے اکثر مقامات پر ب مسلح ہستہ بنائے گئے تھے۔ اس کے جواز قلعہ کی دیواروں  
 سے لگے ہوئے تھے۔ اور ہر شخص کو خاموش رہنے کا حکم تھا۔ ایک سکوت  
 خمبشی کا عالم تھا جس نے پچھلی رات کے سنائے کو کسی قدر اور بڑا دہا تا تھا۔ صبح  
 ہوتے ہی وہ سنایا یوں توڑا گیا کہ دونوں طرف سے حملہ شروع ہو گیا۔ ترکون کی  
 طرف سب سے آگے مجاہدیں کا گروہ ہذا جام شہادت کی تمنا میں اطراف و  
 اکناف عالم سے دوڑے آئے تھے۔ ان کے بعد ان لو لیا اور ر میلہ کی جانب  
 فوجیں اپنے اپنے پاشاؤں اور خبروں کی مانتی میں تھیں۔ اس کے پیچھے جا تار یوں  
 کی پڑھت فوج تھی۔ اور سب کے پیچے خود سلطان کی سوا ہی تھی۔ دس ہزار خانگی  
 فوج اس کے گرد ملے ہوئے تھی خود سلطان اس وضع سے گھڑے پر  
 سوار تھا کہ ایک ہا ساء امامہ سر پر تھا گزرا بنار ہاتھ میں تھا اور اس سے اشارہ  
 کر کے حملہ کی باتیں کرتا تھا۔ اور سپاہیوں کے دل بڑھاتا جاتا تھا۔ ہر طرف  
 سے توپوں کے فیر ہونے لگے جن کی گرج نے کانوں کے پردہ ہار ڈالے اور  
 جن کے دہوئیں نے ہر طرف کی چیزوں اور سامنے کے تمام نظروں کو چھپا لیا تھا  
 کہ گولی وہ دوہری دیواریں توڑ سی ہی دیر میں منہم ہو گئی تھی۔ دھیر  
 من گئیں۔ ہر طرف سے حملہ آوردن نے یورش کی و گما سان لڑائی ہونے لگی  
 اس وقت بانجسینانی کو ایک گولی یا ایک تیر نے زخمی کر دیا۔ اس کا خون دیکتے ہی  
 میا یوں کے چکے چوٹ گئے۔ جان جسینانی خود جاگ نکلا۔ اگرچہ شہنشاہ نے  
 مت بھایا تھے کہ اسکی خوشامد تک کی مگر اس ستم رسیدہ نے ایک نہ سنی۔ پلٹے  
 جو سلطان کے انعام کا مستحق قرار پایا اور جس نے سب کے پیچے فیصل شہر پر قدم  
 رکھا وہ ایک جان نثاری تھا "حسن"، نام۔ جو ایک بڑے تن و توش کا سپاہی  
 تھا۔ اس کے پہونچتے ہی اور بارہ بان نثاری پہونچ گئے اگرچہ حسن کو سپاہیوں  
 نے ڈکھیل دیا مگر وہ اپنے مضبوط دل کے ساتھ بہر گشتوں کے ہل اوتا۔ اگرچہ  
 اس پر برابر تھروں کا مینہ برسنے لگا لیکن اس نے اپنی جرات و بہت سے ثابت

کر دیا کہ ایسے قلم پر چڑھ جانا کسی انتہا درجہ کی دلیری فوت سے ممکن ہے۔ اس کے بعد کیا تھا۔ ہر چار طرف دیواروں اور ہرجون پر چڑھ چڑھ کے ترک سب جگہ پہنچ گئے اور جوق جوق جمع ہو گئے اور یونانیوں کو مجبوراً کہا گئے ہی بن پڑی۔ قسطنطنیہ وہ بہادر لوگ جو اس وقت نیز خیر لون کا اوزیر سپاہی کا کام دے رہے تھے ان میں خود شاہنشاہ بھی تھا جو اُمرا اس کے ساتھ تھے انہوں نے ہی جان نثاری اور وفاداری کا حق ادا کیا۔ اور آخر دم تک اوس پر پڑا نہ رہے کسی جگہ ساتھ نہ چھوڑا۔ ایسے نازک اور تنگی کے وقت میں اپنی جان سے تنگ اگر کوئی نہ ہو بہر احملیہ شاہنشاہ نے اپنی زبان سے نکالا تھا وہ اس وقت تک ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے۔

در کیا کوئی ایسا عیسائی نہیں مل سکتا جو میرا سرتن سے جدا کر دے۔ اے اوس غیرت مند کو سب سے زیادہ ڈر ترکوں کے ہاتھ میں زندہ گرفتار ہو جانے کا تھا۔ اوس نے اب اپنا شاہنشاہی لباس اتار ڈالا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخری پہر کی گبراسٹ میں وہ کسی نامعلوم شخص کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس کے مارے جاتے ہی پہر عیسائیوں میں نہ کوئی ضابطہ تھا اور نہ کسی قسم کی مراحت تھی۔ وہ بے سرو پا اور بے جو اس شہر کے طرف بہا گئے اور دن میں سے اکثر سینٹ مار کے بہانے کے نیچے دب کے رہ گئے۔ فتح مند ترک اندرونی حصہ میں رخنہ کر کے شہر میں گئے۔ اور جب شہر کی کشادہ نہ کون پر پہنچے تو اپنے ان بہادر حملہ آوروں سے لے جنوں نے چلیج کی طرف سے فینار کے دروازہ پر حملہ کیا تھا۔ اور اس جگہ سے لڑتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے تھے۔

ایک ترکی مصنف نے اپنی البیانی انشا پردازی کے زور قلم سے اس یادگار فتح کی سرگذشت ان شاندار الفاظ میں لکھی ہے۔

”جبکہ وقت موعود آگیا اور قلعہ کسی طرح نہ فتح ہوا تو وزیر کو سلطان کی طرف سے بہت خوف ہوا۔ وہ ڈرتا ہوا اور سہما ہوا شیخ شمس الدین کے پاس گیا۔

گروہوں نے اسے روکا۔ اس لیے شیخ نے اپنے معتقدین کو تاکید کر دی تھی کہ  
 کسی کو ان کے پاس نہ لے دین لیکن اضطراب میں وزیر نے خیمہ کی چوبیس اوٹھا میں  
 ایسا ہیبتناں کہ شیخ زمین پر عجبہ میں پڑے ہیں سر کھٹا ہوا ہے اور وہ روکے دعا کر  
 رہے ہیں وزیر نے خیمہ کی طنائون سے اپنا سر نکالا ہی تھا کہ یکایک شیخ اوٹھ کھڑے  
 ہوئے۔ زور شور سے تکبیر کہی اور فرمایا الحمد للہ الذی قتل شیخ ہذا المذنب (اے اللہ کا  
 شکر ہے) اس منہ کی فتح ہمیں مرحمت فرمائی۔ وزیر کہتا ہے اون کی زبان سے  
 یہ جملہ سنا تھا کہ میں نے منہ پھر کے شہر کی طرف دیکھا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ شہر اسلام  
 شہر میں داخل ہو چکا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ نے انہیں کی دعا کی برکت  
 سے کسی وقت جب کہ انہوں نے دریا تانا منہ کو فتح کیا۔ اور قریب قریب شہر بان  
 ترک کا عموماً اسی پر عقیدہ ہے۔ خیر جب سلطان محمد غوث قسطنطنیہ میں داخل ہوا تو  
 اس نے اپنے پہلو کی طرف پھرتے دیکھا وزیر ابن ولی الدین کو اپنے باہر کے بولا  
 رہی۔ ہمہ جو شیخ نے فرمایا تھا۔

عیسائیوں کو جب یقینی طور معلوم ہو گیا کہ مجاہدین اسلام شہر میں داخل ہو گئے  
 تو وہ مکانات و مہابد چھوڑ چھوڑ کے بدحواس سڑکوں پر نکل کھڑے ہوئے۔ گویا ان  
 خیال میں تھا کہ اس فعل سے غنیمت ڈر کے ہاگ جائے گا۔ شہر کے ہر حصہ کے لوگ  
 سیٹ صوفیہ کی طرف دوڑے۔ اس کثرت سے زن و مرد بوڑھے بچے پادری  
 گوشہ نشین۔ راہب۔ مذہبی اچوتیان غرض کہ ہر عمر ہر درجہ ہر پیشہ کے لوگ  
 اس میں آ کے جمع ہو گئے کہ توڑی ہی دیر میں اس عمارت کے اندر تل رکھنے  
 کی جگہ نہ تھی۔ ان سب لوگوں نے اندر سے دروازہ بند کر لیے اور خدا کے گھر میں  
 بیٹھے اس فرشتہ کی مدد کا انتظار کرنے لگے جس کی بابت اون کے کی مقدرا  
 نے پیشنگوی کی تھی۔

۱۰ ایک صاحب نے پیشنگوی کی تھی کہ ایک دن ترک قسطنطنیہ میں داخل ہو جائیں گے  
 اور وہیں کا ایا صوفیہ کے سامنے جو میدان ہے اور جس میں قسطنطنیہ کا سنو  
 ہے وہاں تک تعاقب کریں گے۔ ان بیان پر ان کے مصائب کا حاتمہ ۴۴



نہایت کہ وہ معمول فرشتہ کے اترنے کا انتظار کر رہے تھے سینٹ صوفیہ کے دروازے  
کھلاڑیوں سے چیر ڈالے گئے۔ اور چونکہ ترکوں کو کوئی فراغت نہیں پیش آئی تھی لہذا  
ان کے وہ ہاتھ جو ان سے بالکل پاک نہ تھے غلاموں کی آغوش اور کثیر چنے اور باندھنے  
میں مٹا دیے ہوئے گئے۔

یوولی سن۔ آنا ر دولت و شرافت انتخاب میں ان کی پہچانی کرتے تھے۔  
جس ملک کا تصفیہ ان لوگوں میں پہلے گرفتار کرنے۔ ذاتی قوت اور قوتی حکومت  
سے ہوتا تھا۔ غلام سیون سے باندھے جاتے تھے۔ لونڈیاں خود اپنی ہی  
نقابوں اور کمربندوں سے جکڑی جا رہی تھیں۔ اعیان سلطنت خود اپنے غلاموں  
کے ساتھ ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے تھے۔ کنہیہ تھے اسلئے عمدہ دار  
اپنے گرجوں کے دربانوں کے ساتھ تھے۔ اور ذلیل بیچ قوم کے لوجوان  
اسلئے طبقہ کی شریف زادوں کے ساتھ۔ جن سے چہرون تک کہیں آفتاب کی شعاع  
نہ پہنچ سکتی تھی اور ان کے عزیز و اقارب تک ان کے رکینے کی عزت نہ حاصل  
کر سکتے تھے۔ اس عام قید میں سوسائٹی کے مراتب اور درجہ ٹوٹ کے بے ربط  
ہو گئے تھے۔ فطرت کے تمام رشتے منقطع ہو گئے تھے اور بے رحم سپاہی باب  
کی آہ آہ مان کے آنسو اور اولاد کی گریہ و زاری سے بے پروا تھے۔ سب سے  
زیادہ گریہ و بکا کرنے والی وہ اچھوتیاں تھیں جو معبدوں سے کہیں کہیں کے نکالی  
گئی تھیں۔ اور اس بے کسی و مظلومی سے کہ سینہ کھلا۔ ہاتھ پیرے ہوئے اور بال  
پریشان۔ ہمیں حسن عقیدت سے ان کی نسبت یقین کر لینا چاہیے کہ معبد کی  
شب بیداری پر عزم کی عشرت کی راتوں کو ترجیح دینے کی طرف وہ کبھی شاد و نا دہر ہی  
نہ سلائی جاسکی ہوں گی۔ ان بد نصیب یونانیوں۔ ان خانگی حیوانوں کے پور پور

۴۴ ہو جائے گا۔ ایک فرشتہ آسمان سے اترے گا تلوار اور اس کے ہاتھ میں ہوگی۔  
اور سلطنت مع اس آسمانی مہتیار کے ایک غریب آدمی کو جو ستون کے نیچے بیٹھا ہو گا دیکھا  
وہ کہیں گادریہ تلوار لیا اور خدا کے بندوں کا بدلہ لالو یہ جان ڈالنے والے الفاظ سے ہی ترک نور  
بال نہ رہے ہوئے اور فتح وادی انکو مغرب کمال دیکھا اور انکو کیا ایران کی سرحد تک نکال آئیں گے۔

گتہ پڑی بے رحمی کے ساتھ ٹوکوں پہ کھینچے گئے۔ اور چونکہ فاتح کارل اور زیادہ  
 ٹکڑے واسطے واپس آنے پر لگا ہوتا تھا لہذا ان بکیرین کے تھر تھراوتے  
 موٹے پاؤں (ٹنگا گاتے ہوئے قدم) دھمکیوں اور گونسوں سے تیز کیے جاتے  
 تھے۔

اس قسم کی ٹوٹ مار اسی وقت کل گرجوں اور خاندانوں تمام ملکوں اور آراء  
 کے سب مکانات میں کی جا رہی تھی۔ کوئی مقام گودہ کدیا ہی متحرک ہو یا کہتے ہی  
 گوشت چین، یونانیوں کی جان و مال کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔ ان مظلوموں کا سنا  
 ہزار سے زیادہ گروہ شہر سے نکال کے خمیر یا جہازوں پہ لایا گیا۔ اور پھر اپنے مالکوں  
 کے نفع یا خون فرائی کے مطابق برے یا بیچے اے گئے۔ اور سلطنت عثمانیہ کے  
 دور و دور از سو بون میں پہلایا دیے گئے۔ یہ وہ دل پر چوٹ دینے والے الفاظ  
 ہیں جن سے اڈور دین نے عیسائیوں کی بکیریں کا سین دکھایا ہے اور ان کے  
 معائب کا نوحہ لکھا ہے۔ یہی سچی دل کی بھڑاس نکالی ہے۔

جن لوگوں کے خیال کو سن کی سحر بانی نے مسلمانوں کے سب سے زیادہ ظالم ہونے  
 کی جانب مائل کر دیا ہوں ان کو جاسیے کہ ان اوقات کو یاد کریں جب مسلمانوں کی حالت  
 عیسائیوں کے ہاتھ ان سے زیادہ تباہ و برباد ہو رہی تھی جب فوج کے تنکے ہاتھ  
 بیکار سپاہی غلامی کی رسیوں میں جکڑے جاتے تھے اور باقی باشندوں کو حکم تھا کہ ان  
 کو مال و سبب اپنی آزادی کی قیمت (فدیہ) کے ایک جزو کے طور پر ظالم عیسائی  
 بادشاہ کے مذکورین اور آئندہ عینہ کے اندر باقی روپیہ ادا کریں ورنہ ہمیشہ کے لیے غلام  
 بننے جاویں گے۔ ادا کا شمار ہوتا۔ تلاش لی جاتی اور بدر کیے جاتے تھے۔  
 اس وقت غریب بوڑھے بکیریں غورتیں اور شریف خاندانوں کی پری جمال نازک اندام اور  
 دشیزہ لڑکیاں بڑے بڑے بوجھ سر پر لادے ملاغہ سے نکل کر القصبہ کی طرف جاتی ہوئی  
 سڑکوں پر دکھائی دیتی تھیں۔ یہ لوگ خاندان بربادی کی مصیبت یاد کر کے گھر چورے وقت اپنے  
 سینہ پیٹتے تھے۔ ہاتھ ملتے تھے اور قیامی سے وہ قتل گھر پر غم انگین آسمان کی طرف اٹھنا  
 کے مزاج کرتے تھے کہ ”اے ملاغہ! مشہور و خوب صورت شہر! اب تیرے

بہت سارے مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ سنا۔ جو اہل تہمتی کہہ رہے۔  
 بیش بہا اسباب و منوں نے اتنا لوٹا کہ اس کے پہلے نہایت کبھی لوٹا ہوگا اس  
 زیادہ تاراج کی وجہ یہ تھی کہ سلطان نے اپنے سپاہیوں سے ۱۰۰ روپے کا کالر  
 تم اپنی تلوار لے کر اسے روئے شہ کو فتح کر۔ گے۔ دو تھوڑے دن تک لوٹنے کی اجازت  
 دی جائے گی۔ اور وہ ۱۰۰ سال ۱۰۰ باب ہمارا ہی ہوگا لیکن اس کے ساتھ اس  
 امر کی سخت تاکید تھی کہ کسی عمارت میں آگ نہ لگا میں قدیم دستور کے مطابق انہوں  
 نے بہت سے گوندی غلام دی گئے تار۔ کیا تھے۔ قصہ مختصر ان غیر دشمن  
 نے ہر قسم کی زیادتیوں کو کمزور کرنے کے لئے مہم بنائی تھی کہ کسی کو تباہی نہ کی  
 آفسوس تھیں کہ کسی بھی چیز سے کہ اس کے لئے ملکہ ہمیشہ جاری رہے۔ اسے ارجح  
 خدا کی بے کناہ مخالفت پر وہ نہایت ہی ناگوار تھے۔ وہ تو نیم دشمن تھے لیکن  
 آج چہ سو برس کے بعد مذہب اور تربیت یافتہ قوموں کے سپاہیوں کو بھی فتح  
 بعد ویسا ہی ظالم۔ ویسا ہی حیا بر ویسا ہی ناخدا ترس پاسے ہیں۔ تین دن کے

ص ۴ غلہ کی وفات کیا ہوئی؟ تیرے میناروں کی شان و شوکت کدہ گر کی ہیر سی مضبوط  
 دیواریں ہیر سی اولاد کی حفاظت کے کیا کام آئیں؟ آہ ادا غریب میں ایک دوسرے سے کہ  
 یا کر کے روئیں گے اور اون کی گریہ و زاری پر بیدار لوگ ٹھہر کر رہیں گے۔ غریب سبیل میں  
 بھیجے گئے تھے جہاں آٹھ مہینہ غلامی کی حالت میں کاٹا پڑے اور جب باقی وہ پناہ ادا  
 کر کے تو قریب پندرہ ہزار جانوں کے تہشگی کی علامت میں ڈالے گئے یہ حالت نہیں حسب  
 مشرقی حصہ غرناطہ کا عیسائیوں کے ہاتھ میں آیا۔

توڑے ہی دونوں بعد خود احمہ کے برجون پر ایک صلیب کے پاس سینٹ جیمس کا جھنڈا  
 اڑ رہا تھا اور اخیر بادشاہ غرناطہ کا ابو عبد اللہ الفشار اس سے یہ سین۔ لیکر نصیب صرت آپس  
 رخصت ہو رہا تھا اور افریقہ مالے کا عازم تھا جہاں اس کی اولاد کی قسمت میں نان شبینہ  
 کا محتاج مارے مارے پہننا لکھا تھا اس وقت عیسائیوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا  
 کیا؟ کونسا معاہدہ عیسائیوں نے پورا کیا؟ ان کے معاہدہ بند کر دیے گئے ان کے  
 کتب خانوں میں جن میں بیشمار مسودہ عمرہ کے دراز کی دماغی محنتوں کے نتائج

بعد سلطان محمد ثانی نے اس واماں تمام کیا۔ حصار شدہ اور دیگر عمارات کی شکست اور نجات کی دست کا حکم دیا اور کہنا یہ آیا صوفیہ کو تمام "گندہ کی ذباختون" اسے پاک کرنا کر کے جانے مجاہد قرار دیا جس کو پیغمبر علیہ السلام کی ہدایت کے بموجب امان دیا۔ سلطان دن سرین پانچ مرتبہ آواز بلند کیا: اگر تے ہیں۔ اس سپہ کی شان و شوکت و بالائی اور اس پر جاگیر بن وقت کین۔

اسی دن یا آئندہ جبہ کو وزن نے ملندھی پر لکھتے ہو کر حسب اصول اسلام اللہ اکبر اللہ اکبر۔ شہدان لا الہ الا اللہ و اشہدان محمد رسول اللہ کی صدا بلند کی۔ امام نے حضور قلاب سے خطبہ پڑھا اور محمد ثانی نے اس کے پیچھے شاد و حضور سے ساتھ نماز اولیٰ دعا مانگی اور اس صدا سے فوج الجلال

۹۹ جمع نہ آگ لگا دی گئی اور کوہ پامالی بنائے کے واسطے جو کچھ ظالموں پر کیے گئے آج بیاں سے ان کے ٹیٹے لکھ رہے ہیں یہ اسی را کر سچین چیر سی کا نتیجہ ہے کہ آج ان کے نزدیک خدا سے وحی لا شریک کا نام لینے والا پورے جزیرہ نما کے اسپین میں نہ ملے گا۔

در سب سے بڑا لکھ سپین جو ایک زمانہ میں معدن تمام علوم و فنون کا ایسا صحرا خرابات و داعی و دہنی قابلیت کا۔ مدبون کی شان و شوکت سے سرا حسیا کردہ آج ہے چرگز نہ ہوتا کون نہیں دیا ہے اس نامور قوم کی قسمت پر جسے اس کیو یہاں کے ایک جابر کے حیز ان کے نقصان سے وطن سے بدر کر دیا ہے اسے تو وہاں کے درمیان مشہور کر دیا تھا بہت صحیح ہے۔ مقولہ "ایک بڑی قوم سادت میں غرناطہ کے برون پر بلال اوکھاڑے" صلیب قائم کی گئی۔ وحین نامور ورن کی بورشید اور ابو عاص کی ولیدہ اور عائشہ کی اپنی لگوں کے سمار گزرون پہنچی رو رہی ہیں۔ کون رہ گزرتیں اب سناتا ہے نہ وہاں شاعر عربی کے چہرے ہیں نہ بانگس کی باتیں نہ علم کی درس تدریس ہے اور نہ فنون کی ترقیان۔ اب وہاں صرف بعض اوقات مذہبی جہاد کرنے والوں کی مخزنانہ آوازیں گونجتی ہیں بعض اوقات ہولناک عداوتیں پولیکل معاملات پر اٹھنے والی سنائی دیتی ہیں۔ دیکھ سچی نے ان مسلمان اندلوں کی اولاد کو بیا بان میں ۱۱۱۱

والا کرام کی حمد و ثنا کی جس نے اسے اتنی بڑی فتح عنایت فرمائی تھی۔ اباموہبیہ سے روانہ ہو کے سلطان محل شاہی کی طرف گیا وہی عالیشان محل جس میں قسطنطین اعظم سے لیکر اس وقت تک ایک سو باجبروت و سلطوت عیسائی تاجدار فرما زوائی کر چکے تھے اور جو تکلفات اور شان و شوکت کے اعتبار سے اپنا آپ ہی نفیر تھا۔ لیکن اب اس وقت اس میں نہ وہ ساز و تہ نہ وہ سامان برہنہ و طرہ سناتا تھا اور بالکل سسنا پڑا تھا۔ سلطان کے دل میں تغیرات و حوادث عام کے حسرت انگیز خیال نے ایک درد پیدا کر دیا اور اس وقت اس نے نہایت عبرت کے لہجہ میں اجدادِ مذہب یہ فارسی شعر پڑھا۔

پروہ داری نے کند بر قصر تمیز عنکبوت  
چرخِ نوبت نے ز نذر گنبد افراسیاب

تفسیر: جلالِ وطن اور کمالِ نکال دیا خوب صورت اسپین کے برابر وہ سیات کو چوس لیا اور اس کو ذہنی و اخلاقی خرابات کا مراد بنا دیا۔ سید امیہ علی۔ لائف آف محمد صفحہ ۳۴۴

دور اپر کا انٹیکویل ڈوپلینٹ آف یورپ (جلد ۲ صفحہ ۲۲) ۱۰۰ ایکو مسلمانوں سے ملیں  
لڑائیوں میں عیسائی مجاہدین کے برتاؤ کا مقابلہ کرو۔ وہ لکھتا ہے ”جب خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں میں یردِ شلم کو لیا تو وہ گھوڑے پر اسقف سطر و نیس کے ہمراہ اسکے قدیم عمارت کے متعلق باتیں کرتے ہوئے شہر میں گئے نماز کے وقت سرکشن کے آگے میں جہاں وہ اتفاقاً اس وقت سے عبادت کرنے سے اونہوں نے انکار کیا بلکہ قسطنطین کے گرجہ کے زینہ پر نماز پڑھی۔ انہوں نے اسقف سے کہا ”اے بیٹے کو اگر میں نے ایسا کیا ہوتا تو شاید مسلمان آئندہ زمانہ میں اس معاہدہ کو سیر می مثال کی پیروی کے حیلہ سے توڑ دالتے۔“ لیکن جب عیسائی مجاہدین نے اسپر تیفہ کیا تو فرد سال خون کے ہیچے دیواروں سے ٹکر کے ہار ڈالے گئے۔ دودھ پیتے بچہ فیلون پر ہینکے دیے گئے۔ جوان لگ میں ہوں ڈالے گئے بعض کے پیٹ ہار ڈالے گئے یہ دیکھنے کو کہ گلیں سونا تو نہیں لگائے ہیں یہودی اپنے معبود نہیں بند کر کے جلا دیے گئے۔ تقریباً ستر ہزار آدمی قتل ہوئے اور پوچھا نابان سٹاب کے کامو نہیں شریک دکھائی دیتا تھا۔“

یہ قصہ دیکھ کے فتح محمد سلطان کو ہنستا ہوا غلغلین پھیلے وارش تختِ روم کا خیال آیا اور اس نے دریافت کیا کہ وہ کہاں ہے اور اس پر کیا گزری آیا وہ یہاں کب رہا ہو کر رہا۔ ہو گیا یا لڑائی میں مارا گیا۔ مگر وہ جان نثار یون نے بہت ہی جلد سلطان کے تعلق خاطر کو رفع کر دیا اور اس کے مذکورہ خیالوں کا فیصلہ کر دیا۔ اور نہین و مرون نے شہنشاہ کو قتل کیا تھا اور اب اس کا گزری کی عزت اور انعام و اکرام کے ساتھ ہی ہوئے۔ نقشین نے انبار سہائے گئے تو ادن کے نتیجے میں مفتول کی لاش آمد ہوئی۔ اسکے جو تہ پر جو سنہرہ عقاب بناتا تھا اس سے لوگوں نے اسکا پہچانا اور میسایون نے اس کی تصدیق کی بے شک یہ صحیح قیاس ہے کہ سلطان کو اس کی لاش دیکھ کے بڑا افسوس معلوم ہوا۔ اس لیے کہ اس نے اپنے لاش کی لاش کو باغزار تمام دفن کرایا۔ خصوصاً اس بنا پر کہ شہنشاہ کے قتل کے بعد جب سب سے بڑے مرتبہ کا شخص ڈیوک لیکس نو مار اس مرحوم دولت روم کا وزیر اعظم سلطان کے سامنے حاضر ہوا اور جب اس نے اپنا جسم و مال و متاعِ پائے تخت کے نظر کرنا چاہا تو سلطان نے نہایت ہی نفرت کے تیوروں سے پوچھا کہ اس خزانہ کو تم نے اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کی حفاظت میں کیوں نہ صرف کیا؟ تسلطیہ کی موجودہ حالت نے سلطان محمد کے دل پر بہت بڑا اثر کیا اور اس کو اہل شہر کی معیبتوں کا خیال کرتے ہی دل میں ایک چوٹ لگتی تھی۔ یہ تو جانتا تھا کہ ان تباہیوں کا بانی وہ خود ہے لہذا اب اس نے اس بات کی کوشش شروع کی کہ یہاں تک ہو سکے ان ظلموں کا حادضہ کرے اور اپنی بڑی رحمدلی کے ساتھ اہل شہر اور شاہی خاندان کی ہمدردی پر آمادہ ہو گیا۔ وہ شہنشاہ کی بی بی سے ملنے گیا جو ایک سمہ شہزادی تھی۔ بیماری اور غم نے اسکا حال نہاہ کر رکھا تھا اس کے معصا پر سلطان نے اپنا افسوس ظاہر کیا اور اسے بہت تسکین دی۔ تشریف آئیں کہلیات کے اور نہایت ہی انسانیت باک فرزند ادب سے پیش آیا۔ اسی طرح کی عنایت اس نے دیگر اہل کین سلطنت کے ساتھ ہی کین اور اپنی منسوب رعایا سے ایک دوست یا ایک شفیق باپ بننے کا وعدہ کیا۔ اس نے زیادہ تر مسند پر عمارتیں

نصارا اسی کے لیے چھوڑ دیں اور سب سے بڑا ثبوت یہ رہی کہ اس نے  
 توہم اور دام پر خود اُن کے مذہب کے مطابق لطریق متذکیہ اور عداوت بطریق قیام  
 کے تدبیر دستور کے مطابق اور سکومت فرمایا۔ خود اس نے اپنی حبیب خاص سے  
 روپیہ سے یونانی قیادیوں کی ایک تعداد کثیر جان ناریوں سے مول لے کے آزاد  
 کر دی۔ اور مقام فنار اون کو رہنے کے واسطے دیا۔ جنویر غلامہ میں ہے اور  
 اون سے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی گئی پانچ ہزار خندان سلطان کے ایشیائی  
 صوبوں سے چنے گئے اور ستمبر کے آخر تک ان کو اس نئے مفتوح شہر میں بسایا  
 کا حکم ہوا۔ الغرض یہ کارروائیاں تھیں جو اس سلطان کے ہاتھ سے ظاہر ہوئیں  
 جس کو عیسائی مورخ ہمیشہ "ظالم" "بے رحم" "دو نیم وحشی" وغیرہ خطاب دیا  
 کرتے ہیں جب خود اُن سے کوئی جواب نہ بن پڑے گا جب پوچھا جائے گا  
 کہ سلطان نے تو خیر بدو فتح اہل قسطنطنیہ کے ساتھ اتنا سادہ کیا ہی تھا اور  
 کیا سلوک کیا گیا مسلمانوں سے جب اُن پر غلامہ میں تلوار بن ملنے میں تھیں  
 جب اُن کا بیت المقدس میں قتل مامور تھا اور جب کرو۔ یزدو نوں نے اُن کے  
 بچوں کو ٹپاک ٹپاک کے مارا تھا۔

اس طرح قسطنطنیہ اپنی تعمیر کے گیارہ سو تیس برس بعد مسلمانوں کے  
 ہاتھ سے فتح ہوا۔ اور پورے ہوئی یہ پیشین گوئی جو بانی اسلام نے (روحی فداک  
 یا رسول اللہ کی زبان فیض ترجمان سے ماڑت سات سو برس پیشتر ظاہر  
 ہوئی تھی۔

اس ممتاز اور حیرت انگیز فتح کی خبر جب دنیا میں پہلی تو ساری دنیا کے  
 بادشاہ سلطان محمد سے خوت کہا نے لکھے خدیو مصر تاجدار نجم اور سلطان  
 ارض مغرب نے مبارکباد و تہنیت کے خط لکھے۔ ایک باخداہد مسلمان مورخ لکھتا  
 ہے "اس میں شک نہیں کہ یہ بہت بڑی اور عظیم الشان فتح تھی۔ خلفا اور  
 بادشاہوں میں سے کتنے گزرے ہیں جنہوں نے اس شہر کی فتح کی آرزو  
 میں محنتیں صرف کیں سرگرمیاں دکھائیں۔ اپنی دولت غارت کی اپنی اور اپنی  
 فوج کی عمریں صرف کیں مگر مقصد کو نہ پہونچا تھا نہ پہونچے۔ اللہ نے یہ آرزو

## سلطان محمد ثانی اور طغیان کی فتح

سترہ ماہ جولائی ۱۹۳۲ء

سلطان محمد ثانی کے لیے اڑھار رکھی تھی اس لیے کہ اس کی نیت خالص تھی اور اس کے اخلاق اچھے تھے۔ کسی نے کیا خوب تاریخ لکھی ہے :-

”رام امرالفتح قوم اولون

جائزہ بالنفس قوم آخرون“

امرتح کی آرزو اگلی قوموں نے کی اور فتح کی مراد کو بچلے ہوئے آخرون کا لفظ مادہ تاریخ ہے جس سے ۱۵۷۷ء نکلتے ہیں بعضوں نے اس کی تاریخ ”بلدہ طیبہ“ لکھی ہے اگرچہ تاریخ کہنے والوں اور شعرا کی تحقیق میں سمجھی جاتی ہے مگر بعضوں کے نزدیک جائز ہے۔

فتح کے تیسرے دن سلطان محمد نے شیخ العصر شیخ شمس الدین سے عرض کیا کہ اپنے انکشاف باطن کی قوت سے مجھے اس تربت پاک کی زیارت کرادیجیے جس میں ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہ آرام فرما رہے ہیں۔ شیخ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اس شہر میں ایک طرف ایک نور دیکھا ہے کیا عجب کہ اون کا روضہ سطر اس ہی مقام پر ہو۔ یہ فرما کے شیخ ممدوح اس مقام پر آئے کچھ دیر عالم مراقبہ میں متفرق رہے پھر سر اٹھا کے فرمایا ”میں ابوالیوب رضی اللہ عنہ کی روح سے

دراگین نے اپنی ”دکلائن اینڈ فال“ کے باب ۵۲ صفحہ ۹۲۴ اور باب ۶۸ صفحہ ۱۱۸۲ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔



ملاؤ انہوں نے مجھے اس فتح پر مبارکباد دی اور فرمایا اللہ جل شانہ نے تمہاری سب مشکور کی کہ تم نے میری قبرؑ کے قریب سے کفر کی تمام ظلماتیں اور اس کی سببتیں دفع کیں۔ یہ خبر فوراً سلطان کو معلوم ہوئی وہ خود ذوق و شوق سے دوڑا ہوا اس مقام پر آیا اور عرض کیا: ”یا حضرت مجھے کوئی ایسی علامت دکھائیے جس کو میں نبی آنکھ سے بھی دیکھوں۔“ کسی بد فہمی کی وجہ سے نہیں ہے۔ ”لو کہیں لاطین و قلیس، تاکہ میرا دل کو اطمینان ہو جائے۔“ شیخ نے پھر مراقبہ کیا اور توڑی دیہ کے بعد سراوٹھا کے فرمایا اس مقام کو کہ دو یہ وہ مقام ہے جو ابوالوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر شریف سے سربانے کی طرف دو ہاتھ ہٹ کے ہے۔ اور یقین دہایا کہ یہاں پہ ایک سنگ مرمر کا ٹکڑا نکلے گا اس پر عبرانی حرفوں میں کچ لکھا ہوا ہے اور وہی اس جبل القدر صحابی کی قبر کا ثبوت دیدے گا۔ کہہ دو وہ سنگ مرمر برآمد ہوا۔ جو لوگ زبان عبرانی پڑھ سکتے تھے انہوں نے پڑھا اور پڑھتے ہی ظاہر ہوا کہ یہی قبر ابوالوب انصاری رضی اللہ عنہ کی ہے۔ شیخ کا یہ مکاشفہ دنیہ کے سلطان محمد پر ایک عالم وجد طاری ہوا۔ اور وہ اس قدر از خود رفتہ ہو گیا کہ لوگ پکڑ نہ لیتے تو بیشک گر ہی پڑا ہوا۔ خیر خوش میں آ کے سلطان نے حکم دیا کہ اس قبر پر ایک گنبد قائم کیا جائے اور اوس کے قریب ہی ایک جامع مسجد کی تعمیر کا حکم دیا جب وہ تیار ہو گئی تو بڑے جلوس اور شان و شوکت سے وہ اس معبد الہی میں گیا اور نماز ادا کی بعد نماز شیخ شمس الدین نے سلطان محمد کے ہاتھ میں تلوار دی اور اسی وقت سے یہ دستور ہو گیا کہ جو سلطان تخت نشین ہوتا ہے وہ اسی جامع میں جو جامع ابوب کے نام سے مشہور ہے جا کے اپنے وقت کے شیخ الاسلام کی محبت کی ہوئی تلوار کریم باندھتا ہے اور یونہیں سلاطین ترک کی تخت نشینی ہوا کرتی ہے۔ یہ رسم شاہان انصاری کی ”کار و نونہ شن“ (تاج پوشی) کے تمام پر ہے۔ اس وقت سے سلطان نے قسطنطنیہ کو اپنا مستقر خلافت قرار دیا اور

✽ حضرت ابوالوب انصاری قسطنطنیہ کے پہلے حاکم میں جو خلیفہ معاویہ بن ابی سفیان کے عہد میں

ہوا تائید ہوئے تھے۔ دیکھو گین باب ۵۲ صفحہ ۹۲۷

دیگر ممالک کی فتح میں مشغول ہو گیا۔ اس نے ہستیاء کے بادشاہ کو زیر کر کے سرودہ اور  
ہوسینیا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا لیکن تاہم وہ شمال میں اپنی سرحد شاہنشاہی  
کو زیادہ اور وسعت نہ دے سکا اس نے لجاٹیکا کو محاصرہ کیا۔ جان ہینڈی اس  
وقت تک زندہ تھا اس سے اور جان کپٹن نے مع اپنے ساتھیہ امیلیسی جاپن  
کے مائین لڑا ۱۰۰۰-۶۔ اگست ۱۵۵۵ء کو ایک بہت سخت لڑائی ہوئی اور فلاح  
آسٹریلیا کو اس حملہ آور سی رہی ہوئے محاصرہ سے مدت بردار ہونا پڑا۔ ہمدی  
ہی نہیں ہوا تھا مگر وہ ایسا زخمی ہوا کہ چرچات نہ ملی زخمی ہونے کے بیس ہی دن  
بعد اپنے بیٹے کو اپنا قائم مقام بنا کے مر گیا۔

الہانیا میں بھی ابتداً سخت مصیبتیں درپیش آئیں کیونکہ اپاٹرس میں ایک  
بگبڑ بیٹریٹ پیدا ہوا تھا جو ہینڈی سے کسی بات میں کمرہ نہ تھا۔ یہ شخص اپاٹرس  
کے شاہی خاندان سے تھا اور اس کا اصل نام جیارج کیسٹر ٹوٹا تھا۔ اپنے بچپن کے  
مائلے میں وہ مزدور کے دربار میں ہوٹیج (کفیل) کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ دربار  
میں پہنچ کے اپنی بہت دعاوی و داعی پر سلطان کی بے حد عنایتیں مہذول  
دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا اور حقیقت اس کے اسلام لانے سے سلطان  
اس کا خوش ہوا تھا کہ اسے اپنے بیٹوں کے برابر سمجھتا تھا۔ اور اس کا نتیجہ ہوا  
کہ وہ اسے فوج کا ایک اعلیٰ عہدہ دار کر دیا اب وہ سکندر بیگ کے نام  
سے مشہور ہوا۔

اگر یہ سکندر بیگ پر سلطان انواع واقسام کی عنایتیں کرتا رہا۔ اس کو فوج کا  
امیر کر کے ایشیائین بھیجا۔ منگری کے مقابلہ میں جو فوج آئی اس میں بھی یہ اعلیٰ  
افسر رہا۔ مگر اس کو رنک نے احسان فراموشی کی۔ فوج کا ساتھ چھوڑ دیا اور غائب  
سے کر دیا (اپاٹرس کا ایک شہر ہے) پر قبضہ کر لیا۔ اس نے سلطان کے سکریٹری  
کو بڑا لیا اور اس سے سلطان کے نام سے گورنر کر دیا کے نام اس مضمون کا ایک  
حکمنامہ لکھوایا تھا کہ شہر اس کے سپرد کر دیا جائے۔ اور اس کے بعد اس کیس بیگ  
سکریٹری کو بڑی بے رحمی سے قتل کر ڈالا تاکہ راز افشا نہ ہونے پائے۔ گورنر  
کو ان باتوں کی خبر نہ تھی اس نے کنجیان سکندر بیگ کے حوالہ کر دیں۔ اس نے

قبضہ پاتے ہی فوراً ترکون کو شہید کرنا شروع کیا۔ اسلام سے مرتد ہو گیا اور تمام اباٹس والوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ مراد کے باقی ماندہ عہد میں سکندر بیگ اباٹس کے پہاڑوں پر قابض رہا اور اوہر کا۔ استہ بند کر دیا۔ داد نے تین مرتبہ بیدنی سے مخفی فریبین اس کے لیے روانہ کیں مگر قبضوں مرتبہ شکست ہوئی۔ اس اثنا میں سلطان کو مرض الموت لاحق ہو گیا۔ اور مدت نے ارادوں کو تمام کر گیا۔ چہرہ سلطان محمد ثانی تخت پر بیٹھا تو اسکو یہی اپنے لڑکپن کی دوستی اور محبت کے خیال نے سرگرمی کے ساتھ سکندر بیگ کے قلعہ قمع پر آمادہ نہ ہونے دیا یہ یقین ہے کہ اگر سکندر بیگ کو خراج دینے پر رضی ہو جاتا تو سلطان ضرور بطور کر لیتا اور اس سے فراحت نہ کرتا۔ مگر اباٹس والوں نے خراج دنیا کو کیسا اولٹے اور عقدہ دیا اور تہلی پر لوٹ مار شروع کر دی۔ مگر سلطان کو سکندر بیگ سے کچھ ایسی ہمدردی تھی کہ اس نے پہر ہی جو کاسہ دانی کی وہ ہی تھی کہ سلطان بین ایک عہد نامہ کی رو سے سکندر بیگ کو اباٹس اور البانیا کا امیر تسلیم کر لیا۔ چہ برس بعد سکندر بیگ مر گیا اب کس کی مروت باقی تھی فوراً نو بھین روانہ ہوئیں اور باسانی البانیا کا الحاق کر لیا گیا۔

سلطان نے ایک سلسلہ فتوحات کے بعد یونان کو بھی اپنے قلمرو میں شامل کر لیا۔ وینیٹیا کی سلطنت جمہوری کی وجہ سے کسی قدر وقتیں پیش آئیں مگر آخر کار بالکل تسلط ہو گیا۔ موریا (سپارٹا) میں انتہا کی بد انتظامی تھی لوگ آپس میں لڑتے مرنے لگے اور ڈسٹرکٹس (بالانوع) کے سبھما لے انتظام نہیں سہلوتا تھا لہذا ۱۸۲۱ء میں سلطان نے خلق خدا پر ترس کہا کہ اسکو بھی بعد فتح داخل ملک محروسہ کیا۔ ڈسٹرکٹس نے براہ خوشامد اپنی نازنین اور پرہی جمال بیٹی سلطان عالی شان کے نذر کی۔ یون سلطان کی مہربانی حاصل کر کے اور نہ میں آیا اور ایک پولیشکل منشیہ کی حیثیت سے باغ از تمام رہنے لگا۔ اس سال سلطان نے ٹرینبرانڈ کو جو اس ماہ میں ایک خود مختار ریاست کی حیثیت رکھتا تھا اور یونان کے کامنیتی خاندان کا ایک شخص شہنشاہ کے لقب سے اس پر حکمران تھا اس کو بھی فتح کر لیا۔ اور وہاں کے شہنشاہ اور اس کے خاندان کو رومانیہ کا ایک قلعہ رہنے کے لیے دیا گیا۔

مگر قسمت ہی تھی اپنی فساد انگیز طبعیت کو کیا کرتے بیٹھے بیٹھے ان بزرگ نے اپنی  
 بیماری کے لیے یہ مہیب شغل اختیار کیا کہ شاہ ایران سے خط و کتابت شروع  
 کی اور اپنے تئیں بغاوت کا مرتکب ثابت کر دیا جس کے بعد مرمم سلطانی کے ہی  
 آپ تخت نہ رہے۔ اور آخر اپنی سزا کو چونچے۔ ۱۹۷۸ء میں کرمیہ فتح ہوا اب  
 سلطان کا ارادہ تھا کہ اٹالیہ کو فتح کر کے روم کی مغربی سلطنت کا ہی خاتمہ کر دے  
 اور اسی سلسلہ میں ۱۹۷۹ء میں مغربی سلطنت جمہوریہ کو سقوط ۱۱ دیکر مقامات  
 درست رہا رہا پڑا۔ ۱۹۷۹ء میں خیرہ رومس پر حملہ ہوا۔ مگر ناکامی ہوئی جس کے  
 بعد سلطان کا قصد تھا کہ سال آئندہ بذات خود حملہ کر کے اس کو فتح کرے اور بے شک  
 اگر اس کی زندگی نہ ختم ہو تو وہ فتح کر لیتا۔ اسی ۱۹۷۹ء میں آٹریلیو فتح ہوا اور شاہ ایران  
 کو ایک مرتبہ سے زیادہ رک ملی۔ آٹریلیو کی فتح سے اٹالیہ میں ایک تہلکہ مچ گیا اور  
 ہوا۔ ال پر ایسا عجیب فوجت بیٹھ گیا کہ خود پوپ سکسٹس چہارم باوجود اقدس و مرجعیت  
 سالہ کے کوہ آہلہ کے اس پار بھاگنے کو آمادہ اور تیار بیٹھا تھا۔ لیکن یہ فتح ترکوں  
 کیے نامناسب میں نہ تھی اس سلطان غازی کی زندگی کے دن پورے ہوئے  
 تھے۔ دوہ سے سال سلطان غازی محمد خان ثانی ایک بہت بڑی فوج تیار کر  
 پاتا لیکن ہر امر کہ کس ملک پر چڑھائی کا قصد ہے ایک ایسا راز تھا جس کی سوا اس  
 کے اور کسی کو خبر نہ تھی۔ امیدیں ایسی بلند و ازیان کر ہی تھیں کہ دفعتاً پیغام اجل  
 آگیا اور ۲۰ مئی ۱۹۷۹ء کو وہ تمام جہینا میں رہ نور و عالم بالا اور سند نشین باغ فردوس  
 ہوا۔ خدا غری رحمت کرے۔

اس باجروت سلطان کی نقش کو لوگ قسطنطنیہ میں لے گئے اور اسی اکھاڑ  
 میں بہان قدرت نے نامور سی والوالغزنی کے سب سے قیمتی اور سب سے زیادہ  
 بار اسکے گلے میں ڈالے تھے اور جسے خود اسکے قوی بازو اور گراں ہار گز نے فتح کیا تھا  
 وہیں اس کو آغوشِ لی کے سپرد کیا۔

مرحوم سلطان باعتبار جہاد کے سب سے بڑا اور بلحاظ حملہ آوری اور جفاکشی کے

سب قوی تھا۔ ہر امر میں خدا پر توکل کرنا اس میں دیگر سلاطین سے بہت زیادہ تھا۔ وہی ہے جس نے نسل عثمان کی سلطنت کو مضبوط کیا اور اودن کے لیے ایسے قوانین بنا دیے جو ہمیشہ زمانہ کے گلے میں اور سکے طوق غلامی کی طرح پڑے رہیں اس کے اوصاف بہت زیادہ ہیں اور روز و شب کے صفات پر اس کے کارنامہ مکمل ہوئے ہیں جن کا رفتار زمانہ ہرگز نہ مٹا سکے گی۔

جب اس کے انتقال کی خبر شہور ہوئی تو ماری عیسائی دنیا نے گہی کے چراغ جلائے۔ روم نے اپنی رہائی کی خوشی میں تین دن تک جشن کیا۔ سٹریٹس لین پول لکھتے ہیں ”یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر ایک سال وہ اور زندہ رہتا تو کیا ہوتا۔ آریٹمیٹو کی فتح کے بعد روم کی تباہی آتی۔ تاریخ کی اوت نے یورپ کو بچا لیا۔“

فاریح قسطنطنیہ ایک پستہ قد اور قوی الجشہ شخص تھا۔ جسمانی قوت اس کی مشہور تھی اور تیر اندازی میں بے بدل تھا۔ رنگ گندمگون مائل بہ زردی تھا اور چہرہ پر معمولاً حزن کے آثار نمودار رہا کرتے تھے۔ ناک بڑی اور طوٹنے کی مستحکم کی طرح خمدار تھی۔ آنکھیں بہت تیز تھیں اور اودن میں حلقہ پڑے رہتے تھے۔ سلفان محمد میں جہان بانی کے بہت سے اوصاف تھے۔ اس نے قوانین جاری کیے۔ اور اپنے عہد کا بلکہ اپنے خاندان کے اگلے اور پچھلے فرمانرواؤں میں ایک مقنن تھا۔ رعایا پر انصاف ہونے کے اصول کو اس نے بہت ترقی دی۔ تافھیون اور افسرون پر بے انصافی کا ثبوت پا کے سخت آشدہ کرتا تھا اور قریب قریب سب کو اپنے اپنے فرائض منصبی ایمان داری کے ساتھ ادا کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ چورسی اور ڈاکہ زنی اس کے زمانہ میں عنقا ہو گئی تھیں اور رعایا نہایت منہ الحال تھی۔

خود اس کی دماغی قابلیت نہایت اعلیٰ تھی اور علمی ذوق تو تھا ہی وہ ایک طالب علمانہ ذوق رکھتا تھا۔ علما و فضلا کی صحبت کا بڑا شائق تھا عربی۔ ترکی۔ فارسی۔ یونانی اور لاطینی زبانیں خوب اچھی طرح جانتا تھا ان پانچوں زبانوں میں جس بے کلفی کے ساتھ گفتگو کر سکتا تھا اسی کے

سے ان کو لکھ ہی سکتا تھا۔ نظم سے اس کو کمال ذوق تھا۔ خود ہی شعر کہتا تھا۔  
تیس ترکی شاعر اس ترکی مکیناٹس کی حبیب خاص سے تنخواہیں پاتے تھے۔  
ملا جامی اس کے عہد میں زندہ تھے۔ سلطان ان کو ہر سال نذر بھیجا کرتا تھا۔  
جامی نے اس کی تعریف میں ایک قصیدہ ہی کہا ہے جس کا مطلع ہے۔  
کم کے ہر سر یہ جاہ و جہد ال  
چون تو کرد کتاب فضل و کمال

اس کی فیاضی سے بہت سے کالج ساجد اور خانقہ بین بنکے لیبار ہو گئیں۔  
از انجملہ سرت قسطنطنیہ میں ابو فتح آٹھ مدرسہ قائم کئے تھے جن کے مدرس اسی  
مازے اعلیٰ درجہ کے اہل کمال خیال کیے جاتے تھے اور بڑے بڑے  
وزیر پاتے تھے۔ اس کے اُمراء سے بھی اکثر اوس کی ایسی فیاضیاں ظاہر  
ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک محمود پاشا فاتح نگر دہانٹ ہے جو خود شاعر  
ہی تھا اور ایک اعلیٰ مدرسہ کا بانی تھا۔

سلطان محمد کو علم تاریخ میں خوب دخل تھا خصوصاً سکندر اعظم۔ جولین  
اور ایسے ہی دیگر ناموروں کی سوانح عمریان اس کے نوک زبان پر تھیں۔ اور ان  
سوانح عمریوں کو اس نے اپنی زندگی کا نمونہ قرار دیا تھا۔ اس کا ذاتی ہتھیار  
جنرلوں اور فاتحوں کی فہرست میں اعلیٰ درجہ پر ہے۔ اس کا یہ مشہور مقولہ  
”اگر میری داڑھی کا ایک بال ہی اس سے واقف ہو جائے تو میں اسکو  
اولہاڑ کے پینک دون“ اس شخص کے جواب میں جس نے پوچھا تھا  
کہ اطالیہ میں کیا ترتیب ہوگی اس کی اعلیٰ سپہ سالار سی کا شاہ ہے۔  
راز داری اور بجلی کی سی سرعت رفتار اس کے فتوحات کی گنیاں  
تھیں۔ ترکی مورخین اس کو محمد اعظم یا فاتح کے لقب سے یاد کرتے  
ہیں اور مغربی مصنف قسطنطنیہ کی فتح سے اس کو اور اس کے

ڈاکٹر گسٹس کا وزیر تھا۔ مشہور لاطینی شعر اور حل اور ہرپس کامری اور دوست تھا۔ یہ شخص اپنے  
زمانہ کے تمام مشہور مصنفوں کی سرپرستی کرتا تھا۔

جانشیون کو شہنشاہ کہتے ہیں۔

۱۔ اقم۔ ۲۔ محمد عبد الستار۔ ۳۔ لکھنؤ۔ ۴۔ فرنگی محل۔

## بکۃ اسلام میں

یہ امر اسی واقعہ پر مبنی ہے کہ اسلام میں سکھ کا رواج کیونکر اور کس وقت سے شروع ہوا حالانکہ اس کے جاننے کی بہت کچھ ضرورت ہے۔ عوام میں آپ کے متعلق طرح طرح کے خیالات پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ان غلط فہمیوں کے مٹانے کی بالکل کوشش نہیں کی گئی جو شرعی دینار و دہم کے نام سے عوام کے ذہن میں مرتکز ہیں۔ ابھی تک اس بات پر یقین کرنے والے کثرت سے موجود ہیں جو پار پار یہ روپیہ کو خافے راشدین کے عہد کا سکھ تصور کرتے ہیں۔ یورپ میں فی الحال یہ مذاق عام ہو گیا ہے کہ قدیم زمانوں سے سکھ ہمہ پہنچا پہنچا کے جمع کیے جاتے ہیں۔ ان کو شین کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ خافے بنی امیہ و عباسیہ و عبید میں مہر کے بعض سکھ ہاتھ آگئے لیکن اس امر پر بغیر تاریخی ثبوت کے یقین نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام میں سب سے پہلے کس عہد میں ٹکسال قائم ہوئی۔ اور کس ضرورت نے مسلمانوں کو اس پر آمادہ کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان فاتحوں نے جس وقت ممالک عالم کو زیر و فر کرنا شروع کیا اس وقت فتوحات کے خیال اور دہن میں وہ اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ بہت سی ضروری باتوں کی طرف ادنیٰ کا خیال ہی نہیں گیا۔ اور جب دنیا کا مرقع الٹ پلٹ کے اوسوں نے اپنی طرف دیکھا تو سمجھے کہ ہم کس قدر آگے بڑھ آئے ہیں اور ہمیں کیا کیا کرنا تھا جس کی طرف ہمارے توجہ مبذول ہی نہیں ہوئی۔ اگرچہ اس بے پروائی کا زیادہ تر باعث اونی کا جوش جہاد تھا مگر عرب کی سادگی اور ان کی بدویانہ صحرائی زندگی جبکہ تمدن سے بہت کم لگاؤ تھا زیادہ تر اسکی معین ہوئی انہیں اسباب نے جہان اونی سے اور بہت سے امور نظر انداز کر دیے وہ انکو سکھ کی طرف بھی متوجہ نہ ہونے دیا۔

جاہلیت میں عرب کے ایک کوسنے کو روم سے اور ایک کوسنے کو ایران سے قلعہ تھا۔ ان تعلقات کی وجہ سے عرب کے شہروں میں عموماً ایرانی اور رومی سکون کارواج تھا۔ کچھ سکھ لوگ حمیر نے بھی عرب میں ایام جاہلیت میں بنائے تھے جو اونہیں اونہی سکون میں ملے ہوئے ابھی لفظ آچایا کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم کے بعد چار دان خلافت ہا راشہ گذشتہ ہیں۔ جناب امام حسن علیہ السلام نے خلافت سے دست بردار ہو کر امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ معاویہ کا دور بھی ابتدائی شان و شکوہ دکھائے آخر ہو گیا۔ یزید کی سلطنت دور بھی وہی رہی پیداکر کے ختم ہوئی۔ مروان خلیفہ ہوا اور مرہب گیا۔ یسبگ گیا اور سکھ وہی رومی ایرانی اور حمیری مروج تھے۔

ہر اون سکون میں بھی یہ خرابی تھی کہ اس قدر مختلف اوزان اور قیمت کے تھے کہ تجارت کاروبار اور خصوصاً بیت المال کا انتظام روز بروز اوجھڑتا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو سفر و فتنہ کوہ و صدقات کے ادا کرنے میں وقت لاحق ہوئی تو جناب عمر فاروق کو مجبوراً جو انتظام کرنا پڑا کہ شیعہ اغراض کے واسطے اون تمام سکون میں سے ایک خاص سکھ مقرر کر دیا جو قیمت میں سب سے متوسط اور صحت میں سب سے زیادہ مروج تھا۔ لیکن اس پر بھی ٹھیک انتظام نہ ہو سکا اس لیے کہ اکثر لوگوں نے کوٹے سکھ بنانا کے ملک میں پھیلا دیے جن کی وجہ سے خزانہ خلافت کو معمولاً نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ اور مروجہ سکھ اس قیمت سے بدرجہا زیادہ لٹتے جاتے تھے جس پر کہیں سے تھے۔ ان وقتوں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے آخر یہ نتیجہ ہوا کہ عرب میں سکھ کی کچھ قیمت نہیں باقی رہی تھی جو کچھ قیمت تھی سوئے چاندی کی۔ بلکہ قریب قریب سونا چاندی ہی وہاں کا سکھ بن گئے تھے۔ اور سوئے چاندی ہی کے پرکشش پر مروجہ سکھ کی قیمت قائم کی جاتی تھی۔

بعض مورخین کہتے ہیں کہ انہیں مشکون سے عاجز ہو کر عبد اللہ بن زبیر کے چند روزہ خلافت میں اولاً۔ کہے بہائی معصوب بن زبیر کے حکم سے حارث بن عبد اللہ

۱۔ دیکھو فتوح البلدان بلاذری۔

۲۔ دیکھو مقدمہ ابن خلدون

۳۔ دیکھو فتوح البلدان۔



بن ابی ربیع مخزومی نے منہ ۷۰۰ سال سکھ بنانا شروع کر دیے۔ یہ سکھ بالکل ایرانی سکون کی وضع پر بنائے گئے تھے فرق اتنا تھا کہ اولن پر الفاظ مدبرکتہ اور اللہ بڑا دیے گئے تھے۔ مگر عام موحین اور کل محققین کو عبد اللہ بن زبیر کے عہد میں سکھ بننے سے انکار ہے۔ حیرت ہے کہ ناسخ التواریخ میں لکھا گیا ہے کہ لکھنؤ خلافت جناب فاروق اکبرین اسلامی سکھ کے دور ہم و دنیا مروج ہوئے بن زبیر سے بعض پر لا الہ الا اللہ بعض پر الحمد للہ بعض پر قل ہو اللہ احد اور بعض پر اور پر اللہ اور اس کے نیچے جناب عمر کا نام منقوش تھا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس بیان کے صحیح ہونے کا کمان ہی گریہ تو کیونکر۔ افسوس ہے کہ ناسخ التواریخ جس قدر مبدوط لکھی گئی ہے اسی قدر جمعہ آیات میں بے احتیاطی سے کام لیا گیا ہے۔ حضرت عمر کے عہد میں سکھ بننا بالکل بے اصل ہے اگر کسی قدر اس کی اصلیت ہو سکتی ہے تو اس قدر کہ ان کے عہد عدلت محمد میں ایک سرود سکھ مروج تھا جس کا نام آخر میں بغلیہ ہو گیا۔ بغلیہ اس لیے کہ اس پر ایک جانب خچر کا سر بنایا تھا اور دوسری طرف کسری کی تصویر مع اس کے تخت کے تھی۔ اور تخت کے نیچے لکھا تھا "نوش خور" (یعنی خوشی کے ساتھ نوش کر) اس بیان کی نسبت اول تو یہی نہیں کہا جاسکتا کہ کمان تک قابل اعتبار ہے اور اگر مان ہی لیا جاسے تو اس کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے کہ جناب فاروق کے حکم سے بنا۔ پہرہ ہی نہیں سمجھ میں آتا کہ اس خچر کی صورت کیون بنائی گئی تھی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بغلیہ نام کا ایک سکھ خلافت راشدہ کے زمانہ سے بنی امیہ کے دور تک دنیا سے اسلام میں مروج تھا جس بات پر تمام موحین کو اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں ترویج سکھ کے فخر کا متعلق عبد اللہ بن مروان ہے جو بنی امیہ میں سب سے زیادہ نامور خلیفہ اور دولت مروانی کا دوسرا تاجدار ہے۔

ترویج سکھ کا تفصیلی حال ہارون رشید نے اپنے دربار میں ایک موقع پر سنی نحوی سے بیان کیا تھا جو بمقابلہ دیگر بیانوں کے زیادہ واضح ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ

ایک مرتبہ نوح و عیسیٰ دربارِ پتھر گرنے کے لیے رشید کے سامنے توڑے لاکے رکھ گئے۔ ایک نیلی پٹی اوس میں سے ایک دینار نکل کے باہر گر پڑا۔ اس کے متوجع ہونے پر اوس کے بولے تھے: "اور حرف نہایت واضح طور پر پڑے جاسکتے تھے۔ رشید نے اوس دینار کو نہانہ کے اوٹھا لیا اور اُلٹ پلٹ کے اوس کے نقوش کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ کہتے رکھتے کہ "کی کی طرف جو حاضر دربار تھے متوجہ ہو کے کہنا: "جاستے ہو یہ س عہد میں یہ سے تے بہ کسانے۔" نے عرض کیا: "جی ہاں عبد الملک بن مروان کے عہد میں رشید نے پوچھا: "اور یہی بیان تے ہوا ان کے بنے کا سبب کیا تھا؟" کسانے نے کہا: "نہیں مجھے اس کی خبر نہیں" تب رشید نے یہ واقعہ بیان کیا کہ وہ ہم دینار عبد الملک کے عہد تک میں بنائے گئے تھے۔ عرب میں ایذنی درہم ہوا اور رومی دیناروں کا رواج تھا۔ عبد الملک نے جو ایک بیک تک سال کا علم کر دی اس کی وجہ یہ ہوئی کہ فرات میں وہ نہ لکھنے میں جو کاغذ کام آتے تھے وہ مسر میں بنائے جاتے تھے۔ (یہ گویا ایک قسم کے نام نہ تھے جو بنے بنائے ملا کرتے تھے) بننے والے حسب رواج قدیم اون کی پیشانی پر اظہارِ تجارت کے، دس زبان میں کچھ الفاظ لکھ دیا کرتے تھے۔ یہی الفاظ مصر کے بنے ہوئے حریر کے تھانوں اور ظروف وغیرہ پر لگتے ہوتے تھے۔ اسلام میں بعد فتح مصر میں ان الفاظ کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور نہ یہ پوچھا گیا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ عبد الملک ایک عجیب و غریب شخصیت کا خلیفہ تھا۔ فرمان کے اون فارمون میں سے اتفاقاً ایک اس کی نظر سے جو گذرا تو اوس نے اپنے ترجم سے پوچھا یہ کیا لکھا ہے؟ ترجم نے کہا: "ماپ بیا روح القدس" اتنا سنتے ہی عبد الملک سنائے میں آگیا اور پھر بلایہ کلمہ کفر آج تک مروج چلا آیا۔ اور حیرت ہے کہ کسی کا خیال اس کی طرف نہ گیا۔ اس کے بعد اوس نے فوراً اپنے بہائی عبدالغزیز بن مروان کو جو دلی مصر تھا منکھا۔ مصر کے تمام کارگردان کو حکم دیدیا جائے کہ آئندہ سے تمام فارمون کی پیشانیوں تھانوں اور ظروف پر ان الفاظ کی جگہ کلمہ توحید "شہدا اللہ ان لا الہ الا وہ" لکھا کریں۔ اور منادی کر دی جائے کہ جو کوئی اس کے خلاف کرے گا خستہ نہ پائیگا۔ اس حکم پر فوراً عمل درآمد ہو گیا۔ اس عہد کے بنے ہوئے بعض فارم نصیر روم (جسٹینین دوم) کی نظر سے جو گذرے تو اوس سے نہایت ناگوار ہوا۔ قیصر نے

سب سے قیمتی ہدایا کے ساتھ عبدالملک کے دربار میں ایک سفارت بھیجی اور خط میں یہ مضمون لکھا کہ ان الفاظ کا رواج تمام گزشتہ خلفاء کے عہد سے چلا آتا ہے یا تو وہ سب غلطی پر تھے اور یا آپ غلطی پر ہیں۔ مجھ بتائیے کہ ان دونوں میں سے کون بات ہے۔ اس کے بعد درخواست کی تھی کہ اس ہدایا کو قبول فرمائیے اور ان کے معاوضہ میں اس رسم قدیم کو جاری رہنے دیجیے۔ عبدالملک کو اس خط پر بڑا غصہ آیا۔ مگر اس نے غصہ نہ کیا۔ سفارت مع ان ہدایا کے واپس کر دی اور خط کا کچھ جواب نہیں دیا۔ قیصر کی طرف سے وہ ہدایا دہانے کر دیے گئے اور پھر سفارت آئی کہ شاید یہ ہدایا آپ کی نظر میں کم اوترے۔ لہذا اب المضاعف کر کے روانہ کیے جاتے ہیں۔ مگر سفارت پر اسی طرح بے نیل مرام واپس گئی۔ تیسری مرتبہ قیصر نے ہدایا کو اور بڑھایا اور خط میں مذکورہ مضامین کے بعد لکھا بلکہ یوں کہنا چاہیے وہ بھی وہی کہ اگر اس رسم کے پھر جاری ہونے کا حکم نہ دیا جائے گا تو میں اپنے ہاں سکھ میں تمہارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام کے ساتھ ایسے الفاظ نقش کرادوں گا جو تم کو نہایت ناگوار ہوں گے۔ اور سو تمہارے بنائے کچھ نہ بنے گی اور وہ سکھ تمہارے وہاں گھر گھر میں اور ساری دنیا میں اسلام میں پھیل جائیں گے۔ یہ تم کو معلوم ہے کہ عرب اور سارے مسلمان ہمارے سکھ سے کام لینے پر مجبور ہیں۔ یہ وہ بھی عبدالملک بن مروان پر اثر کر گئی۔ وہ اچھا ہے زیادہ پریشان ہوا۔ اور گہرا کہہ ادا تھا اب کیا کیا جائے؟ اہل دربار نے شور مچایا کہ اس امر میں آپ خالد بن زید بن سواد سے رائے لین وہ کوئی نہ

عہ تمام مستند مورخوں کی رائے ہے کہ عبدالملک نے خالد بن زید کی ہدایت کے مطابق سکھ نہ لیا۔ خالد بن زید میں بہت بڑا عالم و فاضل اور گویا اسلام کا پہلا فیلسوف ہے۔ یہ زید بن سواد کا بیٹا تھا۔ مگر سب کے خلاف دوسری شائع نے بیعت کی جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد نہیں بلکہ امام محمد باقر رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے بموجب عبدالملک نے سکھ نہ لے۔ یہ روایت تمام مورخین کے بیان کے خلاف ہے اور اسی لیے ہم نے جمہور کے بیان کا متبع کیا۔ جو غریب قیاس ہے۔

کوئی تہ سبز کالین ہی گئے۔ خالد سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کوئی مصفا لقمہ نہیں آپ ایسے سکے خود بنا کے مروج مکر دیجیے اور ممانعت کر دیجیے کہ رومی سکون کا چلن تو مروج خلا کے اندر نہ باقی رہے۔ غرض اسی واسطے کے مطابق اسلامی سکون کے لیے جناب فاروق کے عین کیے ہوئے اوزان قائم کیے گئے۔ نکسال جاری ہوئی۔ سوربون اسلام کو مالک غیر سے سکون سے آزاد ہی حاصل ہوئی۔

اس واقعہ کی تصدیق کسی حد تک انگریزی مورخوں کے بیان سے ہی ہوتی ہے اون کا بیان ہے کہ ۱۹۷۱ء (۱۹۷۱ء) میں حسین دوم قیصر روم اور عبد الملک کے جمالی محمد بن مروان سے لڑائی ہوئی۔ محمد نے ابتداءً تو برابر دیون کو شکستیں دیں لیکن آخر صلح ہو گئی۔ اس صلح کے بعد ۱۹۷۱ء میں صدیقہ عبد الملک کی طرف سے قیصر کو شکستہ پاس ایک خط لکھا جس میں ایسے الفاظ تھے جن سے قیصر کو اپنی توہین کا گمان ہوا۔ اس نے وہ صلح توڑ دی اور اس کے ساتھ ہی عبد الملک کو دہلی دی کہ بن ایسے سکے مروج کر دیں گا جن پر اسلام کی توہین کے کلمات کندہ ہوں گے۔ اسلام میں اس وقت تک سکے نہیں جاری کیے گئے تھے۔ ایرانی (دوروی) سکون سے کام چلایا جاتا تھا۔ غرض اس وقت عبد الملک سکے بنوانے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس کے حکم سے تیار کیے ایک یودی شمیر نامے نے نکسال قائم کی۔

انگریزی مورخوں کا یہ عام قاعدہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد کی تمام تر قیوں کو کسی نہ کسی طریقہ سے حتی الامکان اپنی طرف اور نہیں تو کسی غیر قوم کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہذا سوس کی بات ہے کہ اس کوشش میں کبھی اپنی اسکانی قوت میں تنگ کے زبردستی اور غلط بیانی سے بھی کام لینے لگتے ہیں۔ سکے کی ایجاد جو شمیر کے نام کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے یہ بھی ایک اسی قسم کا واقعہ ہے۔ بعض قدیم تاریخوں سے تو اتنا البتہ معلوم ہوتا ہے کہ اون دنوں ایک قسم کے درہم یا دینار شمیر کے نام سے مشہور تھے۔ اور شمیر یہ اسی لیے کہلاتے تھے کہ اون کے بنانے والے کا نام سمیر تھا۔ مجرد اتنے بیان تک یہ

واقعہ بہم معلوم ہوتا ہے مگر علامہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں صاف کر کے کہہ دیا  
 جس کے بعد شہید کی بالکل گنجائش نہیں باقی رہتی۔ وہ سیکھ چوسی کے واقعات  
 میں بیان بعد الملک بن مروان کے حکم سے اسلامی سکے بنائے جانے کا واقعہ  
 بیان کرتے ہیں وہاں لکھتے ہیں کہ حجاج نے اپنے سکے مروج کرنے سے بعد ہی نما  
 کر دی کہ رعایا میں سے کوئی شخص سکے بنانے کی جرات نہ کرے۔ مگر اس حکم  
 کے خلاف سمیرنا نے ایک یہودی سکے زنی کے مجرم کا مرتکب ہوا۔ جب اسے  
 گرفتار کر کے حجاج کے سامنے لائے تو اس نے کہا "میرے بنائے ہوئے  
 سکے شہی سکے سے زیادہ خالص اور کمرے ہیں اور جب میں بے درہل  
 سکے بنائے انقصان کی جگہ رعایا کو فائدہ پہونچایا تو پہ آپ محبت کیون قتل کرنا  
 جاسکتے ہیں۔ حجاج نے اس کی اس حجت کو نہ مانا۔ اس میں شک نہیں کہ سمیر  
 ایک نہایت آدمی تھا اس نے عقیدہ ہی کی حالت میں تو لسنے کے لئے  
 ایجاب کی۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں دینار و درہم کی ضرب جیسے ہی غیر منظم  
 حالت میں تھے۔ مالک میں کوئی عام وزن نہیں قائم تھا۔ سمیر نے بڑے  
 بنائے حجاج کی خدمت میں پیش کیے اور رہائی کے لیے ملتجی ہوا مگر حجاج  
 نے اس پر ہی نہ مانا۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ سمیر کے بنائے ہوئے  
 بڑے مروج ہو گئے اور رعایا کو تاجسروں اور بازاروں کے غبن سے بہت  
 کچھ نجات مل گئی سمیر کی نسبت اس سے زیادہ بہ نہیں لگتا کہ حجاج کے قید  
 میں اس کا کیا حشر ہوا۔ غالباً قتل کیا گیا ہوگا۔ کاش اگر یہ کہا جاتا کہ سمیر نے  
 مسلمانوں کو بڑے بنا دیے تو ہمیں بے شک تسلیم کرنا پڑتا کہ دنیاوی انتظام  
 میں ایک حد تک خلافت اس کی زیر بار احسان تھی مگر یہ تو بالکل لغو ہے کہ  
 سمیر نے سکے بنادیا۔ یہ سکے سمیر کے نام سے مشہور تھے غالباً وہ وہی تھے جن کو  
 سمیر نے مجرمانہ طور پر بنا کے پہلا دیا تھا۔

ابن مرقسین اسلام نے پہلے پہل سکے بننے کا حال یوں لکھا ہے کہ عبدالملک

طقت سے جو خطوط قیصر کے پاس جاتے تھے ان کی پیشانی پر لکھا ہوتا تھا  
 "قلی بنی امیہ" اس کے بعد جو خطوط لکھا نام بہارک اور اس کے نیچے تاریخ لکھ جاتی  
 تھی قیصر کہ یہ ناگوار ہوا اس سے جو خطوط لکھا اس وضع کو چھوڑ دو ورنہ میں دیناروں  
 پر تیرہ سو روپیہ کی نسبت ایسے حکمران کو روٹ کر اون کا بونہا کر دوں گا یہ سن کر وہ بے پروا ہو گئے یہ  
 عبد الملک کے نسبت بہت زیادہ نامور ہوا اس نے لوگوں سے مشورہ کیا - خالد بن  
 ولید نے - - - - - عبد الملک نے جہاں کو  
 کسی قریب کا حکم دیا جہاں اس حکم کے مطابق درہم دینا بہت ناشرع  
 کیے اور ان پر یہ عبارت لکھ کر انی "الدرہم انصرہ" یہ سکہ عام اہل اسلام  
 کے درہم ہوا اس لیے کہ یہ قرآن کی عبارت تھی جس کو بے طاعت اور نیکو س کرنا  
 حرام ہے تاہم اس ناراضی کی طرف توجہ نہیں کی گئی - یہ سکہ سترہ سو تین بنا اور  
 سترہ سو تین تمام ممالک میں پھیلا دیا گیا۔

چند روز بعد یہ حال ہوا کہ یہ سکہ خالص نہیں ہے - چنانچہ نزید بن عبد الملک  
 کے عہد میں سب ابن سیرہ والی عراق مقرر ہوا وہ اس نے اس سکہ کے خالص کرنے  
 کی کوشش کی ہر شام کے زمانہ میں خالد قسری نے اور خالص کرنا چاہا - ان  
 دونوں کے بعد یوسف بن عمر نے سب سے بڑا اس امر میں اہتمام کیا اور کئی سال کا  
 اچھی طرح اہتمام کر کے اپنے عہد کا سکہ بالکل خالص بنا دیا - اسی وجہ سے پیڑی  
 خاندی - اور یوسفی سکہ محمد بنی امیہ کے سب سے خالص اور کمرے کے تصور کیے  
 جاتے تھے - جی خیال تھا جس کے بنی ہا اس کے دوسرے خیاف ابو یوسف منقول  
 لو سکہ عام وید - یہ پر آمادہ کیا کہ ان میں سے کوہ میں سکون کے سوا اور کوئی  
 سکہ نہ پایا جاتا ہے۔

تہل اسلام سلاطین ارض کا - م تاملہ تہا کہ سکون پر خلعت تسم کی تعمیر  
 بنایا کہنے سے کہی تو بادشاہ کی تصویر کندہ ہوتی تھی کہی کہی تہا کہ انشہ بنایا  
 باتا تھا - کہی کوئی جانور بنا ہوتا تھا - کہی کوئی اور چیز بنی ہوتی تھی - سلیمان نے  
 جب سکہ بنایا تو تصویر میں بنانا چھوڑ دین اور ان کے عوض پروردہ کلمات آیت  
 کر کے - زیادہ تر - کی وجہ تو یہ تھی کہ شریعت اسلامیہ میں آیت پروردہ کی معیت

ہے۔ مگر قطع نظر اس کے ایک اور بھی خیال تھا جس نے اون کو تصویرون کی جگہ  
 الفاظ کندہ کرانے پر آمادہ کیا۔ عرب فصاحت و بلاغت کو اپنا قدیمی تمغہ خیال کرتے  
 تھے۔ اون کو دعوے تھا کہ شوکت الفاظ میں کوئی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور اسٹیج  
 سے الفاظ و کلمات ہی کو اونوں نے اپنا معرکہ قرار دیا۔ یہ سکہ مدور وضع کا تھا۔ ایب  
 رُخ پر تواجد جیشا نہ کا نام منقوش ہوتا تھا اس کے نیچے رسول مقبول صلعم پر درود  
 کندہ ہوتا تھا۔ اور دوسرے کُرُخ پر تاربخ اور بادشاہ وقت کا نام لکھا جاتا تھا۔ آیات  
 قرآنی لکھنے کا سلسلہ حجاج کے بعد سے موقوف ہو گیا۔ اسلامی سکہ نبی امیہ عباسیہ  
 اور عبیدین معمر کے زمانوں میں اسی مدور قطع کے رہے۔ لیکن مغرب میں خلیفہ  
 دولت موحیدین قائم ہوئی تو مہدی نے اون لوگوں کے لیے مربع قطع کے سکہ سنون  
 کیے جن کا برابر اسی خاندان میں رواج رہا۔  
 یہاں پر ہم سکہ کے بیان کو ختم کرتے ہیں اور آخر میں اتنا اور لکھتے ہیں کہ وہی  
 سکہ جو عبد الملک کے عہد میں مروج ہوا وہی شرعی سکہ کہلاتا تھا اس لیے کہ جناب  
 فاروق کے قائم کیے ہوئے اوزان پر بنایا گیا تھا۔

## ہمارا جدید ناول

ہم نے اپنی جو ناول شروع کیا۔ ہے۔ ایک بہت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز امر کو ثابت کر دے گا۔ اگرچہ ہم نے یہ زمین اندلس میں سین کھینچا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ اس عہد کے مسیحی اور اسلامی تعلقات کو دکھائیں۔ لیکن اس کے ساتھ خاص طور پر اس زمانہ کے گرجوں اور کلیساؤں کی عجیب و غریب نظائر آئے گی۔ یہی دکھایا گیا ہے کہ اسلامی حکومت میں مسیحیوں کو کس حد تک آزادی حاصل تھی۔ مگر اس کے ساتھ انکی متعصبانہ کوششیں اس قدر ذلیل اور شرمناک ہوتی تھیں۔

دین عیسوی کے سرگروہ ہمیشہ دعوے کرتے رہے کہ ان کے مذہب میں روحانیت کی تعلیم سب سے زیادہ اہم دہی گئی ہے۔ بلکہ اس بارہ خاص میں وہ بجائے خود تمام مذاہب کو اپنے سے اوسنے درجہ پر خیال کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ کبھی یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ اگر لوگ ان روحانی رموز کو سمجھ ہی نہیں سکتے جس کی تلقین عیسائیت کے ذریعہ سے لوگوں کو لیجاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قدیمی چچ جس سے رومن کتھلیک مراد ہے اس میں انہما سے زیادہ جوگ کے اصول برتتے جاتے تھے۔ تارک الدین ہونا اور لذات دنیوی کو چھوڑ دینا اس عہد کے گرجوں کا عام سبق تھا۔ یہ سبق صرف راہبوں ہی کو نہیں دیا جاتا تھا جو بالوں کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے تھے۔ اور بالکل فقیرانہ وضع میں رہا کرتے تھے۔ بلکہ اس سبق نے لاکھوں عورتوں کی بھی زندگی خراب کی جو بچپن ہی سے گرجے کی نذر کر دی جاتی تھیں۔ اور پھر زندگی بھر کے لیے انسانیت کے نیچرل خطوط سے محروم کر دی جاتی تھیں۔ چنانچہ رومن کتھولک مرجع آج تک ان شرمناک باتوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ آخر زمانہ میں اسلام کو دیکھ کے اور اختلال اسلامیہ سے سبق لے کے پراسٹنٹ مذہب قائم کیا گیا۔ جس نے ان باتوں میں بہت کچھ اصلاح کر دی۔ مگر یہ دعوے آج تک پراسٹنٹ پادریوں میں بھی باقی ہے



کہ روحانی مسائل کی تعلیم دین عیسوی سے زیادہ کوئی نہیں کر سکتا۔

اگر خالص روحانیت اور رہبانیت یعنی جوگ ہی مذہب کی خوبیوں کے سچے مینا ہو سکتے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندو مذہب سب سے اچھا مذہب ہے۔ اس لیے کہ مسائل تصوف جس خوبی سے ہندوؤں کی کتابوں میں بیان کیے گئے ہیں اور کہیں کم نظر آسکتے ہیں۔ اور پھر ہی اگر نظر آسکتے ہیں تو مسلمان متصوفین کی بے بہا کتابوں میں۔ عیسائیت نے اگر سچ پوچھیے تو آج تک تصوف کے نازک اور دقیق رموز کو سمجھا ہی نہیں۔ دین عیسوی کی روحانیت صرف عہد نامہ جدید کی چند آیتوں پر محدود ہے جن کے ذریعہ سے انسان کی نیت اور ارادوں پر پھر سے بٹھائے گئے ہیں۔ بتایا گیا کہ اگر تم کسی عورت کو بڑی نگاہ سے دیکھو تو آنکھ نکال کے پھینک دو۔ اگر تم کسی ناجائز کام کے لیے ہاتھ بڑھاؤ تو اپنا ہاتھ کاٹ کے پھینک دو۔ اگر تمہارے ایک گال پر کوئی پتھر مارے تو اپنا دوسرا گال اوس کے سامنے کر دو۔ اگر کوئی تم کو ایک میل اپنے ساتھ بگڑا کر لے جانا چاہے تو تم دو میل اوس کے ساتھ چلے جاؤ کوئی تہین گایان دے تو تم اسکو دمانین دو۔ کوئی تیر لعنت کرے تو تم اس کے لیے رحمت کی دعا کرو۔ اگلے دن وہ کھا گیا تھا کہ کوئی کسیکو مار ڈالے تو اس پر قصاص جاری ہوگی۔ مین کہتا ہوں کہ نہیں کوئی کسیکو غصہ کی نگاہ سے دیکھے گا تو اس پر بھی قصاص جاری ہونا چاہیے۔ اگلے دن بتایا گیا تھا کہ زنا کرو گے تو گنہگار ہو گے مین کہتا ہوں اگر کوئی کسی عورت کو شہوانی نظر سے دیکھو گے تو گنہگار ہو گے غرض اسی قسم کی باتیں مین جنکی تعلیم دین عیسوی مین کی لٹی ہے اور یہی وہ روحانیت ہیں جن پر فخر کیا جا رہا ہے۔ لیکن سب کہتے ہیں کہ زہد و اتقا کی تو اور بات ہے مگر کوئی صاحب شہریت پیغمبرؐ ایک عالم کی رہبری کے لئے آیا ہوا وہ ایسی باتیں کہی نہ کہے گا۔ یہ تو وہ احکام مین خیر تعمیل عقلاً محال ہے۔ شاید جناب مسیح کے وقت سے آج تک ان باتوں پر ایک سچی ہی عمل نہ کر سکا ہوگا۔ ہمیں شک ہے کہ یہ باتیں دراصل جناب مسیح کی فرمائی ہوئی من یا یاردن کے ملحقات مین سے ہیں۔ اور قیاس یہی چاہتا ہے کہ بحیثیت نبوت جناب مسیح نے ایسے احکام ہرگز نہ دیے ہوتے۔

بہر حال ان نصائح کی بنا پر مسیحیوں کو دعوے ہے کہ وہ روحانی دین کے بادشاہ ہیں۔ مگر اس بادشاہت کے ساتھ ترویج دین کے لیے انہوں نے کس قسم کی کوششیں کیں اور اپنے چال و چلن کو کیسا دکھایا۔ اس کا ثبوت ہمارا یہ ناول دے گا۔ اسلام نے اگرچہ اتفاق کے بسبب سخت مزاح بتائے بلکہ یہاں تک کہ دیا ہے کہ جب تک انسان کے تمام جذبات ولی توحید کے تابع نہ ہو جائیں اور اس وقت تک اس کا ایمان کامل نہیں ہے۔ لیکن وہ عام اعتقاد جس کی پابندی کا ہر شخص مکلف کیا گیا ہے یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نیت کے بارے میں کسی سے باز پرس نہ کرے گا جو ابھی صرف احتمال کی کرنا پڑے گی۔ یعنی ان بانوں کی جن کا وقوع ہو جائے۔ اسلام کسی سے یہ نہیں کہتا کہ تم کو کوئی مارے یا گالیوں دے تو تم ہیٹر کے اور مار گھاؤ یا دعا مانیں دینے لگو۔ بلکہ وہ تو سیدھا سادہ اور بالکل قرین قیاس حکم دیتا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی بُرائی کرے تو اگر تم حافِ کرد و توہمت اچھا ہے خدا تم کو اس کا بدلہ دیگا اور اگر نہ جی چاہے تو اسی طرح اس سے بدلہ لے لو۔

مسلمان اس اصول پر ہمیشہ راست بازی کے ساتھ عمل کرتے رہے اور انہوں نے کسی اور قسم کی دغا و فریب سے اپنی کارروائیوں میں کام ہی نہیں لیا۔ حوا، حووان دعوے ہائے روحانیت کے ہمیشہ مسیحیوں کا دستور العمل رہے اور آج تک ہیں۔

اس ناول میں لوگ اس عہد کے عیسائی مذہب کی سچی تصویر دیکھیں گے اور معلوم ہوگا کہ جن دنوں عیسائی عربوں کی تلوار کے آگے سر جھکائے ہوئے تھے ان دنوں سر جھکائے ہی جھکائے وہ کیسی دغا و فریب کی کارروائی کرتے رہتے تھے۔ ایک طرف تو مسیحیوں کا جاہلانہ شوق شہادت نظر آئے گا جو دراصل خودکشی کا ایک تعصب انگیز نمونہ تھا۔ دوسری طرف یہ دکھائی دے گا کہ انہوں نے ایک مسلمان شریف لڑکی کو اس کے گھر سے نکال کے قید کر دیا اور آخر اس کی کیا حالت ہوئی۔ اور اپنے مسلمان بہائی کے گھر سے

نخل کے وہ کس قدر ذلتوں میں پڑ گئی اور بد اخلاقیوں نے اس بے گناہ کو  
کس جبراً ت کے ساتھ اپنا شکار بنایا۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی  
ساتھ راہبوں اور نمون کے چال چلن کا بالکل صحیح نقشہ دکھایا گیا ہے۔  
ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس واقعہ کا اصل پلاٹ ہم کو انگریزی مصنفوں  
کے بیان سے ملا ہے۔ اور جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں سو خاص خاص باتوں  
کے سب سے سچے ہی کے بیان کے مطابق لکھا گیا ہے۔  
اسلامی علماء اور سپہ سالاروں کے نام اور حالات بھی ہم نے انگریزی  
ہی سے نکالے ہیں۔ بہت کم ایسی باتیں ہیں جن کے لیے ہم کو اسلامی  
کتا بوں کی ورق گردانی کرنا پڑی ہو۔

دار الخلافت قطبہ

نمبر

اس اضافہ میں الحکم نے کل گزشتہ خلفاء سلاطین سے زیادہ روپیہ صرف کیا کہتے ہیں کہ ۳۷۵۲۶۱۰ تیار اوس نے مسجد کی نذر کیے۔ اور سب کے بعد صاحب المنصور نے الحکم سے بھی زیادہ مسجد میں اضافہ کیا۔ الغرض خاندان بہر میں کوئی فرمان روا نہ تھا جس کا ہاتھ اس جامع میں نہ لگا ہو۔

طولاً مشرق سے مغرب تک اُنیس محرابیں ہیں۔ جن کے مقابل درون کی ہر قطار میں محرابیں ملتی چلی گئیں ہیں۔ اندر جانے والے کو پہلی ہر محراب میں داخل ہونے کے بعد انتہا تک درون کی اڑتیس قطاریں ملتی ہیں۔ اور اسی کے مطابق او سے اڑتیس محرابوں کے نیچے سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ ان محرابوں کو ہر مقام پر وہ محرابیں قطع کرتی ہیں جو عرضاً شمال سے جنوب تک یعنی سب تک بنتی چلی گئی ہیں۔ اس طرح کہ پہلی ہر محراب سے داخل ہونے والے کو جس طرح اڑتیس محرابوں کے نیچے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح او سے اڑتیس محرابیں داہنی جانب اور اڑتیس بائیں جانب

میں ہیں۔ اسی ترتیب و نظام سے ۱۲۹۳ ستون مسجد کی حبت کو اودھنا لئے ہوئے ہیں۔ بعض درخیز تھے ہیں کہ ۱۴۱ ستون تھے۔ لیکن تواریخ کے زیادہ ورق اور لٹنے سے اس اختلاف کا حوالہ ملتا ہے کہ جامع قریہ میں دو قسم کے ستون تھے۔ بڑے ستونوں کے علاوہ کچھ چھوٹے ستون بھی تھے۔ پہلی روایت میں ان کا شمار کیا گیا ہے۔

مسجد کی کل عمارت ۶۰۰ فٹ لمبی اور اڑھائی سو فٹ چوڑی ہے زمین پتھر فرش ہے جس میں رنگ برنگ کے پتھر بنائیت خوبصورتی اور موزونیت کے ساتھ چمکے گئے ہیں۔ ستونوں پر بھی گہو گہو رنگے نقش و نگار بنائے گئے ہیں جن میں زیادہ تر سونے کا کام ہے۔ اکیس پر بنی دروازے جو اس مسجد میں لگے ہیں اتنے خوبصورت ہیں کہ انسان کو ان کی اسے صنعت و کید کے حیرت ہو جاتی ہے۔ ان دروازوں میں سے از مغرب کی طرف ہیں۔ نوشتہ کی طرف۔ اور شمال کی طرف صرف تین دروازے ہیں۔ ان اکیس دروازوں میں سے تینوں سپروں پر ایک ایک دروازہ خاص طور پر عالی شان اور خوشنما بنایا گیا ہے اور حورون کے لیے مخصوص ہے۔ یہ اکیس دروازے وہ ہیں جو شہر والوں کے آنے کے لیے ہیں۔ خاص محراب کے نیچے جنوب کی طرف ایک اور سنہا دروازہ ہے جس میں سے ہر جمعہ کو خلیفہ آیا کرتا تھا اور شریک جماعت ہوتا تھا۔

اس مسجد میں روشنی کا جو اہتمام کیا گیا تھا وہ سب سے زیادہ حیرتناک ہے۔ صدارتی برنجی لائٹیں جو کبھی مورخوں کی راستے میں گرجوں کے کھنڈوں سے ٹوٹ کر کے بنائی گئی تھیں۔ ہر طرف اور جگہ جگہ آویزاں تھیں۔ جن میں تین صاف مادی کی بتائی جاتی ہیں۔ ان لائٹوں کے علاوہ بہت سے جھاڑتے جن کا شمار بھی عربی مورخوں کے نزدیک سو سے زیادہ تھا۔ ان میں سب سے بڑا وہ جھاڑ تھا جو خاص ممبر و محراب کے سامنے لٹک رہا تھا۔ اگلے عہد کے لوگ اس بات کو حیرت سے بیان کر رہے

ہین کہ اس جہاڑ میں ایک ہزار گلاس روشن ہوتے تھے۔ کانڈی کہتا ہے کہ  
 کہ اسی مقام پر ایک اور فرشتی جہاڑ تھا جو سونے کا تھا اور اس قدر خوبصورت  
 تھا کہ اوس کی مناعی پر بڑے بڑے لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ ان جہاڑوں  
 اور قندیلوں میں سے اکثر روزانہ روشن ہوتے تھے اور ہر روز مغرب سے  
 عشا کی نماز کے آخر وقت تک دو ہزار سات سو پراغ روشن نظر آتے تھے  
 ماہ مبارک رمضان میں پوری روشنی ہوتی تھی۔ اور کل روشن ہونے والی  
 بیٹوں کا شمار دس ہزار سے کم نہ ہوتا تھا۔ جن میں دوسو اسی شمعیں تھیں  
 باقی گلاس تھے۔

ایک عجیب و غریب طریقہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ماہ مبارک کی پہلی تاریخ  
 ممبر کے پاس ایک بڑی بہار سی شمع روشن کی جاتی تھی جس کا وزن پچیس  
 تیس سیر سے کم نہ ہوتا تھا۔ یہ شمع روز و شب برابر روشن رہا کرتی تھی اور  
 جس دن رمضان کا مہینہ ختم ہوتا تھا اسی دن یہ بھی ختم ہو جاتی تھی  
 زیادہ تکلف یہ کیا جاتا تھا کہ چراغوں میں جو تیل روشن ہوتا تھا وہ  
 خاص اہتمام سے خوشبودار بنایا جاتا تھا تاکہ تیل کی چراہند نمازیوں  
 کو اذیت نہ دے۔ صد ہا خدام صرف اسی خدمت پر یعنی تیل کے معطر بنانے  
 اور روشنی کے اہتمام میں مصروف رہا کرتے تھے۔ یہی لوگ خوب صورت  
 انگلیٹھوں میں ہر وقت عود و عنبر ہی ملگا کرتے رہتے تھے۔ مورخین کا بیان ہے کہ  
 سالانہ روشنی میں ۲۴۰۰۰ پونڈ خوشبودار تیل اور مسجد کے مکانے  
 میں ۲۰ پونڈ عود و عنبر صرف ہوتا تھا۔ چاہے اس میں مبالغہ کیا گیا ہو  
 مگر ہمیں تواریخ کے صفحوں پر نظر آتا ہے کہ صرف چراغوں کے لیے جو  
 بتیان بنائی جاتی تھیں اون میں ماہوار پون قنطار یعنی ہمارے حساب  
 سے ایک سو پانچ سیر روئی صرف ہوتی تھی۔

خلیفہ الحکم نے اس مسجد کے متعلق ایک نہایت ہی شاندار عمارت  
 بنوائی۔ جو مقصورہ کے نام سے مشہور تھی۔ یہ عمارت مسجد کی اوس دیوار  
 ملحق تھی جو قبلہ کی جانب تھی اور شاہی دروازے کا راستہ اسی

عمارت میں سے ہو کے قصر شاہی تک گیا تھا۔ یہ عمارت ۵۰ ہاتھ لمبی اور ۲۲ ہاتھ چوڑی تھی۔ اس کا دروازہ محراب مسجد کی طرف سونے کا بنا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں پر بھی سونے کا کام تھا۔ اور زمین خالص چاندی کی تھی۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ نسل بنی امیہ کے ہر خلیفہ نے اس مسجد کی اصلاح اور ترقی میں برابر کوشش کی۔ جب متواتر آٹھ خلیفہ اس کی رونق میں اپنی محنتیں صرف کر چکے تو حاجب المنصور بن ابی عامر کی باری آئی جو ہر اسے نام تو حاجب یا وزیر تھا مگر دراصل خلافت کر رہا تھا۔ المنصور نے چاہا کہ جامع قرطبہ کو سابق سے زیادہ وسیع کرے۔ بہت سے مکان جو مسجد کے آس پاس واقع تھے جب تک وہ توڑ کے شامل نہ کیے جاتے یہ غرض نہ پوری ہو سکتی تھی۔ المنصور اس جوش کے ساتھ اس کار خیر کی طرف متوجہ ہوا تھا کہ ان مکانوں کے دروازوں پر خود گیا۔ اور مالکین سے بجا بندی و درخواست کی کہ مسجد کے لیے اپنے مکان بیچ ڈالیں۔ کسی کو انکار کرتے نہ بنی۔ اور لیونڈر انکار کرتے منصور نے ایسی فیاضی سے کام لیا کہ جس نے اپنے مکان کی جو قیمت مانگی اس سے دوہنی رقم دی۔ اور رہنے کے لیے ایک مکان اس کے علاوہ دیا۔ اتفاقاً انہیں مکانوں میں سے ایک مکان ایک عورت کے قبضہ میں تھا۔ اس میں ایک کھجور کا درخت لگا ہوا تھا۔ عرب کے مسلمان جو اسپین میں جا کے آباد ہوئے تھے ان کو اپنے وطنی رفیق خرمے کے درخت سے بڑی محبت تھی۔ جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس عورت نے کہا میں اپنا مکان دوں گی مگر اس شرط سے کہ مجھے جو مکان رہنے کو دیا جائے اس میں بھی ایسا ہی کھجور کا درخت ہو۔ منصور نے اپنے خدام کو حکم دیا کہ ایسا مکان تلاش کر دو میں اس عورت کے لیے اس کو ضرور خریدوں گا چاہے اس کی قیمت میں بیت المال (شاہی خزانے) کا سارا روپیہ صرف ہو جائے۔ آخر بڑی جستجو کے بعد بہت زیادہ قیمت دے کے اسی صفت کا ایک مکان بمسم

پونچیا گیا۔ جب وہ عورت اوس مکان میں گئی اور اوس کا مکان مسجد کی ملکیت میں آیا

اس مسجد کا ممبر ہی بے انتہا محنت اور استہام سے بنوایا گیا تھا۔ تمام عمدہ قسم کی لکڑیاں سب کو شش سے فراہم کر کے اس میں لگائی گئی تھیں جن پر ہاتھی دانت کا کام تھا۔ یوں معمولی بیان سے وہ صنعت اور خوبی سمجھ میں نہیں آسکتی جو اس ممبر میں تھی۔ اس کا اندازہ کرنا ہے تو سورنم کے اون الفاظ کو دیکھنا چاہیے جو ادنون نے اس کے تذکرہ میں استعمال کیے ہیں۔ اون کے وعدوں اور مبالغوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد بہرین سب سے زیادہ حیرتناک چیز ممبر ہی تھا۔ پیشتر ایک معمولی ممبر تھا لیکن الحکم کی مہمت نے یہ نہ گوارا کیا کہ ایسی مسجد میں ایک معمولی کاریگری کا ممبر رہے۔ اسی بنا پر اوس نے اس ممبر کی تیاری کا حکم دیا۔ آٹھ لایق و فرید زمانہ کاریگر دن نے روزانہ دیدہ بیزی کر کے آٹھ برس کی مدت میں اوسے بنایا یا تھا۔ بعض لوگوں کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جا بجا جواہرات بھی چڑھے تھے۔ اس ممبر میں نوزنیہ ہتے کل ۵۷۵۷۳ دینار اور سواتین درہم اسکی تیاری میں صرف ہوئے تھے

مینار یا اذان دینے کا بلند برج جو مسجد کے بیرونی حصہ میں ہے اس میں بھی کاریگر دن نے بڑی جانکاہی سے خوشنمائی پیدا کی تھی۔ اسلیئے کہ وہ بھی بجائے خود ایک زبردست خلیفہ کی یادگار تھا۔ الناصر الدین اس کا بانی تھا۔ اس کی چوٹی پر تین لکھو تانبے تھے جن میں سے نیچے اوپر کے دو لکھو تو فاعل سونے کے تھے اور درمیان کا لکھو چاندی کا تھا سارے برج پر تانبے کے پتھر چڑھے ہوئے تھے۔ یہ برج اپنی دفع سے مربع ہے اور ہر پہلو پر آٹھ ہاتھ کی مسافت ہے۔ اس حساب سے پورا رقبہ بتیس ہاتھ کا ہوا۔ اس کی عمارت میں ایسا استہام کیا گیا کہ تیرہ صدیہ کی مدت میں بن کے تیار ہو گیا۔ اوپر چڑھنے اور اترنے کے لیے اس برج میں دو زنیہ بنائے گئے ہیں۔ ایک پر سے انسان چڑھتا ہے اور

## عربی سے فارسی اور وہ کے تعلق

بعض لوگوں کو ان دنوں ہم اس خیال میں مجھاتے ہیں کہ فارسی یا اردو زبان میں عربی الفاظ بالکل نکال ڈالے جائیں۔ یہ خیال کچھ ان شرقی زبانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہم انگریزی میں بھی دیکھتے ہیں کہ ایسی کوشش ایک عرصہ سے جاری ہے۔ انگریزی زبان میں بے انتہا لاطینی (رومی) الفاظ ملے ہوئے ہیں جو انگریزی قوم پر سے رومیوں کی غلامی کا داغ سی طرح بیٹھنے نہیں دیتے اور کوئی جب نہیں کہ لاطینی الفاظ کھانسنے پر جو بیزار آدہ کرتے ہیں اس میں زیادہ مصلحت اسی خیال کا ملا ہوگا۔

فارسی اور اردو میں جو عربی الفاظ ملے ہوئے ہیں وہ بھی اس امر کا ثبوت دیتے ہیں اور ہمیشہ دین گئے کہ ایران و ہندوستان کو کسی زمانہ میں اسلام کی غلامی پہنچی تھی۔ جو لوگ ان الفاظ کو نکالنا چاہتے ہیں غالباً ان کا بھی یہی خیال ہوگا کہ اپنی زبان کو عربی یا دو سر الفاظ میں یوں کما جائے کہ اسلام کی قید سے آزاد کرانا جائز ہو۔ مگر شاید ایسی کوششیں ہمارے خیال میں بڑی مشکل سے کامیاب ہو سکیں۔ فردوسی نے ایک شاہنامہ لکھا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ عربی الفاظ سے بچنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن اب شاہنامہ کے دیکھنے والے بتا سکتے ہیں کہ فردوسی کو اس دین کمان تک کامیابی ہوئی۔ بڑی تحقیق کے بعد جو کچھ فیصلہ کیا جاسکا وہ اسی قدر ہے کہ شاہنامہ میں عربی الفاظ بہت کم ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ عربی الفاظ اردو میں بالکل نہیں۔ ادھر آخر زمانہ میں ناصر الدین شاہ ایران کے چچا نے نثر میں ایک مایہ ناز بنام نامہ خسروان لکھی اس میں ہی عربی الفاظ بالکل مٹروک کر دیے ہیں۔ اور بے شک وہ اس وجہ سے بہت کچھ قابل تعریف ہیں کہ اپنی وضع کو آخر تک بڑھائے جاسکے۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ اس کی عبارت موجودہ مردجہ فارسی سے کمان تک موافق رہی ہے اور محاورات کی کسٹی پر کس قدر پوری اور ترقی ہے تو شاید ان کو جواب دینا دشوار ہوگا۔ زبان کی اصلاح وہیں تک جائز ہے



جہاں تک کہ محاورہ اور اہل زبان کی پابندی سے ہو جب ایرانیوں کی زبان پر ہزار ہا عربی الفاظ چڑھے ہوئے ہیں جن کی جگہ پر کوئی ٹھیکہ فارسی لفظ بولنے والوں کو روزمرہ کے استعمال کے لیے نہیں ملتا تو اون کے نکالنے کی کوشش کرنا زبان کی اصلاح نہیں بلکہ ایک قسم کا جنون ہے۔ درسی زبان کے الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر استعمال کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے اگر دشواری ہے تو یہ کہ اون کے استعمال میں محاورہ کا لحاظ رکھا جائے۔

تاہم یہ کہ بین المذاہب میں کسی علم و فن کی دنیا میں قدیم رکھتے وقت انسان کو معلوم ہو سکتا ہے کہ فارسی زبان کس قدر بے مایہ ہے۔ بغیر اس کے کہ عربی الفاظ سے مدد لی جائے کوئی شخص ایک علمی مسئلہ ہی فارسی میں نہیں بیان کر سکتا۔ جو صاحب اس قسم کی کوشش کرنا چاہتے ہیں اون کا کام ہے کہ زبان کو اپنے ہول سے درست کریں۔ آج تک کسی نے اتنا تو کیا نہیں کہ فارسی کی نحو و صرف ہی درست کی ہوئی۔ آج تک جس کسی نے نحو میں کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ کیا اوس نے وہی عربی کے قواعد عربی ہی اصطلاحات کے ساتھ فارسی میں بیان کر دیے۔ حالانکہ سمجھنے والے خوب جانتے ہیں کہ گوہر اہل عربی الفاظ فارسی میں مستعمل ہیں مگر زبان آپے طرز سے ایسی غلط و واقع ہوئی ہے کہ عربی کے قواعد فارسی پر ٹھیک منطبق نہیں ہو سکتے۔ بلکہ عربی کی جگہ اگر نحو و صرف سے فارسی میں کام لیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ بہر حال فارسی کے بہرہ و آج تک اوس کے لسانی قواعد تو درست ہی نہیں کئے گئے۔ عربی کی غلامی سے اوسے کیا خاک آزاد کرالیں گے۔

ایک پارسی صاحب نے ایک انگریزی اخبار میں ابھی اس خیال پر زور دینا چاہا تھا جو ماشاء اللہ سے نہ فارسی ہی جانتے ہیں اور نہ عربی ہی۔ اونہوں نے محض اپنے حسن عقیدت سے یہ دعوے کر دیا کہ فارسی اس قدر مکمل زبان ہے کہ بعض موقعوں پر عربی کو اوس کے خزانہ سے الفاظ عاریت لینا پڑے۔ چنانچہ اونہوں نے شاید کسی سے سن کے لگام کے لفظ کو پیش کیا ہے جسکو عربوں نے سرب کر کے لجام کر لیا۔ اور آج تک مروج ہے۔ یہ خیال بعض ایرانی صاحبوں میں بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ دو ایک عجیبان کی زبان سے ہم نے خود بھی سنا ہے۔ وہ کہتے

ہیں کہ جاہلیت میں سیف بن ذی یزن کی فریاد پر جب ایرانیوں نے ملک میں قیام نہ کر لیا تو اس زمانہ میں فارسی کے بہت سے الفاظ عربوں کی زبان پر موج ہو گئے قطع نظر اس کے عرب کے حصہ حیرہ وغیرہ پر مدقون سے ایران کی حکومت تھی یہ بھی کافی ذرا عربی میں فارسی الفاظ کے جانے کا تھا۔ لیکن یہ خیال ایک جاننے والے کے نزدیک بالکل لغو اور بے سرو پا ہے۔ اول تو جہان عرب کے حصہ حیرہ وغیرہ ایران کی حکومت تھی وہاں سرحد شام سے ملے ہوئے اضلاع عرب پر روم کی حکومت تھی۔ ثانیاً القیاس میں یہ بہانہ چند روز کے لیے ایرانیوں کی حکومت رہی وہاں اون سے پہلے بوساطت بنی تھی عہد تک روم کی ہی حکومت رہی۔ کوئی وجہ نہیں کہ عربی نے ایرانیوں سے اون کی زبان کے الفاظ تو لیے ہوں اور رومی زبان کے الفاظ یونہی چھوڑ دیے ہوں۔

قطع نظر اس کے شاید اس خیال و اون کو یہ نہیں معلوم کہ اضلاع عرب پر غیر مالک کی حکومت تھی یہی تو کس طرح کی۔ سیف بن ذی یزن کے عہد میں جو ایرانیوں نے ملک میں کو فتح کیا اس کی یہ حالت تھی کہ میں پر بادشاہ جیش نے متصرف ہو کے جب وہاں کے شرفا کی آبروریزی شروع کر دی تو سیف بن ذی یزن نے کسریٰ کے دربار میں جا کے فریاد کی اور بہت دنوں تک پڑا رہا۔ آخر کسریٰ نے ایک فوج دے کے اپنے ایک افسر کے ساتھ اسے یمن پر روانہ کیا۔ اس فوج نے حبشہ والوں کا قلعہ فتح کیا اور سیف بن ذی یزن کو بادشاہ بنایا۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کو ایرانیوں نے فتح کیا مگر حکومت سیف بن ذی یزن کے ہاتھ میں رہی جو عربی نژاد تھا۔ پس اتنا تھا کہ وہ ایران کے آگے سر جھکا گئے ہوئے تھا ورنہ یہاں کے انتظامات اور معاملات سے شہنشاہ ایران کو کوئی تعلق نہ تھا۔ باقی رہے اضلاع حیرہ وغیرہ یہاں کی بھی یہی حالت تھی۔ ان مقامات پر نعمان بن منذر کا خاندان حکمران تھا۔ سیف بن ذی یزن کی طرح یہاں کے فرمانرواؤں نے بھی یہی کیا کہ تاج ایران کے آگے سر جھکا گئے رہے۔ غرض ایرانی رعایا سے عربی رعایا کے تعلقات کبھی اتنے نہیں بنے پائے کہ الفاظ و خیالات کا باہم تبادلہ ہوتا۔ یا عجمی الفاظ عربی میں پہنچتے۔

دوسرے سب سے زیادہ جس بات نے عربی زبان کو خارجی اثر وں سے بچایا وہ یہ تھی کہ عرب میں سب سے زیادہ مستند اور قابل تبع قریش کی زبان تھی جن کو خدا نے ہمیشہ غیر قوموں کی اطاعت سے بچایا۔ قریش نے کبھی کسی کے آگے سر اطاعت نہیں جھکایا۔ اور نہ اون کو سو خاص تاجسہرہ نہ سفرون کے غیر زبان بولنے والوں سے ملنے کی ضرورت لاحق ہوتی تھی لہذا اون کی زبان ہمیشہ ان خارجی اثر وں سے محفوظ رہی۔ اور عربی زبان میں کوئی لفظ شامل ہی نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ قریش کے لوگ اوس کو تسلیم نہ کر لیں۔ غرض ان وجوہ سے کبھی قیاس ہی میں نہیں آ سکتا کہ فارسی کے الفاظ عربی میں شامل ہوں۔

ان بعد اسلام البتہ عربی میں فارسی کے بعض الفاظ استعمال ہو گئے۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ خلافت عباسیہ نے اپنا ستر بغداد کو قرار دیا جو دراصل ایران کی ٹھکانہ تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ عجمی خاندان وزارت کے درجہ کو پہنچ گئے جس کی وجہ سے عربوں کو ایرانیوں سے ملنے جلنے کی بہت ضرورت ہوئی اس پر طرہ یہ ہوا کہ خلفا اور اون کی وجہ سے تمام امراء سے عرب عیش و عشرت کے سامانوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جن کے لیے مملکت ایران اگلی دنیائے میں مشہور تھی یہ وہ سامان تھے جو کبھی اس عرب کے خواب و خیال میں نہ گذرتے تھے۔ اور ان میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں۔ جن کے لیے عربی زبان کو ناکارہ ہی سے الفاظ لینا پڑے۔ ہم نے عربی زبان میں ”شمعدانات“ کا لفظ بھی دیکھا ہے جو اسی عہد میں عربوں کی زبان پر جاری ہوا۔ بلکہ حکومت کا وجہ سے اس سے پیشتر ہی تعلقات قائم ہو گئے تھے کہ بنی امیہ ہی کے دور میں عربوں کی زبان پر فارسی الفاظ چڑھ گئے۔ بنی امیہ کے ابتدائی زمانہ کا شاعر ابن مفرغ جو زیادہ کے بیٹے عباد کے ہمراہ سیستان کے جہاد پر آیا تھا۔ شہدائے ستر کے مرثیہ میں کہتا ہے۔

کم بالجورم وارض المند من قدم  
ومن ستر انک قتلہ لاهم قبروا

۱) ممالک گرم مین اور ارض ہند مین بہت سے نقش قدم ہین اور بہت سے سرنگان قوم مین جو شہید ہوئے اور دفن مین کیے گئے۔

اس شعر مین دل تو "چروم" جرم کی جج ہے جو لفظ گرم کا عرب سے روس سے مصرع مین سرالینک ہے جو فارسی لفظ سرنگ کہ بگاڑ کے مبنایا گیا ہے۔ بہر حال فارسی الفاظ اگر عربی مین آئے تو اسلامی فتوحات کے بعد آئے۔

لگران الفاظ کے عربی مین شروع ہو جانے سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ عربی اون الفاظ کی محتاج تھی۔ عربی زبان کے خزانہ مین اس کثرت سے الفاظ موجود ہین کہ یہی زبان تھی کہ تمام علوم فلسفہ و طبہ یونانی و رومی زبانوں نے لیے انہر اس کے کہ او سے ایک اصطلاح کے لیے بھی ان زبانوں کا زیر بار احسان ہونا پڑا ہو۔

## جناب شہربانو

ہم نے ایک مضمون "خاندان نبوت" کے متعلق لکھا تھا بادی النظر مین بارہ خطاب انگریزی مورخوں کی طرف تھا۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان ہی ہم سے خفا ہو گئے۔ سنتے ہین۔ ہمارے تکفیر کے لیے فتوے لیے گئے۔ کہ کسی نے اتنی عنایت نہ کی کہ اون فتوؤں کو ہمارے پاس بھی بھیج دیا ہو تا نا کہ دیکھتے کہ آخر ہماری خطا کیا ہے اور کون کون صاحب مین جو ہماری تکفیر فرماتے ہین۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا مین ہی دیکھ لوں  
کس کس کی ٹہر ہے سرخضر لگی ہوئی

تاہم ہم کو بجاے خود اطمینان ہے۔ اور ہم بہت خوش ہین کہ اس مین ہم نے جو کچھ لکھا اس مین سے ایک لفظ بھی بے اصل نہیں۔ بعض اجاب کی زبانی معلوم ہوا کہ ہم نے جو جناب شہربانو کے زید کے

نکاح میں آنے کا حال لکھا تھا اوس پر لوگوں کو غصہ آگیا۔ اگر یہی ہے تو افسوس کی بات ہے۔ یہ تو ایسا ہے کہ مستند مورخین میں سے کسی کو انکار نہیں۔ ہم دو کتابوں کی عبارتوں کا ترجمہ کیے دیتے ہیں اور کٹڈین بھی کون جن سے زیادہ مستند تاہم تخمینہ تاریخ کی دنیا میں نہیں مل سکتیں۔

محمد بن جریر طبری کی تاریخ مطبوعہ لیڈن کے صفحہ ۸۷، ۸۸، ۸۹ میں ہے۔  
 ۱۔ علی بن حسین بن علی بن ابی طالب۔ آپ کی والدہ غزالہ تھیں جو اُم ولد تھیں۔ بعد امام حسین کے زبید اُن کے غلام نے اُن کو اپنے عقد نکاح میں لیا۔ تب عبد اللہ بن زبید پیدا ہوئے جو علی بن حسین کے بہائی (اخانی) ہیں۔

مسارفت ابن اثیر مطبوعہ لیڈن کے صفحہ ۱۱۰ میں مندرج ہے۔  
 ۲۔ اور علی بن حسین اصغر امام حسین کی نسل آپ ہی سے چلی۔ بعض کہتے ہیں آپ کی والدہ سندھ تھیں۔ جن کا نام بعض سلافہ اور بعض غزالہ بتاتے ہیں۔ بعد امام حسین کے انکو امام حسین کے غلام زبید نے اپنے عقد میں لیا۔ اور عبد اللہ بن زبید پیدا ہوئے۔ جو علی بن حسین کے (اخانی) بہائی ہیں۔

اغانی جو باعتبار اسناد اسی پایہ کی کتاب ہے اوس میں بھی یہی واقعہ مندرج ہے۔ قدیمی تاریخین جن پر کہ استناد و اعتبار کا دار و مدار ہے وہ یہی ہیں۔ اور یہی اصلی سرچشمہ ہیں جن سے لے لے کے متاخرین نے مصنف بننے کا شہ حاصل کیا۔ ابتداءً ہم نے اس واقعہ کو ابن خلکان سے نقل کیا تھا۔ جو نہایت متداول کتاب ہے اور غالباً ہر جگہ دستیاب ہو سکے گی۔ جن صاحب کو اطمینان حاصل کرنا ہو اوس کے ورق اولین اور امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے حالات میں دیکھ لیں۔ ابن خلکان نے شاید غلطی سے جناب شہر بانو کے دوسرے شوہر کا نام زبید لکھ دیا ہے۔ اگرچہ یہ بتایا ہے کہ وہ جناب امام حسین کے غلام تھے۔ مگر اب ہم کو بعد تحقیق

معلوم دگلیا کو اون بزرگ کا نام زید بنین زبید نام تھا۔

سب سے بڑا کھڑکھٹ کی یہ بات ہے کہ جو غصہ اس حاملہ میں مضمون کو گذرا ہے یہی غصہ اوں کی طرح خاص اوسی زمانہ میں عبد الملک بن مروان کے دل میں بھی گذرا تھا۔ لہذا ہم بھی اون کو وہی جواب دینا مناسب خیال کرتے ہیں جو عبد الملک مذکور کے مقابلہ میں جناب امام زین العابدین کی زبان فیض تر جہان سے ظاہر ہوا تھا۔ مذکورہ بالا کتاب معارف ابن قتیبہ میں ہے۔ ”علی بن حسین (رضی اللہ عنہ) نے اپنی والدہ کا عقد اپنے غلام سے کر دیا اور اپنی ایک لڑائی کو آزاد کر کے خود اپنے عقد نکاح میں لیا۔ بن حسین کے عبد الملک بن مروان نے اون کو ایک خط لکھا جس میں اس سے پشیم دانی تھی۔ علی بن حسین نے جواب میں تحریر فرمایا۔ قد کان لکرم فی رسول اللہ اسوۃ سنۃ۔ رسول اللہ صلعم نے صفیہ بنت نبی کو آزاد کر کے اپنے نکاح سے شرف فرمایا تھا۔ اور زید بن حارثہ کو آزاد فرمایا اور اپنی چچا زاد بہن زینب بنت جحش کو اون کے نکاح میں دے دیا۔ اب اس سے بڑھ کے کیا شافی جواب ہو سکتا ہے۔ یہ متاخر الذکر واقعہ بھی ابن خلدان میں موجود ہے۔

اس موقع پر ہمیں ایک اور امر کا جواب دینا ہے۔ ایک صاحب نے دگلدار کے اوس مضمون پر بھی جو فتح قسطنطنیہ کے متعلق ہے ایک اعتراض کیا ہے اور اس اعتراض کو او وہ بیچ کے مضمون پر شائع کیا ہے۔ دگلدار کے مضمون میں ہے کہ قسطنطنیہ پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں جو حملہ ہوا تھا اوس میں جناب امام حسین علیہ السلام بھی شریک مجاہدین تھے۔ اوس مضمون کے نیچے فٹ نوٹ میں تصریح کر دی گئی ہے کہ گنیمت کا تتبع کیا گیا ہے۔ ہمارے دوست پہلے گنیمت ملاحظہ کر لیتے تب اعتراض کرتے۔ شہادت جناب امام حسین علیہ السلام کے بیان میں وہ دیکھیں معلوم ہو جائے گا۔ باقی رہا کہ کسی اسلامی تاریخ سے ثابت کیا جائے اس کے مختلف ہم نہیں ایسے کہ مضمون میں گنیمت کے تتبع کی تصریح کر دی گئی ہے۔

اس موقع پر ہمیں، عزیز سمعہ امتحان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ ایسے نازک  
وقتوں پر وہ ہماری مدد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کو ایسی فضول بحثوں  
میں نہ پڑنا چاہیے۔ جواب کسی لائق آدمی کے مقابلہ میں ہو تو ایسا بات بھی  
اور۔ یوں ہر نادان کی پیٹریڈ پاڑ پر اونٹین اسے قلم کو زحمت دینے کی ضرورت  
نہیں ہے۔



# فہرست کتب دفتر و گلداز و مہند

۳۰	منہج امید
۳۱	الماسون مع الجزیرہ
۳۲	ترجمہ ناول رینالڈز
۳۳	سوزن شوق
۳۴	صورت وصل
۳۵	ہزنت الفردوس
۳۶	غوی قسمت
۳۷	راز و نیاز
۳۸	نیرنگی فلک
۳۹	بت سیمین
۴۰	نیرنگ
۴۱	جہا نکیر

## متفرق ناول قابل دید

۴۲	دلگاہ
۴۳	رزم بزم ہر دو حصہ
۴۴	نازک
۴۵	سلطان
۴۶	نادین ہر دو حصہ
۴۷	شتر
۴۸	اختر حسینہ ہر دو حصہ
۴۹	عقد الجواہر
۵۰	دلبر
۵۱	حاجی بابا صفہانی
۵۲	فسانہ دلپذیر
۵۳	اکہ دین و لیلی

۵۴	مولوی عبدالحکیم صاحب
۵۵	ملک الخیر درجنہ
۵۶	منصور ہوتا
۵۷	حسن ایچنا
۵۸	وگداز
۵۹	وگداز ۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲
۶۰	زیاد حلاوت
۶۱	شہید وفا
۶۲	دلچسپ ہر دو حصہ
۶۳	یوسف نجمہ حصہ اول
۶۴	وگیش ندنی
۶۵	دلکش ہر دو حصہ
۶۶	مولوی نذیر احمد صاحب

۶۷	ابن الوقت
۶۸	موعظہ حسنہ
۶۹	مرآة العروس
۷۰	بنات انش
۷۱	توبۃ النصوح
۷۲	نہد رتن ناٹھ صاحب
۷۳	فسانہ آزاد مکمل در چار جلد
۷۴	جام سرشار
۷۵	خندانی فوجدار
۷۶	کامنی
۷۷	طوفان بے نیازی حصہ اول
۷۸	مولوی شبلی صاحب



۱۲	فریب محبت -
۱۲	طلمس میرت -
۸	کرشمہ قدرت -
۸	جذیرہ عشق -
۱۲	دام محبت -
۷	کوچک باختر -
	تواریخ اردو قابل دید
۷	اعمال نامہ روس -
۹	تاریخ اسپن کی پہلی جلد -
۱۱	جنگ ہفت سالہ -
۷	تاریخ فرشتہ -
۷	ارشاد الملک -
۷	تاریخ بغاوت ہند -
۷	سیر المتاخرین -
۷	تواریخ سلاطین -
۷	آثار الضادید مولانا جالب احمد خان -
۷	حسن القصص -
۷	وقائع نگار انگلستان -
۷	یادگار ہندی -
	طب اردو
۴	طب احسانی -
۹	علاج الغریبا -
۱۳	کلیات سیدی فن اول -
۳	علاج الموشی - ۳ - مخزن المفردات -
	کلیات و دو اوین
۱۱	کلیات نمون -
۷	کلیات سودا -
۷	کلیات انشاء و نظم خان -
۷	کلیات طالب -

۷	مثنوی گلزار نسیم -
۷	مثنوی یوسف زلیخا -
۷	دیوان یاسس -
۸	مثنوی صبح خندان - تسلیم لکھنوی -
۷	گوہر لفتیش ایک عمدہ حب زمانہ مثنوی -
۷	سانی نامہ عشقہ -
۷	دل و جان -
	مفرد کتب اردو
۲	برکات الاسلام -
۲	رسالہ نور العین -
۲	آثار سلف -
۳	چهار گلزار حالی -
۳	بختری کلان لافسہ -
۹	تاریخ مدینہ منورہ اردو -
	اوتخہ اعجد ثبوت تقلید اور امام اعظم رحمہ کی
۲	سوانح عمری -
۶	جل المبین -
۶	قصص الانبیاء -
۷	سوانح عمری ابو علی سینا ہر جلد -
	پارہ نم - تین زبان میں ترجمہ - انگریزی -
۳	اردو - فارسی -
۷	ظفر جلیل شرح حصین اردو -
۱۱	تقویت الایمان -
۳	مالا بہ اردو -
۷	آیات بنیات ہر دو حصہ -
۶	ایضاح -
۲	آبہ بویگان -
	المسجد لکھنوی
	منجد لکھنوی و مہذب - لکھنوی زبان لکھنوی

